جنوری ۱۹۴۶ (سالگرہ نمبر)

ہمایوں

فہرستِ مضامینِ ہمایوں

(سالگرہ نمبر)

بابت ماہِ جنوری ۱۹۴۶ء

ایڈیٹرز: میاں بشیر احمد (ایم۔ اے)

جلد ۴۷ — نمبر (۱)

سالانہ چندہ — پانچ روپے چھ آنے مع محصول

ششماہی — تین روپے

فی پرچہ — آٹھ آنے

قیمت سالگرہ نمبر — دو روپے

کلامِ ہمایوں

جنگِ عالمگیر نے دُنیا کی کایا دی پلٹ
مہر و مہ کہتے ہیں یہ دورِ زمانہ اور ہے

نوجواں اقوام کی چتون بدل جائے نہ کیوں
زالِ دُنیا کی ادائے دلبرانہ اور ہے

ڈھونڈتا ہے ہر طرف راہِ ترقی اُن کا تیر
جنگ جو قوموں کا اب طرزِ نشانہ اور ہے

ہے یہ کُشت وخونِ یورپ تیرے عصیاں کی سزا
یا سمندِ ناز پر اِک تازیانہ اور ہے

اے ہمایوں چشمِ ظاہر بیں سے تُو اس کو نہ دیکھ
جنگِ عالم میں نہاں کوئی بہانہ اور ہے

(کشمیر۔ اگست ۱۹۱۷ء)

قولِ اصغر

موجودہ جنگ، یہ کب ختم ہوگی؛ کیسی کیسی ممکنات چھپی ہوئی ہیں تاریک خندقوں کے عقب میں، خندقیں جن میں کچھ مرے پڑے ہیں اور کچھ زندہ ہیں، موت کی کھلی آغوش میں جانے کو ہر دم تیار۔ کیسی ہوگی وہ دُنیا جو ہم آج کل کے نوجوانوں سے ہم کنار ہوگی یا کیا ہم ایسی جنگوں میں فنا ہو جائیں گے جو پہلی جنگ کی طرح کہنے کو ہر جنگ کا خاتمہ کرنے والی ہے؛ بلاشبہ اس دُنیا میں ایسی چیزیں ہیں جن کے لئے انسان اپنی جان تک دے سکتا ہے۔ لیکن جن حالات میں ہم نے اپنی زندگیاں گزاری ہیں وہ اس قابل نہ تھے کہ کوئی اُن کے لئے زندہ رہے۔ آؤ ہم ملکوں کی سرحدیں اور رکاوٹیں اکھاڑ پھینکیں۔ نفرت اور ظلم کی یہ دیواریں، اور ایک ایسی زندگی کا نظام تلاش کریں، جو ابھی تک صرف ہمارے خوابوں میں بستی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ایسی زندگی ہماری دسترس سے باہر نہیں کیونکہ "یہ زمین اس دُنیا سے جو ہم نے اس پر تعمیر کی ہے زیادہ پاکیزہ ہے!"

(آکسفورڈ ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء بہن کی طرف خط عمر ۱۹ سال)

(ترجمہ از ب)

اصغر بشیر

بزمِ ہمایوں

اُردو ۱۹۴۵ء میں

وقت کی رفتار کا اندازہ بہت مشکل ہے۔ ہمایوں آج اپنی چوبیسویں سالگرہ منا رہا ہے۔ جنگ ختم ہو چکی ہے، آج سے ایک سال قبل جو مسائل ہمارے سامنے تھے وہ آج نہیں، اُفق کا منظر اگرچہ قدرے دھندلا ہے لیکن ہمیں ایک نئی سحر کا یقین ہو چلا ہے۔ ہماری سیاسی فضا میں بحران کی سی کیفیت ہے، مستقبل اپنا فیصلہ خود کرے گا، ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ یہ سالِ گزشتہ اُردو کے لئے کیا کچھ کر گیا ہے۔

اس سال بھی اُردو اپنے گرد رسیلوں اور چاہنے والوں کی مرکز بنی رہی۔ کانفرنسیں، مشاعرے، مباحثے، مقالے، سالنامے، ماہنامے، روزنامے، کتابیں — اور بے شمار دوسرے وسائل اس کی رفتار کو تیز تر کرتے رہے، اور جہاں نئے لکھنے والے اس کی آغوش میں آئے وہاں پرانے اور آزمودہ لوگوں نے اسے الوداع کہا۔ نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی جانشینِ داغ اور جناب محمد دین فوق کاشمیری نے ملکِ بقا کی راہ لی۔ اُردو سے بے اندازہ محبت کرنے والے راجہ نریندر ناتھ بھی ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے۔ نو واردوں سے ہمیں بہت سی توقعات ہیں لیکن ان بزرگوں کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں۔

یکم جنوری کو دہلی میں کل ہند معاشی کانفرنس منعقد ہوئی تو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اُردو داں طبقہ کو اُردو سے روشناس کرانے کے لئے ایک علمِ معاشیات کمیٹی قائم کی جو مستند معاشیین کی تصانیف کو اُردو کے جامے میں پیش کرے گی اور اس کے ماتحت اُردو میں ایک ماہنامہ شائع ہوگا۔ ۵ رجنوری کو ناگپور میں مولوی صاحب کے زیرِ اہتمام سائنس کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ یہ کمیٹی ہندوستان کے سائنس دانوں سے مختلف سائنسی موضوعات پر کتابیں لکھوائے گی۔ ان دو اقدامات سے اُردو کے حلقۂ نظر کو وسیع تر کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اُس کی اہمیت بہت واضح ہے۔ حکومتِ ہند نے اعلان کیا کہ پچھلے تین برس میں بیس ہزار برطانوی افسروں نے اُردو کا ابتدائی امتحان پاس کیا۔ اس اعلان سے اُردو کی ہر دلعزیزی اور حکومت کا یہ احساس ٹپکتا ہے کہ اُردو ہی ملک کی واحد نمائندہ زبان ہے۔ سید عبداللہ بریلوی نے جو سیاسی اعتبار سے کانگریسی ہیں اور کل ہند اخبار نویس کانفرنس کے صدر ہیں، ایک تقریر میں کہا کہ بعض صوبوں میں کانگریسی حکومتوں نے ہندوستانی کے لباس میں سنسکرت زدہ ہندی پیش کرنے کی کوشش کی جو بار ور نہ ہو سکی۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اُردو کو عام فہم اور سادہ بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ اس پر وہ اعتراضات نہ ہو سکیں جو آئے دن مہاسبھائی ذہنیت کی طرف سے ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کا یہ ارشاد سر آنکھوں پر لیکن جہاں تعصب کارفرما ہو وہاں اعتراضات کی کمی ممکن نہیں، بول چال کی زبان ہمیشہ سے سادہ رہی ہے۔ ان حضرات نے اُس کو کب چھوڑا ہے۔ اس میں بھی سنسکرت ٹھونسنے کی کوشش ہوتی رہتی ہے — تعصب کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ ان سے بے نیاز ہو کر اپنے کام میں مگن رہنا چاہئے۔

یکم اور دو فروری کو آنریبل سر سلطان احمد کی صدارت میں آل انڈیا ریڈیو کی زبان کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب اور علامہ کیفی صاحب نے اُردو کی طرف سے شرکت کی۔ ہندی کے تین نمائندے بھی بلائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ آنریبل سید حسین امام ممبر کونسل آف اسٹیٹ بھی مدعو تھے۔ دو دن گرم گرم بحثیں ہوئیں اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ خبریں، خبروں پر تبصرے اور اعلانات دو الگ زبانوں میں نہ ہوں بلکہ ایک ایسی زبان میں ہوں جسے سامعین بآسانی سمجھ سکیں۔ یہ ایسے الفاظ کے صیغے ہندوستانی قواعد کے مطابق ہوں۔ جہاں تک تلفظ کا تعلق ہے مروجہ تلفظ کو لغوی اور نحوی تلفظ پر ترجیح دی جائے۔

سرکاری ہند جنگ کی خبریں بابت ۸ فروری لکھتا ہے کہ لارڈ ویول وائسرائے ہند نے کئی سو ہندوستانی افسروں کے ساتھ اُردو میں باتیں کیں۔

[illegible] ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی نے دلائل سے ثابت کیا کہ اُردو ہی ملک کی عام زبان ہے اور جو لوگ اُردو کی مخالفت کرتے ہیں وہ فرقہ واری کے تعصب سے مجبور ہیں۔

۲۳، ۲۴، ۲۵ کو بمبئی میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق کے زیر اہتمام ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ "ہماری زبان" لکھتا ہے کہ یہ کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ ہم کہتے ہیں کہ جس کام کا بیڑا مولوی صاحب نے اٹھایا ہو اور جس کی روحِ رواں خود مولوی صاحب ہوں وہ ناکام کیسے رہ سکتا ہے۔ تین دن بمبئی میں اردو کا بازار گرم رہا۔ تقریریں ہوئیں۔ زبان کے مسئلے پر غور و خوض ہوا۔ گاندھی جی کا پیغام موصول ہوا جس کی عبارت منافقانہ حیثیت اختیار کر گئی۔ انہوں نے جو پیغام بھیجا اسے اُن کے سیاسی نقطۂ نظر نے قبول نہ کیا اور اس پر کافی لے دے ہوئی۔ لیکن لنگرانی نے کسی کی پیش نہ چلنے دی۔ وردھا میں کیفی نے حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہا لیکن جہاں چپ کا روزہ زبان بند کئے ہوئے تھا وہاں گھنٹی کی آواز نے علامہ موصوف کو خاموش کر دیا اور وہ سبھا کے لئے "بال بال بچ گئے"۔ ۲۶، ۲۷، ۲۸ کو وردھا میں ہندوستانی پرچار کانفرنس منعقد ہوئی۔ گاندھی جی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر سید محمود نے کہا: "اردو، ہندی اور ہندوستانی تین نام ایک ہی زبان کے ہیں"۔ اور سید سلیمان ندوی نے فرمایا: "اردو اور ہندی میں اسی فیصدی الفاظ مشترک ہیں"۔ اس کانفرنس میں عجیب بات یہ تھی کہ وہ حضرات جو اردو ہندی کو ایک سمجھتے ہیں اور حقیقت میں اردو دان ہیں اظہارِ مطلب میں ہندی آمیزی کی کوشش کے باعث ٹھٹک کر گئے اور قدم قدم پر اٹکتے رہے۔ ہندی دان بے دھڑک ہندی بولتے رہے۔ کانفرنس ہندوستانی پرچار سبھا کی تھی لیکن ہندوستانی کا وجود ان تین دنوں میں کم از کم وردھا میں کہیں نہیں تھا۔ آخر وردھا میں آتا بھی کہاں سے۔ ہندوستانی تو بقولِ کانگریس شمالی ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

۲۰ فروری کو حیدرآباد دکن میں یادِ حالی کی تقریب انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام منائی گئی۔ صدر ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو، میاں بشیر احمد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے پیغامات پڑھے گئے۔ مولانا حسرت موہانی نے اپنے سیاسی اعتقادات اور غزل پر تبصرہ فرمایا۔

جہاں ان دو مہینوں میں اردو کا کام ہوتا رہا اور اردو کی رفتار نہایت سرعت سے بڑھتی رہی وہاں مارچ کا طلوع مخالفت بھی لیتا آیا۔ لاہور میں آل انڈیا پنجابی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ پنجابی کے ساتھ آل انڈیا بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ پنجابی تو پنجاب ہی میں بولی جاتی ہے۔ آخر یہ آل انڈیا کانفرنس تھی یعنی وائس صدر سر شہاب الدین تھے اور مجلس استقبالیہ کے صدر دیوان بہادر ایس پی سنگھا۔ اس کانفرنس کا مقصد پنجابی کو اردو کے بالمقابل پیش کرنا تھا۔ بدقسمتی سے اس کے کرتا دھرتا سنگھا صاحب جیسے نیشنلسٹ تھے جن سے ارادہ بھی ہیں اور احتمال تھا کہ کہیں اردو کے مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے لیکن خیر یہ گزری کہ نشستند و گفتند و برخاستند سے زیادہ کچھ نہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو سے ٹکر لینا اب کسی کے بس کی بات نہیں۔ مارچ ہی کے دوران میں ایک شگوفہ اور پھوٹا اور وہ ڈاکٹر سید محمود صاحب کا خط تھا، جو انہوں نے علامہ کیفی کو لکھا تھا۔ اس خط میں رسم الخط کے بارے میں کل ہند انجمن ترقیِ اردو کی اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا تھا جو گئے سال انجمن نے پیش کی تھی لیکن جسے قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا تھا۔ اس سے مراد ث، س، ص میں سے ص کو اور ذ، ز، ض، ظ میں سے ض اور ز کو حذف کرنا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے خط کا پہلا جملہ ملاحظہ فرمائیے: "میں آپ کو آسان رسم خط میں یہ عریضہ لکھ رہا ہوں"۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خط میں جعفر حسین کو "جافر حسین"، ضرور کو "زرور"، صوبہ کو "سوبہ"، تعلیم کو "تالیم" اور اعظم گڑھ کو "آزم گڑھ" لکھا تھا۔ اس اختراع پر اب کسی تبصرے کی گنجائش نہیں رہی۔ "ہماری زبان" میں مسلسل چار مہینے اس پر مخالفانہ بحث ہوتی رہی۔ یہ خط بذاتِ خود ایک تبصرہ ہے جس پر قہقہہ یا قہقہے کے سوا کچھ کہنا موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ ۲۰ مارچ کو انجمن ترقیِ اردو پنجاب کے زیر اہتمام مولانا حسرت موہانی نے اردو غزل پر ایک مبسوط تبصرہ کیا اور اپنے نقطۂ نظر سے غزل کی مختلف اقسام پیش کیں۔ آپ نے غزل کی ضرورت کا احساس دلایا اور نئے لکھنے والوں کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ اپریل میں بھی مخالفت جاری رہی۔ سابق یو پی اسمبلی کے سپیکر بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے پونا میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا: "ہندی ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ اردو بدیشی زبان ہے جسے مسلمان حکمرانوں نے ملک پر لادا۔ اردو اس ملک کی کلچر اور فطری قابلیت سے بالکل اجنبی ہے"۔ یہ جملے کسی شیخ چلی کے خواب سے کم وقیع نہیں جنہیں کسی ذہنی علالت سے زیادہ کسی شے سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۴۵ء کے جاگتے ہوئے ہندوستان میں تاریخ کی یہ توڑ مروڑ صرف ٹنڈن صاحب ہی کو زیب دیتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا جواب ٹنڈن جی کی قسم کے تجاہلِ عارفانہ یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اردو کی ہمہ گیری اور عظمت سے کترانے والے حضرات کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا: "ہندوستان کے مسلمان بادشاہ یا تو فارسی بولتے تھے یا ترکی اور انہوں نے اردو کی سرپرستی کبھی نہیں کی۔ یہ زبان عوام کے میل جول اور ارتباط سے پیدا ہوئی اور بڑھی اور اس کی ترقی میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا حصہ ہے۔ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا سب سے قابلِ فخر ترکہ اور ہندو مسلم اتحاد کی علامت ہے"۔ ۹ اپریل کو احمدآباد میں "یوم اقبال" منایا گیا۔ بابو سمپورنانند جو بابو ٹنڈن کے ہمنوا ہیں اور اردو کے دشمن، فرماتے ہیں کہ اردو مرہٹی، تامل اور پشتو کی طرح کوئی مستقل زبان نہیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس کا خاطر خواہ جواب دیا کہ جس ہندی کی حمایت بابو جی فرما رہے ہیں اس کی عمر سوا سو برس سے زیادہ نہیں اور اُسے ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما پر گھڑا گیا تھا۔ بقول گاندھی جی "یہ وہ زبان ہے جو کتابوں میں ہے اور بول چال

میں نہیں"۔ یہ سراسر مصنوعی زبان ہے اور اردو کا مقابلہ قطعاً نہیں کر سکتی۔ ۱۰ مئی کو دہلی میں آل انڈیا اردو کانفرنس کی صدارت فرماتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا: "زبان کی زندگی کے ساتھ خود ہماری اور ہماری تہذیب و تمدن کی بقا و فنا کا مسئلہ وابستہ ہے"۔ اگست میں گاندھی جی نے ہندوستانی پرچار سبھا کو دس ہزار روپیہ دیا۔ ہندی ساہتیہ سمیلن سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ ۱۹۳۶ء کے بعد اب گاندھی جی کو ہندی سے علیحدہ ہونے کی سوجھی۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ اپنے خیال میں اس قلعہ کو مستحکم کر چکے ہیں اور ہندوستانی کے پردے میں اردو کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کی ریاستی کمیٹی نے ریاستوں کے نام ایک مراسلہ شائع کیا اور یہ کوشش کی کہ ہندو ریاستیں اردو کو ملک بدر کر دیں۔ یہ کاوش جس قدر بے معنی ہے اسی قدر مضحکہ خیز بھی۔ ریاستیں بھی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتیں جو ان کے باشندوں کو بقیہ ہندوستان سے علیحدہ کر دے اور ان کا آپس میں میل جول بھی ناممکن بنا دے۔ وہ ریاستیں جن کی سرکاری اور دفتری زبان اردو ہے یک قلم ہندی کو اپنا کر بدامنی اور بے چینی پیدا نہیں کر سکتیں۔ اس کے علاوہ دفتری کام میں کتنی مصیبت برپا ہوگی اس کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ۔۔۔ ۷ اکتوبر کو راجگوپال اچاریہ نے تنجور میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "ہندی تمام ہندوستان کی سرکاری زبان ہو کے رہے گی"۔ حیرت انگیز امر ہے کہ یہی صاحب حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں کانووکیشن کے موقعہ پر فرماتے ہیں: "حیدرآباد نے اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر ہندوستان کی مشترکہ زبان کی نہایت اہم خدمت انجام دی ہے اور اردو میں تعلیم دینے کا یہ تجربہ عزم اور ہمت کا ایک کارنامہ ہے جو کل ہند ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے"۔ کیا اس کا مطلب نہیں کہ اس قسم کے موسمی "اعلانات" محض لوگوں کو الجھن میں ڈالنے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ گاندھی جی، راجگوپال اچاریہ اور مسٹر منشی جو ہندی کے حق میں اعلانات کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں، ایسے صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی زبان ہندی نہیں اور اس کے علاوہ ان حضرات میں اتنی صلاحیت بھی نہیں کہ یہ اردو کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس نوعیت کے اعلانات کے خلاف ایک زبردست تنبیہی بیان دیا ہے۔ حکومتِ ہند نے سرکاری محکمۂ اطلاعات کے شعبۂ اردو کو لاہور میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور مرکز میں صرف شعبۂ ہندی رکھنے کا حکم دے دیا۔ اس فیصلے کے پیشِ نظر کسی صاحبِ فہم کی "مصلحت" یہ تھی کہ ہندی کل ہند زبان ہے اور اردو صرف اہلِ پنجاب کی۔ حکومت کو نہایت شدومد سے اس حق تلفی کا احساس دلایا گیا اور بالآخر فیصلہ منسوخ کر دیا گیا۔ دیکھا آپ نے اردو کو مٹانے کے لئے کیسے اوچھے ہتھیار استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ۔۔۔ نومبر میں آل انڈیا ویمن کانفرنس کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تو مسز سروجنی نائیڈو نے اپنا خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے نہایت شستہ اردو میں تقریر کی اور ثابت کیا کہ خواتینِ ہند صرف ایک ہی ثقافتی زبان جانتی ہیں اور اسی میں اظہارِ خیال کر سکتی ہیں۔ آپ نے اپنی تقریر میں فارسی الفاظ بکثرت استعمال کئے تھے۔ ایک صاحب نے جب آپ کی زبان دانی کی تعریف کی تو انہوں نے جواب میں فرمایا: "مجھے اردو کے الفاظ بکثرت معلوم ہیں لیکن اردو افعال کے استعمال میں روانی حاصل نہیں اور اکثر مجھے کھانس کھانس کر یاد کرنے پڑتے ہیں"۔ ہندی کے افعال تو اغلباً کھانسنے سے بھی یاد نہیں آتے۔ دسمبر کے ہمایوں میں ہم نے صدر کانگرس کے سکرٹری صاحب کا خط شائع کیا تھا۔ بقول ان کے "اردو ہی ملک کی حقیقی زبان ہے اور کوئی بناوٹی زبان اس کی جگہ نہیں لے سکتی"۔ کاش ملک کے دوسرے کانگرسی حضرات بھی اس حقیقت کو ان کی نظر سے دیکھیں اور ہمارے بدقسمت ملک کا کم از کم ایک اہم اختلافی مسئلہ حل ہو جائے۔

اس سال پچھلے سالوں میں حسبِ سابق بے شمار کتابیں شائع ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو نے دانتے کی شہرۂ آفاق Divina Commedia کو طربیۂ خداوندی کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا۔ مقالاتِ گارساں دتاسی بھی اردو میں منتقل کئے۔ رام پور سے جو ایک مدت سے اردو ادب کا گہوارہ ہے اوراقِ گل کے نام سے ان شعرا کا مجموعۂ کلام اور حالاتِ زندگی شائع ہوئے ہیں جنہیں سرکار کی طرف سے مدعو کیا جاتا رہا ہے۔ جدید ادب والوں کا ایک مجموعہ "نئے زاویے (۲)" کے عنوان سے لاہور سے شائع ہوا ہے جسے کرشن چندر نے مرتب کیا ہے۔ یہ دوسرا شمارہ دوسری تصانیف اردو کو فروغ دینے کی طرف گامزن ہیں۔ حیدرآباد سے حسبِ سابق معاشیات و اقتصادیات پر بعض بہت مفید کتابیں شائع ہوئیں۔ رسائل کے سالناموں میں نگار، ساقی، ادبِ لطیف، چمنستان، آجکل، جدید اردو (کلکتہ) وغیرہ نے بہت کاوش کا ثبوت دیا۔ ان کے علاوہ ساقی نے مختصر نمبر اور ادبِ لطیف نے افسانہ نمبر بھی شائع کئے۔

سالِ رواں کے مضامینِ نظم و نثر دیکھتے ہوئے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ادب کا رجحان زیادہ تر افسانوں اور تنقیدی مضامین کی طرف ہے۔ فحاشی کا سیلاب جو شاید جنگ کی پیداوار تھا سالِ رواں میں بہت حد تک تھمتا ہوا نظر آنے لگا ہے۔ حکومت نے دو تین اداروں کو فحش افسانوں پر سزائیں بھی دی ہیں۔

مختصر سا جائزہ ان ذہنی چھوٹی لہروں کا احاطہ نہیں کر سکتا جو سطحِ بحر پر نظر نہیں آتیں اور اگر ہم انہیں دیکھتے بھی ہیں تو ان کی سرسری سی نوعیت جاذبِ نظر نہیں ہوتی۔ وقت بتا رہا ہے کہ یہ لہریں طوفانی ثابت ہوں اور دنیا دیکھے کہ ہندوستان لسانی اعتبار سے متحد ہو کر کام کرنے والے کر رہے ہیں اور ہماری لغت میں داد و تشکر دینے کے لئے بے شمار الفاظ ہیں۔

زندہ باد اردو

پائندہ باد اردو

یوسف ظفر

جہاں نما

۱۹۴۵ء کے اہم واقعات

تاریخ	ہندوستان	دوسرے ملک
یکم جنوری	سپرو کمیٹی پاکستان پر غور کرتی ہے	ہٹلر کا نئے سال کا پیغام کہ جرمنی فتح حاصل کرنے کا عزم کر چکا ہے۔
۳ ر		مغربی محاذ پر جرمنوں کا جارحانہ حملہ
۹ ر	مسز پنڈت کی تقریر نیویارک میں کہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ مقرر کرنی چاہئے	امریکی فوج فلپائن کے ایک جزیرے میں اترتی ہے۔
۱۰ ر	مسٹر ڈیسائی اور نوابزادہ لیاقت علی خاں میں گفتگوئے مفاہمت	
۱۲ ر		روسیوں کا جارحانہ حملہ مشرقی محاذ پر
۱۵ ر	اینگلو امریکن پریس کانفرنس میں مسٹر جناح کی اپیل گاندھی سے: "ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے کو مجھے دو سال کی مہلت دے دو"	بحر الکاہل کے ممالک کی کانفرنس۔ محکوم قوموں کے لئے ایک منشور۔
۳۱ ر		روسیوں کی شاندار پیش قدمی۔ برلن سے ۷۰ میل پر پہنچ گئے۔
۴ فروری	برٹرنڈ رسل کی اپیل کہ ہندوستان کو جنگ جاپان ختم ہونے کے بعد کامل آزادی دے دی جائے	روسی برلن سے ۴۶ میل تک پہنچ گئے۔
۶ ر		تینوں بڑوں کی کانفرنس بحر اسود کے کنارے
۱۰ ر		لندن میں عالمی ٹریڈ یونین
۲۳ ر		ترکی محوری قوتوں کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اتحادیوں کا جارحانہ اقدام مغربی محاذ پر
۲۷		۸۲ سال کی عمر میں لائیڈ جارج کی وفات
۲۸ ر	حکومت ہند کا بجٹ بابت ۴۶-۱۹۴۵ء: ایک سو ترسٹھ کروڑ روپے کا خسارہ	
۳ مارچ:		قاہرہ میں عرب ممالک کی لیگ کا دستور منظور کیا گیا
۸ ر		اتحادی دریائے رائن پار کر لیتے ہیں
۱۲ ر	سرحد میں لیگی وزارت نے استعفیٰ دے دیا (دوبارہ کانگرسی وزارت بن گئی)	
۱۶ ر	ہندو قوانین کی اصلاح کے لئے کمیٹی لاہور پہنچی ہے جہاں کالے جھنڈوں سے اس کا استقبال ہوتا ہے۔	
۲۱ ر	لارڈ ویول (وائسرائے) لندن پہنچتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے متعلق حکومت برطانیہ سے گفت و شنید کرے۔	روس نے ترکی کو مطلع کیا کہ وہ ۱۹۲۵ء کے روسی ترکی معاہدہ دوستی کو ختم کرنا چاہتا ہے۔
۲۸	بنگال کی وزارت کی شکست	
۲ اپریل	مسٹر جناح کا بیان: برطانیہ کو تنبیہ کہ پاکستان کے بغیر ہندوستان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا	اتحادیوں کی پیش قدمی مغربی جرمنی میں۔ مسٹر چرچل ماسکو پہنچ گئیں۔
۸ ر	سپرو کمیٹی کی تجاویز شائع ہو گئیں (پاکستان کی مخالفت اور ہندو مسلمان کی مساوی نیابت کی سفارش)	
۱۰ ر		سارے مغربی محاذ پر اتحادیوں کی پیش قدمی
۱۲ ر		امریکی صدر روزویلٹ کی ناگہانی وفات۔ ٹرومین صدر بنایا گیا۔
۲۲ ر		روسی برلن میں گھس گئے۔

تاریخ	ہندوستان	دوسرے ملک
۲۵ر اپریل		سان فرانسسکو کانفرنس کا افتتاح۔ سٹیٹینیس کی تقریر کہ اس کا مقصد امن عالم کا قیام ہے۔
۲۶ر		اطالیہ میں جرمن محاذ متزلزل ہونے لگا۔
۲۷ر	ہندوستان کے سیاسی تعطل کو دور کرنے کے متعلق چرچل کا انکار "بول"	مسولینی گرفتار کر لیا گیا۔
۲۹ر		مسولینی کو سُولی پر چڑھا دیا گیا (اس نے اطالیہ پر تیس سال حکومت کی)
یکم مئی	پنجاب کانگرس اور پنجاب مسلم لیگ کا مشترکہ جلسہ لاہور میں	جرمن سرکاری اطلاع کہ "ہٹلر آج سہ پہر کو جاں بحق ہوا"!
۲ر		برلن فتح ہو گیا۔
۷ر		جرمنی نے بلا شرط ہتھیار ڈال دیئے (۱۴۱-۲ بوقت شب)
۸ر		"یوم فتح"۔ یورپ میں جنگ عظیم کا خاتمہ
۹ر		گورنگ کیسلرنگ اور کوزننگ کی گرفتاری۔ انگلستان میں شہری آزادی بحال کر دی گئی۔
۲۰ر		برطانوی مزدور پارٹی اور چرچل میں اختلاف رائے
۲۳ر	برطانوی مزدور پارٹی ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات دینے کا وعدہ کرتی ہے	
۲۵ر		برطانی مزدور پارٹی کی کانفرنس
۳۱ر		برطانیہ کی مداخلت شام میں
۵ر جون		جرمنی کے متعلق چار بڑی طاقتوں کا اعلان کہ جرمنی کی حدود وہی ہوں گی جو دسمبر ۱۹۳۷ء میں تھیں۔
۱۴ر	ویول کی نشری تقریر: ہندوستان کے تعطل کو دور کرنے کی نئی تجاویز اور ۲۵ر جون کے لئے لیڈروں کی کانفرنس کا اعلان	
۱۵ر	کانگرسی لیڈروں کو رہا کر دیا گیا۔ وائسرائے کی خط و کتابت گاندھی اور جناح کے ساتھ	
۱۸ر	مولانا ابوالکلام آزاد کا قول کہ کانگرس ہندو جماعت نہیں ہے۔	آئرلینڈ کے نئے صدر اوکیلی کا انتخاب
۲۱ر		جاپانی جزیرہ اوکی ناوا کو امریکی فوج نے فتح کر لیا۔ چرچل نے پبہ پروفیسر لاسکی کو برا بھلا کہا۔
۲۵ر	شملہ میں وائسرائے نے لیڈروں کی کانفرنس کا افتتاح کیا۔ کانگرس اور لیگ کے اختلاف کی وجہ سے ۲۹ر کو کانفرنس ملتوی کر دی گئی۔	
۴ر جولائی	چند کانگرسی مسلمانوں کو بلا کر کانگرس ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں شامل کیا گیا۔	
۵ر		برطانوی انتخابات
۶ر	کانگرس ورکنگ کمیٹی اور لیگ ورکنگ کمیٹی کے جلسے (جناح اور وائسرائے کی خط و کتابت)	
۱۴ر	شملہ کانفرنس میں وائسرائے کا اعلان کہ کانفرنس ناکام رہی ہے۔	
۱۷ر	مسلمانوں سے قائد اعظم کی اپیل الیکشن فنڈ کے لئے	تین بڑوں کا اجتماع پوٹسڈام (برلن) میں
۲۶ر		برطانیہ کے انتخابات میں مزدور پارٹی کی شاندار فتح۔ نئے وزیر اعظم اٹیلی کا بیان کہ نئی حکومت کا مقصد دنیا بھر میں عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنا ہو گا۔
۲۸ر		جاپانی شہروں پر اتحادیوں کے بے پناہ حملے
یکم اگست	گورنروں کی کانفرنس نئی دہلی میں	
۳ر	[illegible]	

تاریخ	ہندوستان	دوسرے ملک
۶ اگست	مسٹر جناح کا بیان کہ ہندوستان کے مسئلے کو مستقل حد پر حل کرنا ضروری ہے۔	جاپان کے شہر ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا گیا جس سے شہر کا بیشتر حصہ برباد ہوگیا۔
		ایٹم بم کے انکشاف پر دنیا بھر میں ہلچل۔
۷ر		برطانیہ میں مسلم لیگ کی شاخ قائم ہوکر ایک ہزار ممبر بن گئے۔
۹ر		روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔
۱۴ر		جاپان نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ جنگ کا خاتمہ ہوا۔
۱۵ر		وزیر اعظم اٹیلی اور صدر ٹرومین کا اعلان کہ دوسری عالمگیر جنگ کا خاتمہ بالخیر ہوگیا ہے۔
۲۰ر	مولانا آزاد کا بیان تقسیم ہند کے متعلق کہ حق خود اختیاری کی رُو سے علیحدگی کا حق مسلّم ہے۔	دارالعوام میں بیون وزیر خارجہ برطانیہ کی تقریر جس سے ظاہر ہوا کہ خارجی معاملات میں مزدور حکومت کی پالیسی چرچل کی حکومت سے ملتی جلتی ہے۔
۲۱ر	حکومت ہند کا اعلان کہ مرکزی اور صوبائی انتخابات ۴۶ء کے بجٹ سیشن سے پہلے مکمل ہو جائیں۔	
۲۲ر	خان عبدالقیوم خان مسلم لیگ میں داخل ہوگئے	
۲۳ر	کانگرس کے خلاف امتناعی قوانین واپس لے لئے گئے۔	
۲۴ر	لارڈ ویول لندن روانہ ہوگئے۔	
۲۹ر	سر فیروز خاں نون وائسرائے کی کونسل سے مستعفی ہوکر مسلم لیگ کے ممبر بن گئے	جاپانی وزیر اعظم کا مشورہ جاپانیوں کو کہ اتحادیوں کے آگے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔
۹ ستمبر	عید کے دن مسٹر جناح کا پیغام مسلمانان ہند کے نام کہ بوقت ضرورت سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔	
۱۴ر	کانگرس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کہ کانگرس انتخابات میں حصہ لے گی۔	
۱۵ر		پانچ بڑی طاقتوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس لندن میں۔
۱۶ر	کانگرس ورکنگ کمیٹی کی قرارداد بظاہر حق خود اختیاری کے حق میں لیکن دراصل اُس کے خلاف۔	
۱۹ر	وائسرائے کی نشری تقریر کہ برطانوی حکومت کا ارادہ ہے کہ وہ ہندوستان کو خود اختیاری حکومت عطا کرے اور انتخابات کے بعد صوبائی نمائندوں سے مشورہ کرے۔ اٹیلی کی نشری تقریر کہ ہندوستان کو ایک سیاسی دستور وضع کرنا چاہئے جسے اکثریت اور اقلیتیں دونوں پسند کریں۔	فلسطین میں حالات خراب ہوگئے۔
۲۱ر	آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں۔ یہ فیصلہ کہ کانگرس انتخابات میں حصہ لے گی لیکن مسلم لیگ کے ساتھ تعاون نہ کرے گی۔	
۲۳ر	نواب زادہ لیاقت علی خاں کی اپیل علی گڑھ کے اور دوسرے مسلم طلبا سے کہ وہ اپنی پڑھائی چھوڑ کر مسلم لیگ کی مدد کریں۔	
۲۶ر	بمبئی میں ہندو مسلم فساد	
۲۸ر		جاوا میں قوم پرستوں کی بغاوت ڈچ حکومت کے خلاف اور انڈوچائنا میں فرانس کے خلاف۔
۳۰ر		عرب لیگ کا مسٹر جناح کو شکریہ۔ یہ معلوم کر کے فلسطین کے بارے میں مسلمانان عالم امداد کرنے کے لئے تیار ہیں۔

تاریخ	ہندوستان	دوسرے ملک
۴ اکتوبر	کمیونسٹ پارٹی کا کانگرس سے استعفا دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔	فلسطینی عربوں کی اپیل مسٹر جناح سے کہ وہ اُن کی مدد کریں۔
۷ر		امریکہ اور برطانیہ سے رُوس کے تعلقات خراب ہو گئے۔
۱۲ر		انڈونیشیا میں مسلم جمہوریہ کے قیام کا اعلان۔ انڈونیشیا والوں کی اپیل مسٹر جناح سے کہ وہ اُن کی مدد کریں۔
۱۵ر		یورپ بھر میں بعد از جنگ کے جمہوری انتخابات کا آغاز۔
۱۶ر	مسٹر جناح کی تقریر کوئٹہ میں کہ جب قربانی کا وقت آئے گا تو میں سب سے پہلے اپنے سینے میں گولی کھاؤں گا۔	
۲۲ر		روسی اخبارات میں امریکہ اور برطانیہ پر شدید نکتہ چینی
۲۴ر		نیویارک میں پانچ لاکھ یہودیوں کا مظاہرہ فلسطین کے متعلق
۲۶ر		دارالعوام میں برطانوی وزیر خارجہ بیون کی تقریر کہ یورپ ہر قسم قسم کی تکالیف کے باعث یورپ کی حالت ابتر اور قابل رحم ہو رہی ہے۔
۲۹ر		بنک آف انگلینڈ کو قانوناً ایک قومی ادارہ قرار دیا گیا۔
۳۰ر		شمالی چین میں خانہ جنگی کا زور
۳۱ر	مسٹر جناح کی پیشینگوئی کہ انتخابات میں مسلم لیگ کو شاندار فتح حاصل ہو گی۔	فلسطین میں یہودیوں کا تشدد اور دہشت انگیزی
۵ نومبر	دہلی میں نام نہاد "انڈین نیشنل آرمی" کے لیڈروں کا مقدمہ شروع ہوا۔	
۶ر		ایٹم بم کے متعلق امریکہ کے طرز عمل کے خلاف روسی لیڈر مولوٹاف کا احتجاج۔
۱۰ر		اٹیلی اور ٹرومین کی ملاقات۔ ایٹم بم کے متعلق تبادلۂ خیالات۔
۱۱ر	پنڈت نہرو کی تقریر کہ اگر ہم پاکستان دینے پر رضامند ہو بھی جائیں تو مسلم لیگ سے کچھ سمجھوتا نہ کریں گے۔	برطانوی ہوائی جہاز جاوا کے شہر سورابایا کو تباہ کر دیتے ہیں۔
۱۳ر		فلسطین کے متعلق امریکہ اور برطانیہ ایک مشترکہ کمیشن مقرر کرتے ہیں۔
۱۹ر		انڈونیشیا کے انتہا پسند اعلان جنگ کرتے ہیں کہ ہم برطانیوں کو قتل کر دیں گے یا انہیں اپنے ملک سے نکال باہر کریں گے۔
۲۷ر		انڈونیشیا میں برطانوی حکمت عملی کے خلاف دنیا بھر میں اظہار ناراضی
۳۰ر		یوگوسلاویہ کے جمہوریہ بن جانے کا اعلان۔ شاہ پیٹر کو تخت سے اُتار دیا گیا۔
یکم دسمبر		آذربیجان کے باغیوں کو رُوسی مدد ملنے پر ایران میں رنج و غصہ کی لہر۔
۲ر	گاندھی جی گورنر بنگال سے ملاقات کرتے ہیں۔	
۵ر	مزدور حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہندوستان میں ایک وفد بھیجنے والی ہے برطانیہ میں [illegible] اور کچھ اختلاف رائے	
۱۶ر		ماسکو میں تین بڑی طاقتوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس (بیون، مولوٹاف اور برنز) روس میں ایک [illegible] لائحہ عمل کی تجویز
۱۷ر		
۱۹ر	پنڈت نہرو کی تقریر کہ ہندوستان [illegible] آتش فشاں ہے جو کسی وقت بھی پھوٹ پڑے	
۲۰ر		[illegible] مشرق وسطیٰ میں روسی جارحانہ حکمت عملی پر [illegible] بیان۔
۲۱ر		
[illegible]	اس بات کا اعلان کہ [illegible] صدر کانگرس [illegible] گے۔	چین میں خانہ جنگی ختم ہو جانے کا امکان۔

دُنیا ۱۹۴۵ء میں

دُوسری جنگِ عالمگیر یُورپ میں یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہو کر ۵ سال ۸ ماہ اور ۸ دن جاری رہنے کے بعد آخر ۸ رمئی ۱۹۴۵ء کو ختم ہوگئی۔ اس کے ۳ ماہ اور ۶ دن کے بعد ۱۴ راگست کو جاپان نے بھی جرمنی کی طرح ہتھیار ڈال دیئے اور جنگ ایشیا میں بھی ختم ہوگئی۔

یہ جنگِ عالمگیر (ثانی) یقیناً جنگِ عالمگیر (اول) سے زیادہ ہولناک اور زیادہ عجیب و غریب تھی۔ فرانس سی طاقت تباہ ہوئی، برطانیہ کو جان کے لالے پڑ گئے، رُوس مرتے مرتے بچا اور پھر بٹ بٹ کر اُبھرا۔ اطالیہ سی بودی قوم نے زبردست کارنامہ حملہ کیا اور مُنہ کی کھائی، جاپان سے منظم ملک نے سفاکانہ جنگ کی لیکن ناکام رہا۔

اتحادی جنگ کے دوران میں متحد رہے لیکن جونہی جنگ ختم ہوئی، وہ کہیں علانیہ اور کہیں درپردہ ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے لگے، وہ ذہنی طور پر "تھکے ماندے" تھے سو جوع الارض بآسانی اُن پر غالب آگئی۔ ہو گئے لُوٹ کھسوٹ میں مصروف اور چھین جھپٹ میں منہمک! وہ "اوقیانوسی منشور" کیا ہُوا، وہ "تین بڑے" جنہوں نے دُنیا اور انسان کی آزادی کے لئے بلند بانگ دعوے کئے آخر اتنے کم ظرف کیوں ثابت ہو رہے ہیں؟

برطانیہ میں مزدور حکومت برسرِ اقتدار ہے، "صحیح قسم کی جمہوریت" کا ڈنکا بج رہا ہے۔ لیکن ہندوستان کے آگے بجائے آزادی کے اعلان کے صرف "خود اختیاری" کی راگنی گائی جا رہی ہے، مصر خالی کرنے کو ابھی جی نہیں چاہتا۔ فلسطین کی "چوکیداری" "اخلاقی فرض" ہو گیا ہے، محض "قیامِ امن" کی خاطر جاوا کے "جنگجو" "حُرّیت پسندوں" کو ہوائی طاقت سے ملیامیٹ کرنے کا "مہذب" کام جاری ہے!

رُوس اشتمالیت کا علم بردار جرمنی کے خلاف سینہ سپر رہا کہ دُنیا استبداد کے پاؤں تلے کچلی نہ جائے لیکن آج اُس کا کیا حال ہے؟ وہ اپنے ہمسایوں کو ترچھی نظروں سے دیکھتا ہے، اور وہ یکے بعد دیگرے اُس کے "اشتراکی سائے" میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایران میں ساز باز ہے، ترکی پر دباؤ ہے اور پھر ساتھ ہی غیر جانبداری اور جمہوریت نوازی اور انصاف پسندی کا یقین دلایا جا رہا ہے!

اور تو اور شریف اور بے لوث امریکہ، دُنیا میں کوئی سلطنت نہ قائم کرنے کا خواہش مند، وہ بھی محض دُنیا کی "بھلائی" کی خاطر اپنا "بے ضرر" ایٹم بم بغل میں دبائے دُوسروں سے محوِ گفتگو ہے کہ کس طرح ایک نیا آسمانی نظامِ عالم قائم کیا جائے؟

کیا یہی ہے وہ جمہوریت اور اشتراکیت اور حُرّیت جن کے اعلانات اوقیانوس کے پانیوں پر طوفان

کے باغوں میں اور برلن کے مضافات میں بہ بانگِ دہل کئے گئے ؛ کیا چھوٹی یا کمزور قومیں پھر اُسی طرح آزادی کی بھیک مانگتی رہیں گی۔ اور بڑی قومیں پھر اُسی طرح اُنہیں اپنے جھوٹے وعدوں سے ٹالتی رہیں گی؟

یہ بھی ہوگا لیکن ساتھ ہی کچھ اور بھی ہونے والا ہے اور ہو رہا ہے، اور ہو کے رہے گا۔ اور وُہ ہے چھوٹوں کی خودداری کا مظاہرہ اور کمزوروں کی طاقت کا پیدا کردہ انقلاب، نہ رُک سکنے والا، باوجود پَے دَر پَے ناکامیوں کے مسلسل جاری رہنے اور دُنیا بھر کے بُزدلوں کو جگا دینے والا زلزلہ، اُنہیں صحیح معنوں میں آزاد انسان بنا دینے والا نعرۂ حق!

چین، انڈوچائنا، جاوا، سماٹرا، ہندوستان، فلسطین وغیرہ کیا اب یہ دیر تک دبے رہیں گے؛ کیا یہ بدستور غلامی کا طوق پہنے رہیں گے؛ کیا یہ پھر یُورپ کی "میٹھی دوائی" پی کر سو جائیں گے؛ اب وُہ دِن گئے! اب برطانیہ کی جمہوری تعلیم اپنا کام کرے گی، اب رُوس کا اِشتراکی پرچار اپنا رنگ لائے گا، اب امریکہ کی حُریّت پسندی خود اُسے مجبُور کر دے گی کہ وُہ اپنی نئی تاجرانہ ملوکیت کے منصوبے بھی ترک کر دے! چھوٹی، محکوم یا کمزور قومیں اب اِن بڑی غالب قوموں کو صحیح راہ پر لانے میں آزادی کا جہاد کریں گی اور یہ جہاد جاری رہے گا یہاں تک کہ دُنیا ایک بہتر دُنیا بن جائے!

ڈر اِس کا نہیں کہ سلطنتیں قائم رہیں، اب وُہ نئے سرے سے بھی قائم ہوں تو بالآخر مِٹ کر رہیں گی۔ فکر ہوتی، اگر محکوم و کمزور قومیں اپنی غلامی یا کمزوری میں خوابیدہ و مطمئن رہتیں، لیکن وُہ دِن اب گئے اب غلامی بھی ہوگی تو جدّ و جہد کے ساتھ اور کمزوری بھی رہے گی، تو اُس میں طاقت کی خواہش متواتر زلزلے پیدا کرتی رہے گی۔ اب دُنیا کا مستقبل خطرے میں نہیں، غلامی و کمزوری میں خودداری و خود اعتمادی کا احساس بلاشبہ آنے والی آزادی کی دِل انگیز خوش خبری ہے۔ ہزار دِقّتیں ہوں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ دُنیا کے مجاہدو! تم صرف اپنا کام کئے جاؤ، اور نتیجہ خدائے لایزال پر چھوڑ دو!

یُوں ہاتھ نہیں آتا وُہ گوہرِ یک دانہ
آزادی و یک رنگی اے ہمّتِ مردانہ!

بشیر احمد

تسلسلِ ناتمام

تختِ سے، تاج و تاجدار سے دُور
دُور۔ اِس دَورِ فتنہ کار سے دُور

شاہد و ساقی و بہار سے دُور
یعنی ہر کیفِ مستعار سے دُور

ہے خزاں اپنی ہر خزاں سے جُدا
ہے بہار اپنی ہر بہار سے دُور

ستم و جورِ آسماں سے الگ
کرم و لُطفِ غمگسار سے دُور

عشق ہے اُس مقام پر کہ جہاں
حُسن ہے نقصِ اعتبار سے دُور

پرتوِ حُسنِ ذات سے نزدیک
سایۂ زُلفِ تابدار سے دُور

ایک عالمِ خیال سے برتر
اِک جہاں چشمِ روزگار سے دُور

خطرۂ موت، اب، نہ فکرِ حیات
نشّہ ہی نشّہ ہے خمار سے دُور

جگر مرادآبادی

صبحِ مراد

رُوح مجروح - تن بدن مفتوح
واہ وا - کیا حیات پائی ہے

ابرِ راحت کا جس پہ سایہ ہو
دِن مِلا ہے نہ رات پائی ہے

حوصلے تھے بہت - مگر سب نے
رفتہ رفتہ وفات پائی ہے

کائنات اپنی جانتا ہُوں مَیں
بس یہی کائنات پائی ہے

وادیِ اشک آفریں ہے - جہاں
بارشِ واردات پائی ہے

پا چُکا ہوں وہ دردِ دِل - جس نے
مجھ میں بھی کوئی بات پائی ہے

یاس ہی میں اُمید ہو جس کی
ایک اپنی ہی ذات پائی ہے

غم نہیں ہے کہ موت سے مَیں نے
راحتِ التفات پائی ہے

اے خوشا - یہ شکستِ کعبۂ دِل
دَولتِ سومنات پائی ہے

مِل گیا ہے نشانِ منزلِ دوست
جستجو سے نجات پائی ہے

یہ شبِ زندگی ہے صُبحِ مُراد
تیرگی میں برات پائی ہے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

پھولوں اور پتّوں کی بولی

ہمارے ملک کے مایۂ ناز فرزند سر جگدیش چندر بوس۔ گو اس جہان سے چل بسے ہیں۔ اور ہم ان کی بیش بہا علمی تحقیقاتوں اور خدمات سے آئندہ کے لئے محروم ہو گئے ہیں۔ مگر ان کی گذشتہ خدمات کبھی بھول نہیں سکتیں۔ سائنس کی دنیا میں اور خاص کر علم نباتات کے شعبے میں اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مشرقی لوگوں میں یوں تو یہ خیال دیر سے چلا آتا ہے۔ کہ جان صرف انسان اور حیوان ہی کا حصّہ نہیں۔ بلکہ درختوں اور پھولوں اور پتّوں میں بھی جان ہے۔ لیکن اس خیال کو سائنس کی دلائل سے ذہن نشین کرنا اور تجربوں سے ثابت کرنا سر جگدیش چندر کا کارنامہ ہے اس کمال کی بدولت وہ خود بھی دنیا بھر میں مشہور ہوئے۔ اور اپنے وطن کو بھی انہوں نے مشہور کیا۔ اُنہوں نے ایسے عمدہ آلات تیار کئے جو پھولوں اور پتّوں میں زندگی بلکہ احساس کا ثبوت دیتے ہیں اور احساس بھی اس درجہ تک کہ معلوم ہو جائے کہ نباتات کا بھی دل ہے۔ جو رنج اور خوشی محسوس کر سکتا ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ سر جگدیش پھولوں اور پتّوں کی زبان سمجھتے تھے۔ اور اُن کے جذبات کی تصویر ہم کو دکھا سکتے تھے جو کمال سر جگدیش نے سائنس کے آلات سے دکھایا۔ وہ بعض بڑے بڑے شاعروں نے اپنے فطرتی احساس کی نزاکت کے ذریعے الفاظ میں دکھایا ہے۔ یورپ کے شاعروں کے کلام میں بھی پھولوں اور پتّوں سے دلچسپی اور ہمدردی کے خیالات ملیں گے۔ لیکن جس کثرت سے ہمارے مشرقی شاعروں نے اور خاص کر فارسی کے شاعروں اور بعض اردو کے شعراء نے لفظوں میں برگ اور گل کے جذبات کی تصویریں کھینچی ہیں۔ ان کی مثال اور جگہ کم ملے گی۔

مشرق کے بزرگ ترین مصنفوں میں شیخ سعدی شیرازی ہیں۔ ان کا یہ شعر نہایت مشہور ہے۔ ؎

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

یعنی ہرے ہرے درختوں کے پتّے سمجھنے والے کی نگاہ میں ایسے ہیں کہ پتّے پتّے میں خُدا کی پہچان کے سبق کا ایک ایک دفتر بھرا ہوا ہے ایک روایت مشہور ہے کہ کسی نے شیخ سعدی کو خواب میں دیکھا۔ کہ بہشت میں ہیں۔ اور بہت خوش ہیں۔ اُس نے پوچھا آپ کی کونسی بات خُدا کو پسند آئی کہ آپ کو اگلے جہان میں اتنا آرام ملا۔ انہوں نے جواب دیا کہ درختوں کے پتّوں سے جو سبق میں نے دنیا کو دیا تھا یہ اُسی کا انعام ہے۔ اسی مضمون کو ہمارے ملک کے ایک مشہور شاعر شاد عظیم آبادی مرحوم نے اور بھی رنگین کر دیا ہے۔ اُن کی نگاہ پتّوں کی بجائے پھولوں پر جا پڑی۔ وہ فرماتے ہیں۔ ؎

چمن میں جا کے ہم نے غور سے اوراقِ گل دیکھے — تمہارے حسن کی شرحیں لکھی تھیں ان رسالوں میں

یہ دونو شعر تو یہ بتلاتے ہیں کہ کیا پتّے کیا پھول قدرت کی ایسی عجیب صنعت کے نمونے ہیں کہ زبانِ حال سے قادرِ حقیقی کا پتہ ہمیں دے رہے ہیں۔ مگر بعض اور شعروں میں یہ دکھایا گیا ہے کہ پھولوں کے اندر دل تھے۔ اور دل میں خوشی اور غم آرزو اور تمنا اسی طرح آباد ہیں جیسے ہمارے دلوں میں مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے — تو گل کبھی نہ تمنّائے رنگ و بُو کرتے

پھولوں کے اس احساس کو کہ ان کو توڑے جاتے اور جلائے جانے سے تکلیف ہوتی ہے حافظ نے نہایت پُر درد لفظوں میں کیا خوب بیان کیا ہے۔

گل گفت اگر دستگہے داشتمے　　　بگریختمے اگر رہے داشتمے
با بے گنہی درچنیں مے سوزند　　　اے وائے بر من گر گنہے داشتمے

اس فارسی کا سادہ نثر میں ترجمہ یُوں ہوگا۔

" پھول بولا۔ اگر مجھ میں دوڑنے کی طاقت ہوتی اور دوڑ جانے کا راستہ ملتا تو میں باغ کو چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ میرا کوئی گناہ نہیں اس پر مجھے اتنا جلاتے ہیں۔ کیا جانے میرا کیا حال ہوتا۔ اگر میرا کچھ قصور ہوتا" جس طرح حافظ نے پھول کا دکھڑا سنایا۔ اسی طرح سنتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں لوگ پرندوں اور دوسرے جانوروں کی بولیاں جانتے تھے۔ خواہ اسے لکھنے والوں کے خیال کی پرواز سمجھیں اور خواہ سمجھنے والوں کی ذکاوت مگر یہ ظاہر ہے۔ کہ مشرق کی ادبیات میں بیشمار کہانیاں ایسی موجود ہیں، جن میں پرندے آپس میں باتیں کرتے تھے۔ اور انسان کا قلم اُن کہانیوں کو قلمبند کرتا جاتا تھا۔ وہ مشہور کتاب جسے کلیلہ دمنہ کہتے ہیں جو سنسکرت سے دوسری زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہے ایسی داستانوں سے پُر ہے جنہیں ہر عُمر کے انسان کیا بوڑھے کیا جوان دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ اور ان کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ یہ خصوصیت پرانی کتابوں میں زیادہ پائی جاتی ہے اور نئی کتابوں میں کمیاب ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ پرانے زمانے میں لوگوں کی زندگی ایسی تھی۔ کہ انہیں قدرتی مناظر کے قریب رہنے کا زیادہ موقعہ تھا۔ اور وہ پرندوں اور دوسرے جانوروں کو اپنے جیسے جاندار سمجھتے تھے۔ اور ان سے ایک قسم کی یگانگت محسوس کرتے تھے۔ اسی طرح جو اور زیادہ باریک نظر رکھتے تھے وہ پھول اور پتوں کو اپنے جیسا جاندار سمجھتے تھے اسی لئے ہمارے ملک میں یہ عام دستور تھا کہ شام کو پھول توڑنا منع تھا کہا جاتا تھا کہ اس وقت درخت اور اُن کے پھول پتے بھی آرام کرتے ہیں۔ اُن کے آرام میں خلل ڈالنا اُن پر ظلم کرنا ہے۔ انہی خیالات سے ہمارے ادب کا وہ حصہ پیدا ہوا ہے جس کا ذکر ابھی ہم نے کیا ہے۔ جہاں گلاب کا پھول اُس تکلیف کا اظہار کرتا ہے جو عرقِ گلاب کھینچنے کے لئے اُسے دی جاتی ہے۔ سر جگدیش نے سائنس سے اس احساس کی تصدیق کی ہے۔ پھول کا شکوہ آپ نے سُن لیا اب ذرا کلی کی شوخی دیکھئے۔ اردو کا ایک شاعر کہتا ہے۔

چمن میں ناز بلبل نے کیا جب اپنے نالے پر　　　چٹک کر غنچہ بولا کیا کسی سے ہو نہیں سکتا

ہمارے شعراء نے پھولوں کی باتیں زیادہ تر بلبل اور گل کی تکرار کی بدولت سُنی ہیں۔ بلبل اور گل کے سوال و جواب کا لطف ان دو شعروں میں دیکھئے:-

صبحدم مرغ چمن با گل نوخاستہ گفت　　　ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت
گل بخندید کہ از راست نہ رنجیم ولے　　　ہیچ عاشق سخن تلخ بہ معشوق نہ گفت

یعنے " صبح ہوتے ہی چمن کے پرندے نے نئے کھلے ہوئے پھول سے کہا۔ اتنے نہ پھولو۔ اس باغ میں بہت سے تم جیسے پھول کھل چکے ہیں۔ پھول نے ہنس کر کہا۔ تم نے بات تو سچی کہی ہے۔ اور مجھے نہیں چاہیئے کہ سچی بات سے خفا ہو جاؤں مگر تمہیں بھی تو یہ خیال چاہیئے تھا۔ کہ کوئی عاشق معشوق کو ایسی کڑوی بات نہیں کہتا۔"

آپ نے دیکھا شاعر کے لئے پھول ہنسا بھی اور بولا بھی۔ خواہ ہم تم پھولوں کی بولی نہ سمجھیں شاعر ان کا راز دار ہے

شاعر کے احساس کی نزاکت پھول کی خوبصورت پنکھڑیوں سے گزر کر گھاس تک سے ہمدردی رکھتی ہے۔ سعدیؒ کے منہ سے ایک دفعہ ایسی بات نکلی جس سے گھاس کا دل رنجیدہ ہو گیا۔ اور گھاس کو رونا آگیا۔ سعدیؒ کا قدم آگے نہیں اُٹھ سکا۔ وہیں بیٹھ کر گھاس کی دلجوئی کی اور اس کے آنسو پونچھے۔ سُنیئے کیا فرماتے ہیں۔

دیدم گلِ تازہ چند دستہ بر گنبدے از گیاہ بستہ
گفتم چہ بود گیاہِ ناچیز تا در صفِ گل نشیند او نیز
بگریست گیاہ و گفت خاموش صحبت نہ کند کرم فراموش
گو نیست جمال و رنگ و بویم آخر نہ گیاہِ باغ اویم

آپ جانتے ہیں۔ سعدیؒ صاحب تھے تو بڑے سیلانی۔ اور ہر چھوٹی موٹی چیز کو غور سے دیکھتے تھے۔ اور بات میں بات پیدا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ۔ میں نے ایک دن دیکھا کہ ایک گنبد پر چند پھولوں کے گلدستے دھرے ہیں جو گھاس کے پتوں سے بندھے ہیں۔ میں نے کہا گھاس تو ناچیز سی چیز ہے۔ اسے کیا حق ہے۔ کہ پھولوں کے برابر ایک ہی صف میں آکر بیٹھے۔ یہ سن کر گھاس نے رو کر کہا۔ چُپ رہیئے۔ اچھے لوگ مل بیٹھنے کے حق کو بھولا نہیں کرتے۔ مانا کہ مجھ میں نہ پھول کی سی خوبصورتی ہے نہ رنگ نہ خوشبو مگر میں بھی تو اُسی باغ کی گھاس ہوں۔ دیکھئے گھاس نے رو کر سعدی جیسے استاد کو بھی سبق پڑھا دیا۔ اور اُنہوں نے گھاس کی باتیں سُناتے سُناتے ہمیں یاد دلایا کہ جیسے ہم باغ کہتے ہیں اس میں پھول بھی ہیں اور گھاس بھی۔ اور سب اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ سب کو باغ میں مل کر رہنا ہے۔ اور باغ سے باہر جاکر بھی یہ رشتہ توڑنا نہیں ہے۔ ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ پھولوں کو بھی گنبد پر چڑھکر بیٹھنے کے لئے اور سجنے کے لئے گھاس کا بندھن درکار ہے۔

یہ مثالیں میں نے اردو اور پرانی فارسی کتابوں سے لی ہیں۔ اب چند شعر ایک زندہ ایرانی شاعر "ادیب الممالک" کے بھی سن لیجیے۔

فارسی ادب میں زیادہ تر باتیں گلاب کے پھول اور بلبل کے درمیان ہوئی ہیں۔ مگر ادیب الممالک نے کہیں سے نرگس کے پھول کی بحث بھی سن لی ہے۔ اور اس سے افسروں اور تاجداروں کے لئے ایک بیش قیمت سبق حاصل کیا ہے۔

گفت بلبل شبے بہ نرگسِ باغ کائے بچشم تو خفتہ بیداری
خواب کن صحتِ مزاج بجوئے روز و شب تا بہ چند بیداری
گفت اگر خواب دار سوا ز روز افسر از سر کند نگو نساری
در خورِ تاج چشم بیدار است تا بدا ز خفتگاں نگہ داری

اس کا ترجمہ یہ ہے:-

ایک رات بلبل نے نرگسِ باغ سے یہ کہا کہ تیری آنکھوں میں جاگنا بھرا ہوا ہے۔ تو کبھی سو بھی جایا کر اور اپنی صحت کی خبر لے۔ دن رات کب تک بیدار رہے گی۔ اس نے جواب دیا کہ اگر نیند آ جائے تو افسر کا سر نگوں ہو جاتا ہے۔ تاج کے لائق وہی آنکھ ہے جو جاگتی رہے۔ سوتے ہوئے نگہ داری نہیں کر سکتے۔

میں نے کچھ نمونے پھولوں کی بولی اور پتّوں کی باتوں کے آپ کو سنا دیئے۔ اور نمونے آپ خود تلاش کریں۔ ہر زبان میں ملیں گے۔ میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سائنس داں ایک راستہ سے اور شاعر دوسرے راستے سے ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں یعنی زندگی کی لہر انسان حیوانات نباتات، جمادات سب میں دوڑ رہی ہے۔ ساری زندگی کا ایک منبع ہے۔ جو ہماری ظاہری آنکھ سے چھپا ہے مگر جسے باطن کی آنکھ ان پھولوں پتوں پر غور کرتے کرتے اور اُن کی باتیں سُنتے سنتے دیکھ سکتی ہے اور ان احساسات کی بدولت ہم راستہ ٹٹولتے ہوئے اُس حقیقت تک راہ پا سکتے ہیں۔ جس کی ہم سب کو جستجو ہے۔ سائنس عقل کے راستے سے اور شاعر محبت کی راہ سے ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔

عشق اِدھر عقل اُدھر دُھن میں چلے ہیں تیری

رستہ اب دیکھیئے دونوں میں کٹھن کس کا ہے

(یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوئی) عبدالقادر

غزل

ضبطِ فُغاں کی پابندی ہے چُپ ہوں لیکن بول رہا ہوں

یعنی چپکے چپکے نوکِ مژہ پہ آنسو تول رہا ہوں

فکر جواں ہے نظریں روشن، یعنی دیدہ و دل ہیں بینا

اب تک جو عقدے لاینحل تھے وہ عقدے کھول رہا ہوں

دیر کبھی ہے اور میخواری، کبھی حرم ہے اور ہے توبہ

دل کے بارے میں میں ہمیشہ یونہی ڈانواں ڈول رہا ہوں

آنکھ سے گرتے گرتے آنسو انجم تاباں سے کہتا ہے

چشمک خوب نہیں اے ہمدم میں بھی تو انمول رہا ہوں

آنسو ضبط کئے بیٹھا ہوں۔ بند زباں ہے نظریں گُم سُم

حکم کسی غم فرما کا ہے۔ غم کی زباں سے بول رہا ہوں

ان کی نگاہیں اُن کی ادائیں۔ اُن کا تصور تو ہے تو یہ

بند ہیں میری آنکھیں فطرتؔ دل کے دریچے کھول رہا ہوں

عبدالعزیز فطرت

تبرکات

چرچے جگہ جگہ مرے رازِ نہاں کے ہیں
کچھ پھوٹنے کو آبلے مُنہ سے زباں کے ہیں

خوکردہ ہم جو لذتِ جورِ بُتاں کے ہیں
ہر وقت منتظر ستمِ آسماں کے ہیں

منظور اُنہیں جو میرا اُٹھانا ہے بزم سے
وہ مجھ سے پوُچھتے ہیں ارادے کہاں کے ہیں

اے برق ایک بار کرم اور بھی سہی
دو چار تنکے اور ابھی آشیاں کے ہیں

تم کو گلہ جو غیر سے وہ تم سے ہے مجھے
شکوے مری زباں پہ تمہاری زباں کے ہیں

مُوسیٰ کہاں کے کیسی تجلی، کہاں کا طُور
یہ سب کرشمے جلوۂ حُسنِ نہاں کے ہیں

واعظ کی بات جھوٹ ہو یا سچ ہو اس سے کیا
ہم معتقد جناب کے حُسنِ بتاں کے ہیں

دشمن سے پُوچھ پُوچھ کے کرتے ہو ہم پہ ظلم،
ظالم طریقے یہ بھی کوئی امتحاں کے ہیں

پیتے نہیں جو مُفت کی مے کیا جنابِ شیخ
پرہیزگار ایسے بھی حضرت کہاں کے ہیں

لے جا کے چھوڑتی ہے کہاں دیکھیے ہمیں
ہم بھی تو ساتھ ساتھ ہی عمرِ رواں کے ہیں

واقف نہیں ہیں حضرتِ اطہر سے کیا جناب
وہ ہم صفیر بلبلِ ہندوستاں کے ہیں

اطہر ہاپوڑی

حَبۡلُ المَتِین

تجھ سے جب مطلب ہوا پھر ماسوا سے کیا غرض
آشنا سے کیا غرض، نا آشنا سے کیا غرض

اب مروں چاہے جیوں، مہر و وفا سے کیا غرض
لے چکے دِل، اُن کو جانِ مبتلا سے کیا غرض

ابتدائے عشق میں تکمیلِ لُطفِ زیست ہے
انتہا تو ہو چکی، اب انتہا سے کیا غرض

لُطفِ ذوقِ نغمہ یہ ہے، ساز سے ہو ساز باز
کیسی لَے ہے اور کس کی ہے صدا سے کیا غرض

وُہ سمجھ جاتے ہیں جب باتیں لبِ خاموش کی
ان کے آگے ہم کو عرضِ مُدعا سے کیا غرض

اپنا دیوانہ بنانا تھا، بنا کر چل دیئے
اب کسی کو مجھ گرفتارِ بلا سے کیا غرض

پھر نگاہِ ناز سے ذوقِ طلب ہے آشکار
اب تمہیں میرے دِلِ بے مدعا سے کیا غرض

ہیں سرور افزا، شروعِ عشق کی رنگینیاں
ابتدا ہے لُطف افزا، انتہا سے کیا غرض

عشق کے انجام پر کرتا نہیں کوئی نظر
ابتدا اچھی ہے اس کی، انتہا سے کیا غرض

دل ہی لینے تک رہیں جن کی وفائیں اے متیںؔ
تم کو آخر ایسے مطلب آشنا سے کیا غرض

یادگارِ داغ علامہ ابوالعلم متین مچھلی شہری

ضدی عورت

اسد۔ چلتے ہو؟

ماہ زو۔ کہاں؟

اسد۔ ایک بڑے آدمی سے ملاقات کرنے۔

ماہ زو۔ کیا کوئی لمبا تڑنگا ہے؟

اسد۔ مذاق رہنے دو۔ واقعی بڑا آدمی ہے یعنی دماغی قابلیت میں۔

ماہ زو۔ بہت بڑا سر ہے کیا؟ یعنی چوٹی سے ایڑی تک؟

اسد۔ لاحول ولا۔ اس کی معلومات، اس کی گفتگو عدیم المثال ہیں۔

ماہ زو۔ اور تحریر؟

اسد۔ یہ تو مجھے پتہ نہیں کہ وہ مصنف ہیں یا نہیں۔

ماہ زو۔ محض گفتگو کے اچھوتے فقروں پر آپ مرتے ہیں مگر یہ تو فرمایئے کہ یہ لیاقت کا پتلا آخر کوئی خاص بات تو کرتا ہوگا! اس کی زندگی کا پروگرام کیا ہے؟

اسد۔ بظاہر تو وہ آزاد مگر روحانی چلن کے حامی ہیں۔ کسی کے بلائے ہوئے آئے ہیں۔ چرچا بہت ہے کہ ہندوستان میں نئی روح پھونک رہے ہیں۔

ماہ زو۔ (تأمل کے بعد) آزاد مگر روحانی چلن!! نئی روح!!! سنو اسد! ہندی اس پرانے مال کی گاہک نہیں۔ جو شخص روح جیسا فرسودہ لفظ استعمال کرے اس کی گفتگو سننے کے قابل ہو نہیں سکتی۔ میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی۔ ہاں ایک بات اور، بتا سکو تو بتا دو۔

اسد۔ کیا؟

ماہ زو۔ کیا وہ اپنے آپ کو واقعی بڑا آدمی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں؟

اسد۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ بہت منکسر المزاج انسان ہیں۔

ماہ زو۔ لاحول ولا۔ جسے خود اپنے پر اعتماد نہیں، وہ کس کام کا انسان؟ جھوٹ سہی مگر اتنی جرأت تو ہو کہ کہے کہ

"آج مجھ سا نہیں زمانے میں"

اسد۔ خیر تمہاری مرضی، مگر میرا خیال تھا کہ تمہیں شاید ایک غیر معمولی شخصیت سے تبادلۂ خیالات کا موقع مل جاتا تو چند ان مجاز ہوتا۔

ماہ زو۔ ٹھیک کہتے ہو۔ مگر اسد یہ تم نے سوچا کہ انسان سرکس دیکھنے شوق سے جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ شیر کو نہ صرف اسیر دیکھتے ہیں بلکہ ایک نو خیز لڑکی کی چابک سے شیر کرتب دکھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بکری اور بندر تک شیر کی پیٹھ پر سواری گانٹھتے ہیں۔

نہیں ایسے آدمی سے ملنے کی متمنی ہوں جو انسانوں سے وہ کام لے (چاہے چابک آچا ہے چلتے لوہے سے) جو سرکس میں شیر سے لیا جاتا ہے۔

اسد۔ ایسا آدمی تو بہت قابلِ نفرت ہونا چاہئے۔

ماہ رُو۔ بالکل درست۔ قابلِ نفرت ضرور ہوگا۔ مگر انسانی سرشت کو عارضی طور پر بدل دینا بھی بہت بڑا اقدام ہے۔ میرا مطلب اُن یوگیوں سے نہیں جو لوہے کی میخوں پر سوتے ہیں۔ یا زندہ دفن ہوتے ہیں۔ میرا اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو دوسروں سے کام لیں۔

اسد۔ سمجھا میں۔ یعنی اگر آج کوئی حسن بن صباح ہو تو اس سے آپ ضرور ملیں۔

ماہ رُو۔ یقیناً۔ حسن بن صباح ہو یا کوئی الزکھی قسم کا انارکسٹ ہو جو ایٹم بم سے ڈرا کر دُنیا کو دو چار مہینے اپنی مرضی سے چلائے۔ حشر چاہے کچھ ہو مگر اس مرضین دُنیا میں یہ تجربہ لازمی ہے۔ مذہب، قومیت، دُعا سب کچھ آزمائے جا چکے ہیں۔ خوف بہت بڑی طاقت ہے۔ اس کا آزمانا باقی ہے۔ خوف کے چابک سے اگر انسانوں سے آزادی کے کرتب دکھلائے جا سکیں تو دُنیا سنور جائے۔

اسد۔ کیا مطلب؟

ماہ رُو۔ مثلاً پہلی آزادی یہ سکھلائی جائے کہ بچے ماں باپ کے لئے نہیں، ماں باپ بچوں کے لئے نہیں۔ یعنی کوئی آدمی بھول کر بھی یہ خیال نہ کرے کہ جو صدیاں گزر چکی ہیں اُن کا ہم پر کوئی حق ہے۔ ہم اُن صدیوں کے بچے ضرور ہیں مگر وہ ہمارے لئے نہیں۔ ہم اُن کے لئے نہیں۔ ہم ماضی کے زنجیر و رسن سے اپنے آپ کو قطعی آزاد تصور کر کے جو چاہیں کریں۔

اسد۔ یہ تو محض بکواس ہے۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ خاندانی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ بچوں کی پرورش، تعلیم، معاشرتی زندگی کا انتظام حکومت کی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کیا جائے۔ یعنی جو پیدا ہو وہ ایک قسم کا غلام ہو۔

ماہ رُو۔ قدرے ٹھیک سمجھے ہو۔ صرف غلام کا لفظ تمہاری پرانی دقیانوسی ذہنیت کا پرتو ہے۔ ساری دُنیا میں جب ایک ہی حکومت ہو گی، قومیت اور رنگ اور اعتقاد کا تفرقہ نہ ہوگا تو غلامی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جب کوئی حاکم نہ ہوگا تو غلامی کیسی اور کس کی؟ سب کے سب کارکن ہونگے۔

اسد۔ اور کارفرما؟

ماہ رُو۔ عجب جاہلانہ سوال کرتے ہو؟ جب سب کی تعلیم ایک جیسی ہوگی، سب کی صحت، سب کی رہائش، سب کی خوراک میں مساوات کا معیار ہوگا۔ نہ کوئی کسی خاص خاندان یا قوم یا ملک یا ملت کا ہوگا تو کارفرمائی کا سوال باقی نہیں رہتا۔ کارفرما کو جب کسی معاملے میں بھی کسی کارکن پر ترجیح نہ ہوگی تو موجودہ معاشرتی ذہنیتیں مفقود ہوں گی۔ جب کسی کو علم ہی نہیں ہوگا کہ میرا بھائی کون ہے، بھتیجا کون ہے، میرا ملک کہاں ہے۔ تو کارفرمائی بھی بقول تمہارے ایک قسم کی غلامی ہوگی۔

اسد۔ بہت خوب حضور! تو اب کیا آپ اسد جیسے مضبوط، خود دار وحشی کے ساتھ شادی کرنے پر محض اس لئے رضامند ہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے آنے والے زمانے کے لئے شاندار غلام پیدا کریں۔ یقین جانئے کہ اس مغرور وحشی کے دل میں پیار محبت کا نام نشان تک موجود نہیں۔ بچوں کو اپنا کبھی تصور نہ کرے گا۔ پیدا ہوتے ہی حکومت کی نذر کر دے گا۔ آپ کے گھر میں حکمران غلام ہو کر رہے گا۔ کھانے پینے لتے کپڑے کا اسے جھنجھٹ نہ ہوگا۔ لیکن اگر کوئی اڑ کھیلی لونڈیا اس غلام کو چرا کر لے جائے تو آپ کا گلہ مجھ پر نہیں ہوگا۔ بلکہ حکومت کی کوتاہی سمجھی جائے گی؟ کہو منظور ہے؟

(۲)

ماہ رُو۔ اگر میری اور تمہاری یہ تمام گفتگو اُس بڑے آدمی کے سامنے ہوتی تو وہ کیا کہتا؟

اسد۔ بڑا آدمی ہوگا تو اپنے گھر میں ہوگا۔ میرے معاملات میں اُسے دخل دینے کا کیا حق ہے؟

ماہ رُو۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس تمہارے "ہندوستان" میں "نئی روح" پھونکنے والے سے مل کر پوچھوں تو سہی کہ اس قسم کے معاملہ میں اس کی کیا رائے ہے؟ چلتے ہو؟

اسد۔ وہ تمہیں نہیں ملے گا۔

ماہ رُو۔ کیوں؟

اسد۔ بہت ہی کوڑ مغز ہو۔ اپنی اس تھوڑی سی عمر میں صرف ایک بڑا آدمی دیکھا ہے اور وہ میں خود ہوں۔ یعنی جب میرے دل میں تمہارے پیار کا ستارا چمکتا ہے، اس وقت ساری دُنیا میں مجھے اپنے سے بہتر اور برتر اور کوئی معلوم نہیں ہوتا اور ہو بھی نہیں سکتا۔ لیکن اب تمہارے خوف سے سرشتی پیار کے جذبہ کو فراموش کر کے عقل کے کرتب دکھاتا ہوں۔ بڑا کیا خاک ہوں؛ عقل کے سرکس میں ایک بھُوکا خوف زدہ شیر ہوں۔ چابک اور جلتے لوہے سے ڈر کے مارے معقول باتیں کرنے پر مجبور ہوں۔ شیر سے دُم ہلانے والا کتا بن چلا ہوں۔

ماہ رُو۔ تو کیا اب تمہارے دل میں ذرہ برابر بھی پیار کا نشان نہیں؟

اسد۔ پیار کی ایسی تیسی! تمہیں محض ایک اجنبی بے غرض شخص کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ تمہاری پیشانی پر خفیف سی خراش کیسے آئی؟

ماہ رُو۔ یونہی اپنا ناخن لگ گیا۔ کریم مل کر سونے کو ہو رہی تھی کہ ایک کم بخت مکھی کہیں سے آنکلی۔ بہت ہٹایا مگر ماتھے پر بیٹھ ہی گئی۔ تھپڑ جو رسید کیا تو اپنا ہی ناخن چبھ گیا۔

اسد۔ لمبے نکیلے ناخن رکھنے کی اچھی سزا ہے؛ مگر میں خوش ہوں کہ بظاہر آزاد لڑکیاں بھی فیشن کی زنجیروں میں مقید ہیں۔

ماہ رُو۔ جلی کٹی باتیں کہنے پر اُتر آئے۔ بڑے ذلیل انسان ہو۔

اسد۔ واقعی ذلیل ہوں۔ عقل کی بات کرتا ہوں اس سے بڑھ کر ذلت کیا ہوگی؟

ماہ رُو۔ کیا میرا خوف تمہارے دماغ سے عقل کی لعنت کو دُور نہیں کر سکتا؟

اسد۔ ہرگز نہیں۔ پیار تھا تو خوف تھا۔ پیار گیا تو خوف کا کیا کام۔

ماہ رُو۔ اور جو میرے دل میں پیار پیدا ہو جائے تو کیا میرے دل میں بھی خوف ہوگا؟

اسد۔ لازماً۔ مگر تمہارے دل میں پیار کیوں پیدا ہونے لگا؟ اور میری نصیحت تو یہی ہے کہ اپنے آپ کو اس زحمت سے بچاؤ۔ کہیں تم بھی بڑی ہستی بن جاؤ، تو پھر بقول تمہارے تم سے ملنا محض وقت ضائع کرنا ہوگا۔

ماہ رُو۔ بات کو تم خوب پلٹتے ہو۔ بدلہ لیتے شرم تو نہیں آتی۔

اسد۔ شرم گئی جہنم میں۔

ماہ رُو۔ میرا خیال ہے کہ گو پُرانی تہذیب قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے۔ مگر اس کی دو چار باتوں میں کچھ لطف بھی تھا مثلاً تمیز کی گفتگو میں۔ آداب مجلس میں۔ شاعری کی مصنوعی پیغمبری میں، اخباروں کے افتراؤں میں۔ اور شرم اور حیا میں۔

اسد۔ ہم کو ان بوسیدہ کرم خوردہ عادات کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ لو اب میں چلتا ہوں۔

ماہ رو۔ کدھر جاؤ گے؟

اسد۔ ایک جلسہ ہو رہا ہے۔ اس میں میری تقریر ہے۔

ماہ رو۔ کہاں پر اور کس وقت؟

اسد۔ شہر کے باہر والے باغ میں۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد۔ اپنی تقریر میں کچھ ردو بدل کرنا چاہتا ہوں۔ بائی بائی۔

ماہ رو۔ میں بھی چل رہی ہوں۔

اسد۔ کدھر کو؟

ماہ رو۔ باغ میں ذرا سیر کے لئے جاؤں گی۔

اسد۔ تنہا؟

ماہ رو۔ تم نے مجھے کسی اور کے ساتھ کب دیکھا ہے؟

اسد۔ کسی کے ساتھ نہیں دیکھا مگر میرا سوال کسی اور وجہ سے تھا اور وہ یہ کہ آجکل کی عملی دُنیا آپ کی خیالی دُنیا سے بہت پیچھے ہے اور چند ماہ سے کسی خاتون کا بے نقاب باغ میں سرگشت کے لئے نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ کالج کے لونڈے تو محض آوازے ہی کستے ہیں۔ مگر چند ایک اوباش اُچکے کسی اور دُھن میں شکار کے منتظر رہتے ہیں۔

ماہ رو۔ یونہی ہوگا۔ مگر مجھ کو کوئی بدامنی کا خوف اپنی سیر سے باز نہیں رکھ سکتا۔ اور ایک آدھ اُچکے کی مرمت تو میں خود کر لوں گی۔

اسد۔ کیا یونہی [illegible] پہن کر نکلو گی؟

ماہ رو۔ اور کیا [illegible] میں یہ فائدہ ہے کہ انسان اُچکے کو ٹھوکر لگا سکتا ہے۔ اور پھر اس کی شناخت ہو سکتی ہے۔

اسد۔ ماشاء اللہ بہت دُور اندیش ہو۔ بائی بائی۔ (چلا جاتا ہے)

(۳)

(ماہرو باغ میں سیر کرتی ہوئی ایک بنچ پر جہاں تنہائی ہے اور پیچھے کی
طرف سے گنجان درختوں کا سایہ ہے، بیٹھ جاتی ہے۔ ہینڈ بیگ میں
سے کاغذ قلم نکال کر کاغذ پر یہ لکھتی ہے۔)

"پیار؟ صحیح ۔ پیار کی زندگی؟ کچھ عرصہ کے لئے صحیح اور پھر قطعی غلط۔ کیا تھوڑی سی خوشی کے لئے بہت سی غلطی روا ہے؟ اس کا جواب مشکل ہے۔ اپنی اپنی طبیعت پہ مدار ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ تھوڑی سی خوشی سے بھی پھولی نہ سماؤں اور بہت سے رنج کو یوں پی جاؤں کہ گویا تھا ہی نہیں۔ مگر میں کیوں ایسا کروں؟ کیوں امتحان میں پڑوں؟ مگر کیوں امتحان سے ڈروں؟ چھوٹی سی بات کا فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے۔ یہ سب نقص ہماری تعلیم کا ہے۔ ہم آئندہ کے فکر میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں۔ فیصلہ وقتی ضروریات کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اگر وقتی ضروریات اور مجبوریوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو اسد ایک انعام ہے۔ اسے کیوں ٹھکرایا جائے۔ باتیں بہت بناتا ہے۔ سوچتا کم ہے مگر اُن سے بہتر ہے جو سوچتے بہت ہیں اور بولتے کم ہیں۔ اُن سے تو میرا دم اُلٹتا ہے۔ اسد، اسد، اسد!!! میرے دماغ پر سوار ہے، میرے دل پر غالب

میرے دل پر، مگر دل کی بات مان لینا کہاں کی عقلمندی ہے ؟
کیا کسی سیلی سے پُوچھوں ؟ لاحول ولا۔ زندگی میری اور پوچھوں سیلی سے ؟ کس قدر احمقانہ میرا تخیل ہے فیصلہ میں خود ہی کرلوں گی اور جلدی کروں گی۔ . . . . .

ماہ رُو۔ (چونک کر۔ کاغذ کا پرچہ پھینک کر۔ بدمعاش کا ہاتھ بیگ کی طرف بڑھتا دیکھ کر) ارے تُو کون ہے۔ بدمعاش، خبردار جو میرا بیگ چھُوا۔

اُچکا۔ بدمعاش تُو ہوگی کہ بے پردہ پھرتی ہے۔ اور بیگ دے دے۔ نہیں تو لاٹھی مار کر بھیجا پھوڑ دوں گا۔

ماہ رُو۔ (غصہ سے بھڑک کر) پاجی کہیں کے۔ مار کر جان نکال دوں گی۔ (یہ کہتی ہے، دو ٹھوکریں بوٹ سے اُس کے پیٹ میں مارتی ہے) اُچکا گر پڑتا ہے۔ مگر اس کے ساتھی کو آتا ہُوا دیکھ کر ماہرو پہلے اُچکے کی لاٹھی سنبھال لیتی ہے۔ دوسرا اُچکا آکر ماہرو کو لاٹھی سے مارنا چاہتا ہے۔ دو دفعہ تو ماہرو لاٹھی پر اُس کا وار روکتی ہے۔ مگر آخر لاٹھی ماہرو کے ہاتھ سے گر جاتی ہے۔ ماہرو بھاگنے کے بجائے اُچکے کی طرف بڑھ کر اسے پاؤں سے ٹھوکر مارنے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر اُچکا پھرتی سے ایک طرف ہو جاتا ہے، اور ہاتھ بڑھا کر ماہرو کے لمبے بالوں کو قابو کر لیتا ہے۔ دوسرے ہاتھ سے اس کا گلا دبانا چاہتا ہے کہ ماہرو شور کرتی ہے۔ مار ڈالا — مار ڈالا — گنجان درختوں میں سے اسد شیر کی طرح بھپرتا ہُوا نکلتا ہے، اور اُچکے کو ایک مُکّے سے گہری نیند سُلا دیتا ہے)

اسد۔ تمہیں چوٹ تو نہیں آئی ؟

ماہرو۔ کم بخت نے میرے بال بُری طرح گھسیٹے۔ مگر گلا پُوری طرح نہ دبا سکا۔

اسد۔ یہ اُچکے کچھ اپنے فن میں ہوشیار نہیں۔ کیا انہیں پولیس کے حوالہ کر دوں ؟

ماہرو۔ کیوں ؟ کافی سزا انہیں مِل چکی۔ پڑا رہنے دو۔ خود ہی شرما کر چل دیں گے۔ تم کیسے آنکلے ؟

اسد۔ تھوڑی دیر کے لئے بڑا آدمی بن گیا تھا۔ اور تم اس سے مِل ہی لیں۔ تم لکھ کیا رہی تھیں ؟

ماہرو۔ وُہ تو بھُول ہی گیا۔ وہ پڑا ہے کاغذ۔ مہربانی سے اُٹھا دیجئے۔

اسد۔ پڑھ لُوں ؟

ماہرو۔ بیشک۔

اسد۔ (ایک نظر ڈال کر) اس میں تو میرا نام لکھا ہے ؟

ماہرو۔ ہاں شاید لکھا تھا۔

اسد۔ (سارے کاغذ کو پڑھ کر) چلتی ہو ؟

ماہرو۔ جہاں کہو۔ جب تک کہو !

"فلک پیما"

غزل

وُہ غیروں کو ساغر دیئے جا رہے ہیں
اِدھر خُونِ دِل ہم پیئے جا رہے ہیں
ہر اِک سانس چُبھتی ہے اک پھانس بن کر
مگر اس پہ بھی ہم جئے جا رہے ہیں
ارے کوئی کہہ دے، یہ کیا ہو رہا ہے
کہ وُہ مجھ کو مجھ سے لئے جا رہے ہیں
کبھی میٹھی میٹھی، کبھی کڑوی کڑوی
وہ جیسی پلائیں، پیئے جا رہے ہیں
عجب ہیں تماشے قضا و قدر کے
دیئے جا رہے ہیں، لئے جا رہے ہیں
تصوّر کی تصدیق، ممکن نہیں ہے
مگر پھر بھی کوشش کیئے جا رہے ہیں
کسی سنگدل کے تصوّر میں امجد
بُتوں کی پرستش کیئے جا رہے ہیں

امجد حیدرآبادیؒ

اِنسان

یہ ظلم و کثافت کا ناصاف عالم — یہ تاریک بے عدل و انصاف عالم
بظاہر بڑا دلکشا بوستاں ہے — تہِ بوستاں کوہِ آتش فشاں ہے
درندہ ہے اِک یہ ستم بیز انساں — ہے سب سے بڑا فتنہ انگیز انساں
شجاعت سمجھتا ہے قتل اور چوری — بڑے فخر کی بات ہے سینہ زوری
بڑی شان ہے قاتل اور چور ہونا — گناہِ کبیرہ ہے کمزور ہونا
ہر اِک ہے یہاں دوسرے کی کمیں میں — چھپائے ہوئے خنجر اِک آستیں میں
یہاں دوستوں سے بھی ہشیار رہنا — ہزار آنکھ رکھنا، خبردار رہنا
مدار اِس جہاں کا ہے غارتگری پر — نہ رحم و کرم پر، نہ کچھ دلبری پر
کوئی لوٹ لیتا ہے نام خدا پر — کہ رحمت خدا کی ہے کشور کشا پر
ہے جس مُدّعی کا کہ تہذیب مقصد — حقیقت میں ہے حق کی تکذیب مقصد
ہیں نادار کو صاحبِ مال کھاتے — ہیں کمزور مچھلی کو گھڑیال کھاتے
نہیں بلبلوں اور بٹیروں کی دُنیا — یہ ہے بھیڑیوں اور شیروں کی دُنیا
ہے صورت میں جس کی نمایاں بزرگی — چھپائی ہے اس نے طبیعت کی گرگی

قبائے ریا، جامۂ پارسائی
پڑے ہاتھ تو لوٹ لیں سب خدائی

خلیفہ عبدالحکیم

فراق گورکھپوری اور اُردو کا جنم

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم اے نے ادب لطیف کے سالنامہ ۱۹۴۵ء میں ایک مضمون "اردو کا جنم" کے عنوان سے سپردِ قلم فرمایا تھا۔ جو رسالہ ادبی دنیا کے اگست نمبر ۱۹۴۵ء میں نقل کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں فراق نے اردو کی عہد بعہد کی ترقیوں کو اپنی رنگین اور ہندی نما زبان میں پیش کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ان کی یہ کوشش ناکام اس وجہ سے ہے کہ اس میں قدم قدم پر غلط بیانیاں موجود ہیں۔ جن سے فراق کے علمی فقدان کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے اس مضمون کی ابتدا مندرجہ ذیل اقتباس سے عجیب بے ہنگم طور پر ہوتی ہے۔

"ہندوستان کے مختلف حصوں میں عالموں کی زبان سنسکرت تھی۔ عوام کی زبان پراکرت تھی۔ جسے اس زمانہ کی ہندوستانی یا اردو یا ہندی کہہ سکتے ہیں۔ جب مہاتما گوتم بدھ نے اپنا وعظ شروع کیا تو پراکرت بدل کر پالی زبان کی شکل اختیار کر چکی تھی۔" (ادبی دنیا۔ ص۔ ۷۲)

مذکورہ بالا عبارت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ فراق کس عہد کے عالموں کی زبان کا تذکرہ کر رہے ہیں؟ کس زمانے میں عوام کی زبان پراکرت تھی؟ کون سی اور کس خطہ کی پراکرت عوام کی زبان بن چکی تھی؟ یہ عالم کس نسل سے تھے۔ اور ہندوستان کے کون سے حصوں سے متعلق ہے؟ فراق نے عمداً یہ فرض کر لیا کہ ہر اردو داں ہندوؤں کے عہد قدیم کی ہندوستانی تاریخ سے بخوبی آگاہ ہے اور اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کن لوگوں کا تذکرہ کر رہے ہیں؟ اس سے فراق کے تاریخی اور لسانی علم کے فقدان کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس مضمون کی ابتدا لفظ "ہندوستان" سے کی ہے۔ وہ اس عہد اور زمانے کے لئے لفظ "ہندوستان" استعمال کر رہے ہیں۔ جب کہ اس عہد کے لوگوں کے کان بھی اس سے آشنا نہ تھے۔ مسلمانوں کی آمد تک انہوں نے لفظ "ہندوستان" استعمال نہیں کیا۔ آج کل لفظ "ہندوستان" سے مراد "شمالی اور جنوبی" دونوں حصے لئے جاتے ہیں۔ مگر جس عہد میں فراق سنسکرت ہندوستان کے عالموں کی زبان بتاتے ہیں۔ اور ان کو ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلا ہوا دکھاتے ہیں۔ اس وقت وہ موجودہ سرہند سے پریاگ تک اور ہمالیہ سے لیکر بندھیاچل کے خاص خاص حصوں میں رہتے تھے۔ مذکورہ بالا حدود میں بھی وہ ہر جگہ موجود نہ تھے۔ پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ "ہندوستان" کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے؟ فراق کو یہ لکھنا چاہئے تھا کہ فلاں خطے میں وہ لوگ موجود تھے۔ اور اس خطے کا نام بھی دینا چاہئے تھا۔ غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر تاریخ نویسی نہیں کی جا سکتی۔ اس میں ملک اور حصوں کے حدود کو متعین کرنا ضروری ہوتا ہے۔ فراق گورکھپوری دیکھیں کہ اس عہد میں کون کون سے الفاظ رائج تھے۔ اور وہ بھی کتنے کتنے حصوں کے لئے۔ آریہ ورت۔ برہما ورشی دیش برہما ورت۔ بھارت ورش اور مدھ دیش وغیرہ الفاظ اس عہد میں مستعمل تھے۔ لفظ ہندوستان (ہندو + ستان یعنی چوروں، غلاموں، کافروں، ڈاکوؤں اور معشوقوں کے رہنے کا مقام) مسلمانوں نے پہلی بار استعمال

[illegible] اردو دانوں کی [illegible] تحقیق [illegible] مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ملاحظہ ہو۔

لیے Rapson اپنی تاریخی کتاب Ancient India میں ان ناموں کے حدود ذیل پیش کرتا ہے۔

۱۔ آریہ ورت۔ آریوں کے رہنے کا وہ مقام ہے جو ہمالیہ اور بندھیاچل کے درمیان واقع ہے۔ اور جس کی حدود مشرقی اور مغربی سمندر کو چھوتی ہیں۔

۲۔ برہماورشی دیش۔ رشیوں اور دلیوں کے رہنے کا وہ مقام جو گنگا اور جمنا کے درمیان واقع ہے۔ خاص کر ضلع متھرا۔

۳۔ برہماورت۔ عہد حاضر کا سرہند۔

۴۔ بھارت ورش۔ اس سے مراد وہ ملک ہے جو بھرت کے زیر حکومت تھا۔ یہ ملک دراصل افسانوی تخیل کی پیداوار ہے (ص ۴۴)

۵۔ مدھ دیش۔ وہ خطہ ہے جو موجودہ سرہند سے لے کر پریاگ تک پھیلا ہوا ہے (ص ۵۰)۔

فراق کو چاہیئے تھا کہ وہ لفظ "ہندوستان" کا غلط استعمال کر کے تاریخی غلط فہمیوں کو پیدا کرنے کی کوشش نہ کرتے انہیں صاف طور پر یہ لکھنا چاہیئے کہ یہ عالم آریہ ورت، برہماورشی دیش، برہماورت، بھارت ورش یا مدھ دیش کے رہنے والے تھے۔ لفظ "ہندوستان" جس وقت سے مستعمل ہوا اس زمانہ سے آج تک سنسکرت زبان ایک مردہ زبان ہے۔ وہ مسلمانوں کی آمد کے وقت بھی مردہ زبان تھی۔ فراق لکھتے ہیں کہ عوام کی زبان پراکرت تھی۔ اس سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس خطے کی پراکرت سے ان کا مقصود ہے؟ ہر خطہ کی ایک علیحدہ پراکرت تھی اس پر ستم یہ کہ اسے وہ اس عہد کی ہندوستانی یا اُردو یا ہندی گردانتے ہیں۔ کیا فراق کوئی ایک بھی ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں جس میں ہندوستانی یا اُردو اس عہد میں کسی خطے کی زبان کو کہا گیا ہو۔ ہندی کا لفظ بھی اس عہد میں رائج نہ تھا۔ فراق نے خود مطالعہ کیا ہوگا کہ یہ لفظ انگریزوں کی جدت ہے انہوں نے یہاں کی زبان کو ہندوستانی کہنا شروع کیا۔ کیا فراق کسی ادبی شاہکار سے اس کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں جو انگریزوں کی آمد سے قبل موجود ہو۔ اور جس میں یہ لفظ یہاں کی پراکرت کے لئے استعمال کیا گیا ہو؟ اردو مسلمانوں کے عہد حکومت میں لشکر کی زبان کے لئے رائج ہوا۔ کیا فراق ہندوؤں کے عہد حکومت کی تاریخ سے ایسی مثال پیش کر سکتے ہیں جس میں اس کو اُردو کہا گیا ہو؟ فراق نے اردو کے ساتھ ہندی کا استعمال کیا ہے جس کے معنی وہ سنسکرت آمیز زبان ہے جو ۱۸۰۳ء میں سدل مصرا اور للو لال جی نے فورٹ ولیم کالج میں لکھی اور جس کو سنسکرت کے الفاظ استعمال کر کے اُردو سے علیحدہ بنانے کی کوشش کی۔ میں اس کی شہادت انسائیکلوپیڈیا برٹینکا سے پیش کر سکتا ہوں۔

(Hindi) was intended to be a Hindustani for the use of Hindus, and was derived from Urdu.

(ترجمہ) "ہندی ایک ہندوستانی زبان ہی تھی۔ جو ہندوؤں کے لئے مخصوص تھی اور اُردو سے نکلی تھی۔"

کیا اس معنی میں لفظ ہندی پراکرت کیلئے کبھی استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو فراق حوالے دیں۔ کوئی پراکرت اپنے عہد کی ہندی یا اُردو یا ہندوستانی[1] سے تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنے خطہ یا حصے کی عام زبان یا پراکرت گردانی جا سکتی ہے۔

---

[1] ہندوستانی۔ مہاتما گاندھی ہندوستانی سے مراد اردو اور ہندی لیتے ہیں۔ انگریزوں نے لفظ ہندوستانی کو ان معنی میں استعمال نہیں کیا۔

فراق تاریخ زبان اردو پیش کرتے ہوئے ایسا معجزہ دکھاتے ہیں جو عقل و شعور سے بالاتر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسی اقتباس میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "جب مہاتما گوتم بدھ نے اپنا وعظ شروع کیا تو پراکرت بدل کر پالی زبان کی شکل اختیار کر چکی تھی" گوتم بدھ نے جس زبان میں اپنے مذہب کی اشاعت شروع کی وہ عوام کی زبان تھی۔ اس خطہ کے عوام کی زبان وہاں کی پالی پراکرت تھی جو تدریجی ترقی کرتے کرتے زبان بن گئی۔ پہلے فراق یہ تحریر کرتے ہیں کہ عوام کی زبان پراکرت تھی۔ یہ عوام کس خطے کے تھے ؟ کچھ علم نہیں۔ اور گوتم بدھ نے وعظ تو شروع کیا مگر کس پراکرت میں یا کس زبان میں؟ اور کس خطہ میں؟ مگر یہ معجزہ تھا کہ بغیر کسی پراکرت کو ذریعۂ اظہار بنائے۔ پراکرت، پالی زبان میں بدل گئی۔ کسی تاریخی شہادت سے فراق یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ پراکرت بدل کر پالی زبان ہو گئی ہو تبدیلی ممکن نہیں تدریجی ترقی ضرور ممکن ہے جو سرمایۂ زبان کے اضافہ کے ساتھ ساتھ ہوتی رہتی ہے مگر فراق کی تحریر یہ بتاتی ہے کہ پراکرت اور پالی دو علیحدہ زبانیں تھیں۔ حالانکہ جس زبان میں گوتم بدھ نے پرچار شروع کیا وہ پالی پراکرت تھی ایک اور مقام پر وہ اپنے اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں:۔

"پھر ہندوستان کے مختلف حصوں میں پراکرت اور پالی بدل کر کچھ سنسکرت الفاظ کو بھی زبان میں شامل کرتے ہوئے کئی زبانیں بن گئیں جیسے بنگالی۔ مراٹھی۔ گجراتی۔ سندھی۔ ہندی۔ پنجابی وغیرہ (ص ۲۷)

بقول فراق پراکرت اور پالی بالکل علیحدہ علیحدہ خطوں اور گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں جو بدلتی رہیں اور سنسکرت سے الفاظ لے کر اپنے ادبی سرمایہ میں اضافہ کرتی رہیں اور یہی وہ پراکرت اور یہی وہ پالی زبان تھی جو سنسکرت زبان کی آمیزش سے بنگالی، مرہٹی، گجراتی، سندھی، ہندی اور پنجابی زبانیں بن گئیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا زبانیں "اپبھرنش" زبان سے نکلی ہیں۔ اس کے تحت میں ہر خطہ کی ایک علیحدہ پراکرت تھی۔ اس پراکرت میں تدریجی ترقی ہو کر وہ زبان بنی۔ جنوبی پراکرتیں، مشرقی پراکرتیں، مغربی پراکرتیں، شمالی پراکرتیں، جنوب مغربی اور شمال مغربی پراکرتیں، مرہٹی، بنگالی، بہاری، پہاڑی، راجستھانی، پنجابی اور سندھی جیسی زبانوں میں ظاہر ہوئیں نہ کہ فراق کی وہ ایک پراکرت جو پالی زبان میں تبدیل ہونے کے بعد بھی اپنی یکتائی باقی رکھتی ہے اور سنسکرت سے الفاظ لے کر ہر خطہ کی ایک علیحدہ زبان کی شکل میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ آریہ ہندوستان میں وقتاً فوقتاً آتے رہے اور ان کے ساتھ آریائی زبانیں بھی آتی رہیں۔ وہ کوئی ایک زبان لے کر ہندوستان میں نہیں آئے۔ خود "ہندی بھاشا کا وکاس" میں شیام سندر داس جی، سیکرٹری ناگری پرچارنی سبھا بنارس (صفحہ ۳۳) پر یوں لکھتے ہیں:

"کچھ ٹولیاں پہلے کئی بار میں آئیں اور کچھ ان کے کچھ سمے کے اپرانت۔ ان سب ٹولیوں کی بولیوں میں انتر اوشیک تھا . . . . . پہلے آنے والی ٹولی کی بولی الگ تھی اور پیچھے آنے والی ٹولی کی الگ۔"

ان میں صرف ایک ابتدائی بولی "دیوبانی" ہونے کی وجہ سے محفوظ رہ سکی۔ وہ ہندوستان کے جن جن خطوں میں گئے وہاں کی پراکرت سے ان کی پراکرت کی آمیزش ہوئی اور نئی زبانیں ظہور میں آنے لگیں۔ اس کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب آریوں کا پہلا گروہ ہندوستان میں اقامت گزیں ہوا۔ اور یہاں کی آسائش نے اس کو کمزور کر دیا تو دوسرے گروہ کے آریوں نے ان کو مار کر شمال جنوب اور جنوب مغرب کی طرف دھکیل دیا۔ اس طرح نو وارد خود تو "اندرونی آریا" بن بیٹھے اور شکست خوردہ کو "بیرونی آریا" بنا دیا۔ ان بیرونی آریوں کے مشرقی گروہ سے آسامی، بنگالی اور اوڑیا متعلق ہیں۔ وسطی گروہ سے گجراتی اور شمال مغربی گروہ سے پنجابی وغیرہ تعلق رکھتی ہیں۔ فراق کا خیال کسی طرح بھی قابل قبول نہیں کہ پراکرت اور پالی، پنجابی

سندھی، گجراتی، مراٹھی۔ وغیرہ زبانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اس سلسلے میں فراق یوں گوہر افشانی کرتے ہیں۔

"دکن کی زبانیں جیسے تامل تلگو کنٹری وغیرہ کو بھی دکھنی ہند کی پراکرت اور پالی کی بدلی ہوئی شکل کہنا چاہئے" (ص ۷۲)

فراق بغیر کسی علمی تحقیق کے تاریخ کے میدان میں اتر آئے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ آریائی اور غیر آریائی زبانیں کس کس زمانے میں شمالی اور جنوبی خطوں میں رائج تھیں۔ تامل، تلگو اور کنٹری وغیرہ کو آریائی نسل کی زبان بتانا ایسا ہے جیسے گینڈے کو ہاتھی کا بچہ بتانا۔ تامل، تلگو اور کنٹری غیر آریائی زبانیں ہیں جو دکن میں اس وقت سے رائج تھیں جبکہ آریوں کا ہند میں وجود بھی نہ تھا۔ یہ زبانیں آریائی نسل کی نہیں بلکہ ڈراوڈی سے متعلق ہیں۔ ڈراوڈی اقوام کے لوگ ہندوستان میں آریاؤں سے ایک عرصہ قبل داخل ہو کر گنگا اور جمنا کے دوآبے میں پھیل گئے تھے آریوں کی آمد پر وہ جنوبی ہندوستان کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس وقت تامل، ملیالم، گونڈی، کنٹری، کولی، تلنگی، کولامی، کرخ، براہومی، ملتو، ٹہرگ، کوردمبا، بیجاپوری، کوٹاڈ، سالیوری، شمالی سرکاری گواری وغیرہ وغیرہ زبانیں رائج تھیں۔ نہ معلوم فراق کس منطق سے ان زبانوں کو آریائی نسل کی زبانیں بتاتے ہیں۔ اللہ ری دلیری کہاں پالی پراکرت اور کہاں ڈراوڈی زبانیں۔ پالی پراکرت ان ڈراوڈی زبانوں کے صدہا برس بعد پیدا ہوئی۔ تامل، تلیگو اور کنٹری زبانیں کسی طرح بھی دکھنی ہند کی پراکرت اور پالی کی بدلی ہوئی شکل نہیں ہو سکتیں۔ اس کے بعد فراق یوں رقمطراز ہیں۔

"ابھی تک عوام کی یہ مختلف زبانیں بولیوں کی شکل میں تو بنتی جارہی تھیں لیکن مسلمانوں کے آنے سے پہلے اتنی ترقی نہیں کر سکی تھیں کہ علمی و ادبی زبان کا مرتبہ حاصل کریں" (ص ۷۲)

مسلمانوں کی آمد مسلمانوں کی آمد سے قبل یہ زبانیں بولیوں کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ اور کاروباری زبان کی حیثیت سے رائج تھیں۔ ان میں مذہب کی اشاعت بھی کی جارہی تھی۔ پالی ہی کو دیکھ لیجئے وہ ادبی زبان بن چکی تھی۔ خود فراق کی زبانی سنئے۔

"مذہب علم و ادب کا بہت بڑا حصہ پالی زبان میں ملتا ہے، زمانہ گزرتا گیا اور اندازاً ایک ہزار برس تک پالی زبان اور پالی ادب کا بول بالا رہا" (ص ۷۲)

فراق خود تحریر کرتے ہیں کہ پالی پراکرت، پالی ادبی زبان بن چکی تھی اس کے علاوہ غیر آریائی زبانیں بھی ہندوستان میں علمی اور ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ڈراوڈی تہذیب و تمدن آریوں کے آمد سے قبل اپنے انتہائی عروج پر تھا ان کا غیر متمدن اقوام میں شمار کرنا دراصل ان پر ظلم و ستم ہے۔ ڈراوڈی کے متعدد گروہ تھے۔ ان میں وہ گروہ زیادہ متمدن اور تہذیب یافتہ تھے۔ جو کنٹری، تلنگی، تامل اور ملیالم زبانیں بولتے تھے۔ کنٹری میں قدیم زمانے سے تصنیف و تالیف کا کام شروع ہو گیا تھا۔ تلنگی زبان اپنی فصاحت کے لئے اس عہد میں زیادہ مشہور تھی۔ کیونکہ اس کا ادب صرف شاعری ہی پر مشتمل تھا۔ ان زبانوں کی موجودگی میں یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں علمی و ادبی زبانیں موجود نہ تھیں، فراق سنسکرت کی برتری دکھانے کے لئے ان قدیم غیر آریائی زبانوں کے ادبی سرمایہ کو علمی تعصب کی بنا پر نظرانداز کر جاتے ہیں۔

محمد بن قاسم کے حملے سے وہ مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں دکھاتے ہیں۔ حالانکہ مسلمان پہلی صدی ہجری میں ساحل ملیبار[1]

---

[1] "ملیبار سے عربوں کے تعلقات" مصنفہ حکیم شمس اللہ صاحب قادری۔

پر تجارت کرتے تھے۔ لفظ ملیبار اہل عرب ہی کا دیا ہوا ہے۔ اہل عرب جنوبی ہندوستان کے مغربی ساحل کو ملیبار کہتے ہیں۔ عرب کے جغرافیہ نویسوں میں پہلی بار ۱۱۵۴ء میں شریف ادریسی نے اپنی تصنیف "نزہتہ المشتاق" میں ملیبار کا استعمال کیا ہے۔ اس خطے کا نام کنتری اور تامل زبان میں کرالہ اور ملیالم ہے۔ پروفیسر لیکھا راں نے تحریر کیا ہے کہ مسلمانوں کا اثر ملیبار میں یہاں تک ہو گیا تھا کہ چیرا خاندان کے آخری راجہ چیرومن پیرومال نے اسلام بھی قبول کیا تھا۔ وہ عرب جانے کے ارادے سے اپنی مملکت کو اپنے سرداروں میں تقسیم کر چکا تھا۔ سکندر کبیر کے خروج سے صدیوں قبل ملیبار میں مسلمانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ قدیم زمانے میں ہندوستان اور یونان کے درمیان تجارت عرب کے ذریعے ہوا کرتی تھی عرب اس میں بھی ملیبار کی تجارت کا مرکز "مدینہ خلفاء" تھا۔ عجائب الہند میں اس ہندو کا ذکر موجود ہے جو اپنے ایک غلام کے ہمراہ عرب آنحضرت صلعم کی زیارت کے لئے گیا مگر یہ وہاں اس وقت پہنچا جبکہ حضرت عمر بن خطاب مسند خلافت پر متمکن تھے۔ یہ سیلونی ہندوستان واپس نہ پہنچ سکا بلکہ بمقام مکران راہی ملک بقا ہوا۔ اس کا غلام واپس ہندوستان آیا اور وہاں کے حالات بیان کئے۔ تحفۃ المجاہدین میں تحریر ہے کہ ساموری کے عہد میں مسلمان فقراء وارد ملیبار ہوئے۔ ان کے ہمراہ ساموری عازم عرب ہوا۔ یہ راجہ ساحل عرب پر پہنچ کر زندہ نہ رہ سکا۔ مگر اس نے ان فقراء سے یہ وصیت کی کہ وہ ساحل ملیبار پر پہنچ کر اسلام کی اشاعت کریں۔ چنانچہ ان لوگوں میں سے شرف بن مالک، مالک بن دینار اور مالک بن حبیب مسلمانوں کا ایک گروہ لے کر ملیبار پہنچے اور اس کو اپنا وطن بنا لیا۔ وہ کئی گروہوں میں منقسم ہو کر ملیبار کے مختلف شہروں میں آباد ہو گئے۔ کرنگانور، کولم، ایلی، مارادی میں مسجدیں تعمیر کرائیں اور پھر جرفتن، درفتن، فندرینہ، اچالیات اور فاکنور میں مسجدیں بنوائیں۔ غرض اسلامی نوآبادیات کی بنیادیں یہاں پر پڑ گئیں۔ اور اس طرح مسلمانوں کی آبادی ہندوستان میں روز بروز بڑھتی گئی۔ مسلمانوں کی یہ آمد و رفت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

ان شواہد کی موجودگی میں فراق کس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمان ہندوستان میں آئے ان کی علمی لسانی اور تاریخی تحقیق ملاحظہ ہو۔

"اب محمد بن قاسم کی فوج کے پاؤں جم جاتے ہیں تو مسلمان اتری ہند کی طرف بڑھتے ہیں اور راستے میں مہاراشٹرا اور گجرات ہوتے ہوئے اور اپنے قبضہ میں کرتے ہوئے پنجاب پہنچ جاتے ہیں" (ص ۷۷)

اس سے بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ محمد بن قاسم کس ملک میں آیا؟ کہاں اس کے پاؤں جم جاتے ہیں؟ کس زمانہ میں اس نے حملہ کیا؟ کس سنہ عیسوی یا ہجری میں وہ ہندوستان میں اپنے پاؤں جما لیتا ہے؟ کس مقام سے مسلمان اتری ہند کی طرف بڑھتے ہیں اور وہ ایسے کونسے انوکھے اور نئے راستے سے پنجاب جاتے ہیں کہ راستے میں مہاراشٹرا اور گجرات مل جاتے ہیں؟ فراق کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان سندھ سے پنجاب کی طرف بڑھے مگر جب مسلمان پنجاب کی طرف بڑھے تو راستے میں مہاراشٹرا اور گجرات کہاں سے مل گئے؟ فراق کو لسانی تحقیق تو درکنار ہندوستان کا ابتدائی جغرافیہ بھی نہیں معلوم مسلمان اور وہ مسلمان جو محمد بن قاسم کے ہمراہ سندھ میں داخل ہوئے ملتان ہوتے ہوئے پنجاب کی طرف گئے مگر کسی تاریخی واقعہ سے فراق یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ وہ مسلمان گجرات اور مہاراشٹر گئے ہوں یہ تاریخی غلط بیانیاں فراق کے علمی زعم کا نتیجہ ہیں۔ وہ پھر لکھتے ہیں۔

"پھر دلی پہنچ کر دوآبہ گنگ و جمن کی طرف مڑتے ہیں پھر صوبہ بہار اور اس کے بعد صوبہ بنگال

تک پھیل جاتے ہیں۔ آخری ہند پر چھا کر یہ گھٹا پھر دکن کی طرف مڑ جاتی ہے"۔ (ص ۱۷)

قربان جایئے فراق کی اس منطق کے جنہوں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ مسلمان جو ایکبار محمدؐ بن قاسم کے تحت میں سندھ کو اپنے قبضہ میں لا کر ہندوستان میں قیام پذیر ہوئے تو پھر وہی مسلمان سندھ سے جو بڑھے تو پہلے پنجاب پہنچے پھر وہی دہلی آئے اور پھر بہار، بنگال اور جنوبی ہندوستان کی طرف گئے۔ گویا محمدؐ بن قاسم کی فوج تھی جس نے ہندوستان کو فتح کیا اور بلا کسی روک ٹوک کے پنجاب سے بنگال تک اور پھر جنوبی ہندوستان پر حاوی ہو گئی۔ مورخین نے جو محمود غزنوی کے سترہ حملے اور محمدؐ غوری کے گیارہ حملے لکھے ہیں۔ ان میں اور مسلمانوں کی آمد شاید فراق کے نزدیک کوئی تعلق نہیں۔ پنجاب کا غزنی کی حکومت میں شامل ہونا اور قطب الدین ایبک کا حاکم پنجاب ہو کر فتوحات حاصل کرنا فراق کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ہندوستان میں شمال مغربی درہ سے شاید کوئی مسلمان نہیں آیا؟ بلکہ وہی مسلمان جنہوں نے سندھ کو فتح کیا انہوں نے ہی پنجاب پر قبضہ کیا اور پھر وہی پورے شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ خلجی، تغلق، پٹھان اور مغل خاندان کے بادشاہوں کا فراق کے نزدیک تاریخ میں کوئی تذکرہ نہ آنا چاہئے یہی وجہ ہے کہ وہ خلجی، تغلق اور مغل خاندان کی ان کوششوں کو جو سلطنت کو وسعت دینے کی خاطر تھیں کوئی وقعت نہیں دیتے بلکہ یہ سہرا وہ ان مسلمانوں کے سر باندھتے ہیں جو سندھ سے چلے اور بنگال جا کر رکے اور پھر وہاں سے پلٹ کر جنوبی ہندوستان میں دم لیا۔ کسی زبان کی تاریخ پیش کرنے میں غلط بیانیاں کرنا اس زبان کی تاریخ کو مسخ کرنے کی صریحاً کوشش ہے اور یہ فراق کے اس مضمون کا اصل مقصد ہے اپنے اس بیان کی تائید میں ایک اور نرالی مجوبہ اور انوکھی بات فراق کی زبانی سنئے۔

"یہ جاننے کے لئے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں پر اس کا کیا اثر پڑا اس بات کا جان لینا ضروری ہے کہ جو مسلم آبادی اس وقت ہندوستان میں نظر آتی تھی۔ اس میں اب صرف ایک یا دو فیصدی ایسے لوگ تھے جو عرب یا ایران سے آئے تھے باقی ہندوستان کے ہی وہ ہندو تھے جو اب مسلمان ہو گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جیسے جیسے اسلام یا اسلامی آبادی پھیلتی گئی بجائے عربی، افغانی، ترکی و فارسی کے ۹۹ فیصدی مسلمانوں کی زبانیں سندھی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی، ہندی اور بنگالی ہوتی گئیں"۔

فراق کا نظریہ غالباً یہ ہے کہ جو مسلمان محمدؐ بن قاسم کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے۔ ان کے بعد مسلمانوں کا سلسلہ عرب اور ایران سے بالکل منقطع ہو گیا اور اس کے بعد جو مسلمانوں کی تعداد ہندوستان میں بڑھی وہ ایسے ہندوؤں کی وجہ سے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ کیا فراق گورکھپوری کسی تاریخی کتاب سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کا سلسلۂ آمد و رفت محمدؐ بن قاسم کے فتح سندھ کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا؟ کیا فراق اس امر کی تاریخی شہادتیں پیش کریں گے کہ محمود غزنوی مسلمان نہیں تھا؟ اور اس کی افواج مسلمانوں سے بھری ہوئی نہیں تھیں؟ کیا محمدؐ غوری اور اس کے ہمراہی شمالی مغربی خطوں سے ہندوستان میں داخل نہیں ہوئے؟ کیا ان کا مذہب اسلام نہ تھا؟ کیا ان کے ہمراہی کچھ پنجاب میں نہیں رہ گئے؟ کیا محمد غوری نے قطب الدین ایبک کو پنجاب کا گورنر پنجاب کو غزنی کی حکومت میں شامل کرنے کے بعد مقرر نہیں کیا؟ کیا پنجاب جب غزنی کی حکومت کا ایک صوبہ بن گیا تو کوئی سد سکندری ایسی بنا دی گئی تھی۔ کہ مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا بند ہو گیا ہو؟ کیا خلجی اور تغلق خاندانوں کی حکومتوں کے بعد تیمور لنگ ہندوستان نہیں آیا؟ کیا اس کا مذہب

اسلام کے علاوہ کچھ اور تھا؟ کیا اس کے ہمراہی مسلمان نہ تھے؟ کیا بابر مسلمان نہیں تھا؟ اور کیا وہ ہندوستان میں غیر مسلم سپاہ لشکر آیا تھا؟ اور اس کے ہمراہی ہندوستان ہی میں اقامت گزیں نہ ہو گئے تھے؟ کیا بابر کی قائم کردہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے زمانے میں احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ درانی کے حملے ہندوستان پر نہیں ہوئے؟ کیا ان کے ہمراہ بھی ہندوستان میں مسلم فوج نہیں آئی؟ فراقؔ کس تاریخی شہادت پر یہ لکھنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اس وقت کی مسلم آبادی ایک یا دو فیصدی ایسی تھی۔ جو ہندوستان کے ہندو مسلمان تھے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سینکڑوں ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے اور وہ بھی اسلامی پرچم کے نیچے آگئے مگر یہ کہہ دینا کہ وہ سب پہلے ہندو تھے اور مسلمان مغرب سے ہندوستان آئے ہی نہیں سراسر جھوٹ اور بہتان ہے کیونکہ جب کبھی ترکستان، ایران یا افغانستان میں کوئی سیاسی انقلاب ہوتا یا کوئی تباہی کی صورت ہوتی تو وہاں کے ترکی ایرانی اور افغانی بولنے والے باشندے ہندوستان میں آکر پناہ لیتے۔ ہندوستان کے ہر مسلمان بادشاہ کے عہد میں غیر ملکوں سے آکر اپنی فارسی دانی کی وجہ سے ہندوستان کی اسلامی حکومتوں میں عمدہ اور بالاتر عہدوں پر فائز ہوتے۔ تلاشِ معاش کی فکر میں سینکڑوں باشندے قافلوں کی شکل میں وقتاً فوقتاً آتے اور دہلی کے امرا اور رؤسا کی سرپرستی حاصل کر کے اپنی گزر اوقات کرتے رہے۔

مسلمانوں کی زبانیں

اس اقتباس کے آخری حصے پر نظر ڈالئے تو کذب و افترا کا ایک اور ذخیرہ نظر آئے گا۔ فراقؔ لکھتے ہیں کہ "جیسے جیسے اسلام یا اسلامی آبادی پھیلتی گئی بجائے عربی، افغانی، ترکی و فارسی کے ۹۹ فیصدی مسلمانوں کی زبانیں سندھی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی، ہندی اور بنگالی ہوتی گئیں"۔ فراقؔ کے اس بیان میں ذرہ برابر بھی تاریخی صداقت موجود نہیں کیونکہ فراقؔ نے پہلے تو چند مسلمانوں کو محمد بن قاسم کے ہمراہ ہندوستان میں داخل کر کے ایران سے آنے کے راستے بند کر دیئے اور پھر مسلمانوں کو ہندوستان کی محدود زبانوں کو سیکھنے کے لئے مجبور کر دیا۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ ۹۹ فیصدی مسلمانوں کی زبانیں صوبجاتی زبانوں سے صرف متاثر ہی نہیں ہوئیں بلکہ مسلمانوں کو صوبجاتی زبانیں بولنا پڑیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ فراقؔ کا ہندی پرستی کا جذبہ اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ وہ حقیقت کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔

فراقؔ کو یہ معلوم ہے کہ مسلمان فاتح تھے مفتوح نہ تھے جو ان کی زبان ہندوستان کی ان دیسی زبانوں کا ایسا اثر قبول کر لیتیں کہ وہ خود فنا ہو جاتیں اور پھر مسلمان کی زبان پر ہر خطہ کی زبان یعنی سندھی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی یا بنگالی حاوی ہو جاتی۔ فراقؔ کو یہ بھی بخوبی معلوم ہے کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مسلمانوں نے حکومت کی اور مسلمان ایک عرصہ دراز تک فارسی و عربی کو اپنی مادری زبان تصور کرتے رہے۔ بول چال میں، شعر و شاعری میں، خط و کتابت میں اور تصنیف و تالیف میں سب میں فارسی زبان ہی ملحوظ رہتی تھی ۱۸۳۲ء تک فارسی عدالتی اور سرکاری زبان رہی۔ دیوانی اور فوجداری میں بھی فارسی ہی مروج تھی۔ کائستھوں نے بھی عدالتی زبان یعنی فارسی سیکھ کر مغل شہنشاہوں کے زمانے میں بلند مرتبے حاصل کئے۔ ہندوؤں کا اعلیٰ طبقہ تھے کی اردو بولتا اور اپنی زبان میں زیادہ سے زیادہ عربی کے الفاظ استعمال کرتا۔ مگر ادنیٰ طبقے کے لوگ اعلیٰ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ضائع لفظی و معنوی اور تشبیہات و استعارات پر توجہ نہ دے سکے۔ اکثر و بیشتر آج بھی (جسے فراقؔ شاید ہندی کہیں) عربی و فارسی کے الفاظ بولتے ہیں ملاحظہ ہو۔

مثلاً ساکن، نشان، تاریخ، مقدمہ، قلم، مدعا، مدعا علیہ، بیان، آسمان، زمین، خاک، منہ، ابر، آب

۱؎ از ہندی زبان ص ۱ - ۱۵ جون ۱۹۶۴ء

رومال۔ حجامت۔ مالش۔ تخت۔ کرسی۔ دسترخوان۔ دامن۔ عینک۔ چشمہ۔ تیر۔ کمان۔ ظالم۔ قاتل۔ قوم۔ خاندان۔ حال۔ دل۔ زخم۔ گوشت۔ کباب۔ بادشاہ۔ امیر۔ غریب۔ رعیت۔ زراعت۔ کاشت۔ خودکاشت۔ مویشی۔ حاکم۔ منصف۔ موعظ۔ اجلاس۔ نزول۔ صلہ۔ تماشا۔ باغ۔ باغیچہ۔ قسمت۔ زندگی۔ شور۔ شغل۔ آرام۔ شراب۔ خراب۔ مصیبت۔ پریشان۔ گلاب۔ غل۔ صاحب۔ بندہ۔ مہربان۔ غنیمت۔ شیشہ۔ شربت۔ شادی وغیرہ وغیرہ۔

فارسی کا تو یہ اثر تھا کہ ہندوستان کی تمام پراکرتیں اور زبانیں اس کے آگے ختم ہو گئیں۔ ہر خطہ اور ہر جگہ کی زبان پر حکومت کی زبان یعنی "فارسی" کا اثر پڑا۔ یہ تو مسلمانوں کے ہندوستان میں قیام کے بعد اثر پڑا ابتدائی دور کے چند کوی کے "پرتھوی راج راسا" میں بھی فارسی ہی غالب نظر آتی ہے۔ گجراتی زبان کا فارسی پر اثر کیا ہوتا بالخلق بادشاہوں کے عہد حکومت تک گجرات حکومت دہلی کا ایک صوبہ رہا۔ گجرات میں کوئی اور ایسی زبان نہ تھی جس کو خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جاتا۔ وہاں کے اہل قلم اور امراء و شرفاء کو مجبوراً فارسی سیکھنا پڑی۔ اور اسی میں ان کو لکھنا پڑا گجراتی اس کے زمانے تک خود کوئی ادبی زبان نہیں تھی۔ وہاں کے صوفیوں اور بزرگوں نے بھی فارسی ہی کو اپنے خیالات کے ادا کرنے کا ذریعہ قرار دیا۔ اسی طرح سندھی، پنجابی اور مراٹھی بھی فارسی سے متاثر ہوئیں فراق کا یہ دعویٰ قطعاً قابل قبول نہیں۔ ہمیں اس کا اعتراف ضرور ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے ایک زبان پیدا ہو رہی تھی مگر فارسی داں شاعر اور امراء اسے محض کاروباری ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے تھے۔

ان کی سیاسی ضرورتوں کے علاوہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ادبی و علمی فضا بھی فارسی زبان کے اثرات کے تحت میں تھی۔ ہندوستانی سانیات میں ڈاکٹر سید محی الدین یوں رقمطراز ہیں:۔

"علمی و ادبی فضا میں ہر وقت ایرانی اثر غالب رہتا تھا۔ شاہی درباروں سے محمد شاہ کے زمانے تک بالعموم ٹھیٹ ایرانی شاعر اور عالم گراں بہا صلے حاصل کرتے رہتے تھے۔ پردیسی شعراء کی قدر و منزلت میر و سودا کے زمانے تک جاری تھی فارسی گو اور عالموں کی اس آئے دن کی درآمد اور اقتدار و اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال میں فارسی دانی عام اور لازمی ہو گئی تھی۔ اگر کبھی مہلت پاکر فارسیت کا پیدا کیا ہوا زخم مندمل بھی ہونے پاتا تو پھر فارسی زبان بولنے والوں کا ایک ایسا حملہ ہوتا کہ وہ زخم از سر نو ہرا ہو جاتا۔" (ص ۹۵)

سمجھ میں نہیں آتا کہ فراق نے کہاں سے یہ علم فراہم کیا کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں جبکہ مسلمان فارسی کو اپنی مادری زبان تصور کرتے تھے۔ حکومت کی زبان فارسی تھی۔ امراء اور شرفاء فارسی ہی بولتے تھے۔ ہندوؤں کو فارسی سیکھنا لازمی ہو گیا تھا۔ غیر ملکی فارسی بولتے آتے اور فارسی ہی کی بدولت ان کو اونچے عہدے دیئے جاتے۔ فارسی اس ماحول کے باوجود اپنی انفرادیت کھو بیٹھی اور ہندوستان کی دیسی زبانوں کے اثرات قبول کر کے ان میں مدغم ہو گئی۔ فراق نے خود اعتراف یوں عربی زبان سے کیا ہے۔

"وہاں مذہب و حکومت کا یہ اثر ہندوستان کی زبانوں پر ضرور ہوا کہ ہر زبان کی لغت میں بہت سے فارسی عربی اور کچھ ترکی یا دیگر الفاظ کا اضافہ ہو گیا۔ سندھی کا رسم الخط بھی عربی یا عربی نما ہو گیا اور سندھی زبان میں بہت کثرت سے عربی و فارسی الفاظ شامل ہو کر جزو زبان بن گئے۔ گجراتی اور مراٹھی میں اس کثرت سے تو نہیں لیکن پھر بھی بہت بڑی تعداد میں عربی اور فارسی الفاظ اس طرح شامل ہو گئے کہ وہاں کے ہندو

مسلمانوں کو عام طور سے اب اس کی پہچان تک نہیں رہی۔"

فراقؔ کے الفاظ کا گورکھ دھندا بنا کر فریب دینے میں ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ اس اقتباس کی ابتدا " ہاں مذہب و حکومت کا یہ اثر" جیسے الفاظ سے کرتے ہیں۔ یہ مذہب و حکومت کا اثر نہیں تھا۔ اگر مذہب یعنی اسلام کا اثر ہندوستان کی دیسی یا کسانی زبانوں پر پڑتا تو ان کا رسم الخط بھی تبدیل ہو کر سندھی کی طرح عربی ہو گیا ہوتا۔ فراقؔ کو ان کی جگہ "عربی و فارسی کا یہ اثر" تحریر کرنا چاہئے تھا۔ گجراتی پر فارسی کے جو اثرات ہوئے گذشتہ صفحات پر بیان کئے جا چکے ہیں۔ سندھی کی کیفیت خود فراقؔ نے لکھ دی مراٹھی زبان پر بھی فارسی کے اثرات مرتب ہوئے۔ بنگالی زبان پر بھی فارسی نے اثر ڈالا۔ عربی اور فارسی کے سیکڑوں الفاظ حکومت کی زبان ہونے کی وجہ سے بنگالی میں شامل ہو گئے۔ فراقؔ نے اس پورے مضمون میں الٹی گنگا بہائی ہے۔ آگے چل کر وہ یوں رقمطراز ہیں:۔

"اب رہی ہندی زبان جو آدھے ہندوستان بلکہ اس سے بھی زیادہ حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دیوناگری رسم الخط قائم رہا۔ لیکن اس کی لُغت میں ہزاروں فارسی اور عربی الفاظ شامل ہو گئے۔" (ص ۷۷)

فراقؔ نے صرف ایک مقام پر ہی نہیں بلکہ متعدد جگہوں پر لفظ "ہندی" کا استعمال کیا ہے۔ فراقؔ اس لفظ کا استعمال موجودہ "ہندی" کے معنی میں کرتے ہیں۔ یہ ایسا کھلا ہوا جھوٹ ہے کہ وہ آدھے ہندوستان بلکہ اس سے بھی زیادہ حصے میں "ہندی" بتاتے ہیں۔

جس زمانے کا فراقؔ ذکر کر رہے ہیں اس عہد میں ہندی کا کہیں وجود ہی نہیں تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوؤں کے یہاں لفظ "ہند" یا ہند کے رہنے والوں کی زبان "ہندی" نہ تو موجود تھی اور نہ مستعمل۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے یہاں کی زبان کو ہندی کہا۔ اہل عرب ہندوستان والوں "ہندی" اور ان کی زبان کو بھی "ہندی" کہتے تھے۔ اس کی زندہ مثال آج بھی موجود ہے۔ "املی" کو وہ "تمر ہندی" کہتے ہیں۔ "ہندی" نہ تو ہندوستان کی کوئی زبان تھی اور نہ کوئی پراکرت۔ "ہندو" جس پراکرت سے بیجا فائدہ اٹھاتے ہیں وہ "کھڑی بولی" ہے۔ دراصل وہ پراکرت یا ذیلی زبان تھی۔ جو دسطی گروہوں کی زبانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اور جس کے رسم الخط کی بنا پر "جدید ہندی" کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ یہ "جدید ہندی" دراصل اس "ہندوستانی" کی شاخ ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اور جس کو اردوئے معلیٰ کا خطاب عہد شاہجہانی میں دیا گیا تھا۔ ہندی کی ابتدا کرنے والا ڈاکٹر جان گلکرائسٹ تھا۔ جس نے اپنی "تقسیم اور حکومت" کی حکمت عملی کو پروان چڑھانے کے لئے للّو لال جی اور سدل مصرا کو اس دور اندیشی کا شکار بنایا اور ان انگریزوں کے اندھوں اور گانٹھ کے پوروں کو اتنی خبر نہ ہوئی کہ وہ ہندوستان کو دو حصوں میں منقسم کر رہا ہے۔ یعنی ایک گروہ وہ جو اُردو کا حامی ہوگا۔ اور دوسرا وہ جو سنسکرت آمیز اردو یعنی جدید ہندی کو برا ہے گا۔ اس طرح اردو ہندی کا قضیہ ان کے نفاق اور جھگڑوں کا باعث ہوگا۔ جو صرف ادبی نہیں رہے گا بلکہ آئندہ چل کر سیاسی سوال بن جائیگا۔ فراقؔ کی سمجھ بھی اس سلسلہ میں کچھ مغالطہ سی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بھی ہندی داں طبقہ کی ہمنوائی کرکے اردو داں طبقہ سے منوانا چاہتے ہیں کہ ہندی اُردو سے زیادہ قدیم ہے اور ہم کو یقین ہے وہ ہندی کا ہے میں فراقؔ کو چیلنج کرتا ہوں کھڑی بولی کو چھوڑ کر یہ بتائیں کہ ہندی کہاں تھی۔ کھڑی بولی کا وجود ضرور تھا مگر وہ بھی سلطنت مغلیہ کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ جو حقائق سامنے ہیں ڈاکٹر محی الدین یوں رقمطراز ہیں۔

"جہاں دو آبہ کے ہندوؤں نے ایک طرف مسلمانوں کی لائی ہوئی زبان کو بالکل اپنا لیا تھا۔ دوسری

سلہ مضمون فرسٹ ولیم کالج اور اُردو ادب مصنف سید ادریس احمد ادیب۔ مطبوعہ "ایوان" دسمبر ۱۹۵۸ء۔

طرف اپنی ادبی زبان برج بھاشا کو ترک کر کے فارسی میں تصنیف و تالیف شروع کی۔ چنانچہ ان کی اس فارسی تحصیل نے ان کی روزمرہ کی زبان کو بہت متاثر کیا۔" (ص ۹۴)

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ کوئی پراکرت از قسم ہندی ہندوستان میں رائج نہ تھی۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوؤں نے برج بھاشا کو ادبی زبان بنایا اور فارسی کے اثرات کی وجہ سے وہ بھی مردہ ہو گئی۔ پھر فراق کہاں سے ہندی نکال لائے؟ "ہندی کی عمارت برج بھاشا پر تعمیر کی گئی ہو۔" یہ دوسری بات ہے مگر یہ کہہ دینا کہ برج بھاشا ہی ہندی ہے غلط ہے اور کسی طرح قابل قبول نہیں۔ لفظ "ہندی" جن معنی میں استعمال کیا گیا وہ حسب ذیل ہیں ان کو پروفیسر Keay کی تاریخ ہندی اور گریرسن کے Linguistic Survey سے حاصل کیا گیا ہے۔

(۱) "ہندی" ـــــ ہندوستان کی وہ زبان جو عوام یعنی ہندی (ہند کے رہنے والے) بولتے تھے۔ ہندوستان کی زبان ہندی اسی نظریہ کے مطابق ہوئی جس کے حساب سے فرانس کی زبان فرانسیسی کہلائی۔

(۲) ہندی ـــــ لفظ ہندی ہندوستان کی ہر زبان کے لئے استعمال ہوا اور ہو سکتا ہے۔

(۳) ہندی ـــــ جنوبی ہندوستان کی زبان کے برخلاف شمالی ہندوستان کے باشندوں کی زبان۔ کیونکہ جنوبی ہندوستان والے شمالی ہندوستان کو "ہند یا ہندوستان" کہتے ہیں۔

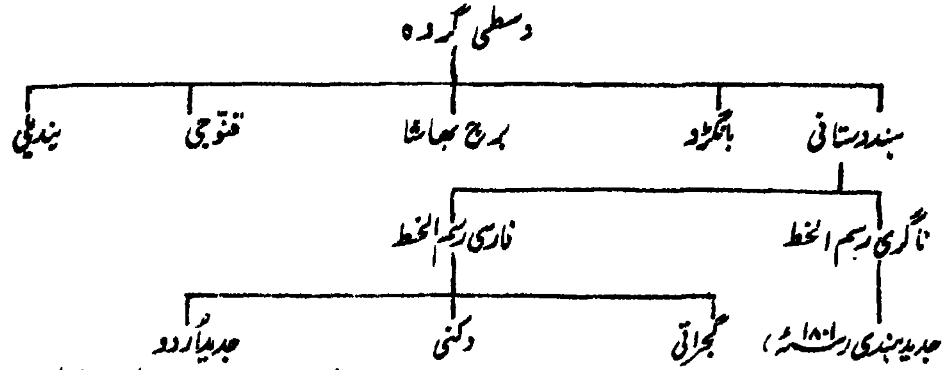
(۴) ہندی ـــــ پروفیسر کے۔ ای کے خیال کے مطابق "راجستھانی" زبان کو ہندی کہنا درست ہے مگر پروفیسر گریرسن کے نظریہ سے شمالی ہندوستان کی تمام آریائی اور غیر آریائی پراکرتیں "ہندی" میں شامل ہیں۔ اس کا خیال تو یہاں تک ہے کہ ہر دیہات کی پراکرت کو "ہندی" کہا جا سکتا ہے۔

اس لسانی تحقیق اور تجزیہ کے بعد فراق یہ بتائیں وہ اُس عہد میں "ہندی" کہاں سے لے آئے؟ اور وہ ہندوستان[1] کے کونسے آدھے حصّے سے زیادہ میں پھیلی ہوئی تھی اور وہ کونسے ہندو تھے جو فارسی اور "کھڑی بولی" کے بجائے موجودہ ہندی بولتے تھے؟ میرے نزدیک ہندی کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس کا وجود جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں سرجان گلکرائسٹ کی سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ ہندی کی ابتدا ۱۸۰۰ء سے ہوتی ہے اس سے پہلے موجودہ ہندی کسی شکل میں بھی ہندوستان میں موجود نہ تھی۔ تمام ہندو اردو یا ہندوستانی بولتے تھے۔ گریرسن نے جب پہلی بار اپنا Linguistic Survey لکھا تو اس میں مشرقی و مغربی ہندی کا استعمال کیا۔ اس نے دیکھا کہ "ناگری" رسم الخط میں برج بھاشا لکھی جاتی تھی تو اس نے اس کو ہندی کہنا شروع کر دیا کیونکہ اپنے نظریہ کے مطابق وہ ہر پراکرت کو ہندی کہہ سکتا تھا اس وجہ سے اس نے جو زبانوں کی تقسیم کی تو مگدھی زبان کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ایک تو مگدھی رہی اور دوسری اردھ مگدھی۔

اردھ مگدھی سے مراد اس نے مشرقی ہندی لی ہے یا اس کو یوں کہہ لیجئے کہ مشرقی ہندی اردھ مگدھی سے پیدا ہوئی مگر اس مشرقی ہندی کی دیوار اس نے "اودھی" "باگھیلی" اور "چھتیس گڈھی" پراکرتوں پر استوار کی ہے۔ اس نے کہیں بھی اس کی بنیادیں برج بھاشا یا کھڑی بولی پر قائم نہیں کیں۔ اس لئے موجودہ ہندی کا برج بھاشا یا کھڑی بولی سے کوئی تعلق نہیں صرف رسم الخط "ناگری" ہے۔ اس رسم الخط کی بنا پر "ہندو" اپنی ڈفلی پہ یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ "برج کے خطے سے ہندی کا تعلق ہے۔" وسطی گروہ کی جو زبانیں ہیں ان کی صورت یہ ہے۔

---

[1] اس وقت ہندوستان لفظ ہی نہیں رائج تھا۔



دراصل ہندی کا تعلق ہندوستانی سے ہے یہ وہ اُردو ہے جس کو انگریزوں نے ہندوستانی کہا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا نے اس کو یوں واضح کیا ہے۔

"The name Hindustani is given by European to the Indo Aryan dialect Whose home is in the upper gangetic Doab near the city of Delhi, Which owing to the political causes has become the Lingua Franca of Modern India. The name is not employed by Indian, except as an imitation of the English nomenclature."

اس مخلوط زبان کی حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد جو لشکر کی زبان تھی، جو اُردو کی زبان تھی اور جو اردوئے معلیٰ کہلاتی تھی اور اس ہندوستانی سے ہندی کی بنیاد ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کی چہار دیواری میں ڈالی۔ گریرسن کی مغربی ہندی کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔ اس نے وسطی ہند آریائی زبان کا نام "مغربی ہندی" رکھا۔ جس کا خاکہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ اس مغربی ہندی سے موجودہ ہندی کا کوئی تعلق نہیں۔ ہندی داں گریرسن کی اس لسانی تقسیم پر خوب بغلیں بجاتے ہیں۔ اس نے لفظ ہندی کا استعمال بالکل بے معنی اور مبہم طریقہ پر کیا ہے۔ اس سے اس کا مقصد موجودہ سنسکرت آمیز ہندی نہیں بلکہ ایک گروہ کی پراکرت ہے۔ اس نے لسانی تقسیم کو آسان بنانے کے لئے لفظ ہندی کو Vague طریقہ پر استعمال کیا اور یہ تقسیم بھی Vague ہی ہے۔ موجودہ ہندی کے علمبردار جو فورٹ ولیم کالج میں جدید ہندی کی بنیادیں ڈال رہے تھے۔ ناگری رسم الخط لے بیٹھے۔ یہ دنیا بڑی غلطی ہے اور اپنے آپ کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے کہ مشرقی اور مغربی ہندی دونوں کا رسم الخط ناگری تھا اس وجہ سے جدید ہندی کا رسم الخط بھی ناگری ہو گیا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ گریرسن کی اس بے معنی لسانی تقسیم سے قبل مغربی اور مشرقی ہندی کا وجود بھی نہیں ملتا۔ یہ اس مورخ کی شرارت تھی جو اس تقسیم اور حکومت کی حکمت اور دور اندیشی پر مبنی تھی۔ نہ ہندی ہندوستان میں ۱۸۰۰ء سے کبھی پہلے بولی جاتی تھی اور نہ اس کا وجود تھا۔ برج بھاشا یا مخلوط زبان جس کو اردو کہا جاتا ہے وہ موجود تھی۔ اس سے ہندی نکلی۔ فراق اپنی لسانی بے بضاعتی کا ثبوت ایک اور مقام پر یوں دیتے ہیں:-

"اگرچہ براعظم ہند میں ایک ہزار سے زیادہ بولیاں ہیں اور لگ بھگ دو درجن ایسی مستند زبانیں ہیں جن کا ادب موجود ہے لیکن آدھے سے زیادہ ہندوستان کی زبان ہندی ہے۔ یہ ہندی زبان

مسلمانوں کے آنے سے پہلے بھی ہندوستان بھر میں کم و بیش سمجھی اور ٹوٹی پھوٹی شکل میں بولی بھی جاتی تھی ۔ کیوں ؟ اس لئے کہ ہندوؤں کی تمام مذہبی اور تہذیبی و تمدنی روایتوں کا گہوارہ گنگا کا دوآبہ رہا ہے ۔ ہندوؤں کی تمام تیرتھ گاہیں شمالی ہند میں ہیں اور جو جنوبی ہند میں ہیں وہ بھی رام اور کرشن سے متعلق ہیں ۔ ہندوؤں میں نہان و اشنان کے تہوار وہی اہمیت رکھتے ہیں جو مسلمانوں میں حج کعبہ کو حاصل ہے ۔ ہزارہا برس سے ہر سال پریاگ کے سنگم پر، ہردوار میں اور بنارس میں، گیا میں اور جگناتھ پوری میں نہان کے میلے ہوتے ہیں ۔ جودھیا میں بھی اشنان کا میلہ ہوتا ہے اور متھرا بندرابن کی زیارت بھی ملک بھر کے ہندو کرتے ہیں ۔ پرانے زمانے میں شمالی ہند کے ان مقامات کا سفر کروڑوں ہندو ہر سال کرتے تھے اور اس جاترا میں سال دو سال لگ جاتے تھے ۔ یعنی مدارسی گجراتی، مراہٹی، بنگالی، کروڑوں ہندوؤں کو شمالی ہند کی لمبی سیاحت کا موقعہ ملتا تھا اسی طرح ہندی زبان یا شمالی ہند کی زبان مسلمانوں کے آنے سے پہلے قومی یا ملکی زبان یا مشترکہ زبان کی حیثیت حاصل کر چکی تھی مذہب اس کا محرک اور سبب تھا ۔" (ص ۷۲)

فراق قیاس آرائی سے اپنا مضمون آراستہ کرتے ہوئے یہ تحریر کرتے ہیں کہ براعظم ہند میں ایک ہزار سے زیادہ بولیاں ہیں مگر گریرسن نے اپنے Linguistic Survey میں تحریر کیا ہے ۔ کہ ہندوستان میں تقریباً دو سو بیس ۲۲۰ زبانیں اور بولیاں مروج ہیں ۔ کیا فراق ان ایک ہزار بولیوں کی تفصیل پیش کر سکتے ہیں ؟ فراق قدیم زمانے کی تاریخ بیان کرتے کرتے موجودہ ہندی کی وسعت بیان کرنے لگتے ہیں ۔ ان کے نزدیک موجودہ ہندوستان میں آدھے سے زیادہ لوگ ہندی بولتے ہیں ۔ ذیل کی تحقیق بتائے گی کہ فراق کی ہندی آج کل کہاں کہاں بولی جاتی ہے ۔

نام مقام	زبان	نام مقام	زبان
اجمیر میرواڑہ	اردو	بہار	اردو
دہلی	اردو	سرحد	اردو
ممالک متحدہ	اردو	سی ۔ پی	اردو
پنجاب	اردو	بمبئی	مرہٹی ۔ گجراتی
کرالا	ملیالم	بنگال	بنگالی
آندھیر	تلنگو	گجرات	گجراتی
آسام	آسامی	برار	مرہٹی
ناگپور	مرہٹی	سندھ	سندھی
مہاراشٹری	مرہٹی	وغیرہ	وغیرہ

شاید فراق نے ہندی کے پھیلاؤ کو پیش کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندی آدھے

سے زیادہ ہندوستان کی زبان ہے مگر ان کے اس بیان کی تکذیب "گارساں دی تاسی" یوں کرتا ہے۔

"اُردو زبان نے سارے ہندوستان میں وہی مرتبہ حاصل کر لیا ہے جو فرانسیسی زبان نے یورپ میں۔ یہی وہ زبان ہے جو سب سے زیادہ استعمال میں آتی ہے۔ عدالتوں اور سہروں میں اس سے کام لیتے ہیں۔ ادبی لوگ اس میں کتابیں لکھتے ہیں۔ اور شاعر اسی زبان میں شعر کہتے ہیں اور یورپین کے ساتھ بات چیت میں بھی یہی استعمال ہوتی ہے"

فراق ہندی پرستی کے جذبہ میں وہ راگ الاپتے ہیں کہ ہندی ہندوستان کے اکثر سے زیادہ حصہ میں بولی جاتی تھی۔ سیدان کے نزدیک قدیم مغربی اور مشرقی ہندی اور جدید ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ انہیں ان میں لسانی فرق نظر نہیں آتا۔ اول تو وہ تقسیم غلط اور ناکارہ ہے مگر وہ ہر جگہ یہی رٹ لگاتے ہیں کہ ہندوستان کی کثیر آبادی "ہندی" بولتی ہے۔ یہ کثیر آبادی قدیم مغربی یا مشرقی ہندی بولتی ہے یا موجودہ وہ سنسکرت آمیز ہندی؟ کیا جو زبان روزمرہ خود فراق گورکھپوری بولتے ہیں اور ان کے ہندو بھائی جو الفاظ اپنی بول چال میں لاتے ہیں وہ سب ہندی ہیں؟ اگر ہندی نہیں تو کونسی؟ جدید یا قدیم قدیم ہندی کا کہیں وجود نہیں پراکرتوں کا ایک گروہ ضرور ملتا ہے اگر وہ لوگ قدیم ہندی بولتے ہیں تو ان کو یہ بتانا واجب ہے کہ وہ کون کون سی پراکرتیں ہیں؟ پھر یہ غور کرنا ضرور ہے کہ کیا واقعی وہ پراکرتیں ہندی ہیں؟...... .... یا ان کا ہندی سے کوئی دور کا لگاؤ بھی ہے؟ اگر وہ جدید ہندی بولتے ہیں تو کیا ہندوستان کے دیہاتوں کے کسان سنسکرت داں ہیں؟ خود تعلیم یافتہ ہندو سنسکرت داں نہیں ہیں۔ وہ اس ہندی کے جو سنسکرت کو اپنا ماخذ قرار دیتی ہے۔ سینکڑوں الفاظ نہ سمجھتے ہیں اور نہ بولتے ہیں۔ فراق نہ معلوم کس جھونک میں قدیم ہندی (جو دراصل ہندی نہیں بلکہ لسانی تقسیم کے لئے گریرسن نے مشرقی اور مغربی ہندی میں تقسیم کر دیا) اور جدید ہندی کو ایک کرتے ہیں۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل بھی اس کا وجود بتلاتے ہیں۔ فراق کو یہ بتایا جا چکا ہے کہ لفظ "ہند" مسلمانوں نے استعمال کیا اور مسلمانوں نے یہاں کی زبان کے لئے لفظ "ہندی" (بمعنی ہند کی زبان کے) استعمال کیا۔ فراق کے پاس کیا کوئی لسانی ثبوت ہے جس کی بنا پر وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندی ہندوستان میں رائج تھی جبکہ ان کے پاس نہ لفظ ہندوستان تھا اور نہ ہندی۔ ہاں کھڑی بولی یا پراکرت ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ جس وقت مسلمان ہندوستان میں حملہ آور ہوئے اس وقت ہندوستان حسب ذیل زبانوں میں منقسم تھا۔



یہ تھی ہندوستان کی لسانی تقسیم جس وقت مسلمان ہندوستان میں آئے۔ ان زبانوں میں کہیں بھی ہندی کا تذکرہ نہیں ہے اور نہ کھڑی بولی کا پتہ ہے مگر ان صوبوں میں جہاں یہ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ بہت سی پراکرتیں بھی رائج تھیں ان کی تفصیل بھی ملاحظہ ہو۔

(۱) سندھی ـــ اس زبان کے حلقہ میں وچولی، سرولی، لاڑی، تھرلی، اور کچھی پراکرتیں رائج تھیں۔ اس کا رسم الخط فارسی اور عربی سے مشابہت رکھتا ہے۔ بعض مصنفین کا خیال ہے کہ وہ فارسی اور عربی رسم الخط سے اخذ کیا گیا ہے۔

(۲) سورسینی ـــ یہ زبانوں کا ایک بہت بڑا خاندان ہے اس کے تحت میں مشرقی پنجابی بھی آ جاتی ہے مگر اس خطہ کی لسانی تقسیم مکمل نہیں ہو سکتی اگر اس کو مشرقی اور مغربی پنجابی میں تقسیم نہ کیا جائے۔ مغربی پنجابی میں ہندکو، جنگی، ملتانی پوٹھواری وغیرہ شامل ہیں مشرقی پنجابی میں وہ تمام پراکرتیں شامل ہیں۔ جو بہار سے سندر تک اور لاہور سے مالوہ تک بولی جاتی ہیں برج بھاشا اور کھڑی بولی اسی خاندان کی پراکرتیں ہیں۔

(۳) راجستھانی ـــ اس میں ڈھنگلا، مالوی، میواتی، گوجری، جے پوری اور پاڑلی وغیرہ شامل ہیں۔

(۴) مگدھی ـــ اودھی، باگھیلی، چھتیس گڑھی، آسامی، بنگالی، اوڑیہ، بھوجپوری، ستھلی، تمی وغیرہ اس میں شامل ہیں۔

(۵) مہاراشٹری ـــ پونہ مرہٹی، کونکنی، ناگپوری، برارڑی، کنٹری اور بھیلی۔

(۶) غیر آریائی زبانیں ـــ تامل، ملیالم، گونڈی، کولامی، کیکیڑی، براہنڈی، جیسی، کسرولا اور ۔کی، پردکلی، کوردمبا کومٹاؤ، سالیواری اور گومری وغیرہ ہیں۔

مذکورہ بالا پر غور کرنے کے بعد یہ کہیں بھی پتہ نہیں چلتا کہ ہندی کا وجود ہندوستان میں کہیں تھا بھی یا نہیں؟ وہ کونسی ہندی تھی جو ٹوٹی پھوٹی شکل میں ہندوستان میں موجود تھی؟ فراق یہ بتائیں کہ وہ کونسے ہندو تھے جو جاترا کرنے شمالی ہندوستان ہندی بولتے ہوئے آتے تھے؟ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ شمالی ہندوستان آریوں کی تہذیب و تمدن کا گہوارہ مسلمانوں کی آمد سے قبل رہا۔ مگر وہ جاتری جو اس گہوارہ میں آکر قیام کرتے اور بنگالی، مدراسی، گجراتی، مرہٹی ہوتے ہوئے اپنی اپنی مادری پراکرت چھوڑ کر گریرسن کی لسانی تحقیق Linguistic [illegible] کی تقسیم مغربی و مشرقی ہندی کے مطابق صدہا برس قبل، ہندی بولتے آتے۔ غالباً ان کو یہ احساس ہوگا۔ کہ انہیں ہندی زبان بولنا چاہیئے۔ (جس کی تشکیل بھی اس وقت نہ ہوئی تھی) کیونکہ انہیں اس کو ہندوستان کی قومی زبان بنانا ہے؟ شاید کوئی ایسی الہامی کتاب یا صحیفہ فراق کو حاصل ہوا ہو جس میں "ہندی" زبان کی اشاعت اور تحریک کا سبب "مذہب" بن گیا ہو۔ فراق کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ "ہندی" کے وجود کا سبب نہ تو ان کا مذہب تھا اور نہ ان کے وہ جاتری جو بنگال، گجرات، مارواڑ اور مدراس جیسے دور دراز مقامات سے سفر کر کے آتے اور چلتے وقت اپنی زبانیں یعنی بنگالی، گجراتی، مارواڑی اور مدراسی اپنے ہی صوبوں میں ترک کر کے رکھ دیتے اور ہندی بولنے لگتے۔ فراق کے تخیل کی یہ بے بنیاد پیداوار کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی وہ دنیا کو اندھا سمجھتے ہیں۔ اور ہندی نوازی میں ہندی کی فضیلت اور برتری بے ڈھنگے طریقہ پر اور بلا کسی دلیل کے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اگر فراق یہ کہتے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان میں اردو کی داغ بیل پڑ چکی تھی تو یہ بات کسی قدر قابل قبول ہی ہوتی کہ ایک خطے کے لوگ اپنی مذہبی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے دوسرے خطے کے لوگوں سے ملتے جلتے، ہر ایک اپنے خطے کی زبان بولتا اور ایک دوسرے کی زبان سیکھنے کی کوشش کرتا۔ بول چال اور گھڑی گھڑی کی ضرورتوں کی وجہ سے ایک زبان تشکیل پاتی جو مسافروں اور لشکریوں کی زبان ہونے کی حیثیت سے اردو ہوتی۔ اسی مضمون میں فراق "اردو"

سلہ اردو زبان کی نئی تحقیق کا مسئلہ ہے جس میں سنسکرت کو ہندوستان کی اد[illegible] اور تہذیب [illegible] اور یہ کہا گیا ہے کہ دیو ہندوستان کی اولین اردو [illegible]

کے نام کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

اردو کی لفظی تحقیق

"اردو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ ڈیڑھ سو برس پہلے تک ہندوستان کی کسی زبان کا نام اردو نہیں تھا۔ مغل لشکر کا نام البتہ اردو تھا، معنی تھا لشکر اور لشکر کے بازار کے لئے اردو لفظ استعمال ہوتا تھا۔ بعد کو لشکر اور لشکر کے بازار کی مخلوط بولی یا زبان کا نام اردو پڑنے لگا۔ یہ بولی تھی تو دلی کے اطراف کی ہندی جسے پچھائیں ہندی یا کھڑی بولی کہتے ہیں اور اس بولی میں غیر ہندی یعنی فارسی عربی الفاظ جو شامل ہوئے ان سے مل کر اردو زبان بنی لیکن یہ فارسی عربی آمیز ہندی بولی محض بازاری اور کاروباری بول چال تک محدود تھی۔ یہ بولی لکھی نہیں جاتی تھی اگر لکھی جاتی تو اسے مسلمان فارسی حروف میں لکھتے اور ہندوؤں کی اکثریت ناگری حروف میں لکھتی تھی۔" (ص ۴۳، ۴۲)

فراق گورکھپوری کی نظروں میں شاید اگر کوئی محقق ہے تو فراق۔ اگر کوئی شاعر ہے تو فراق اور اگر کوئی نقاد ہے تو فراق۔ وہ کسی نئی تحقیق کو پڑھنے، سوچنے اور پرکھنے کے عادی نہیں۔ ترقی پسند ہو کر پرانی لکیر کو پیٹنا فراق کی رجعت پسندی کا ثبوت دیتا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں مضمون لکھتے ہوئے فراق وہی آموختہ دہرا رہے ہیں کہ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے اور اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے کسی زبان کا نام اردو نہیں تھا۔ ۱۹۲۵ء میں سے اگر ڈیڑھ سو برس کم کر دیئے جائیں۔ تو ۱۸۱۵ء حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ شمالی ہندوستان میں اردو کا اولیں دور ختم ہو جاتا ہے۔ شاہ مبارک آبرو، خان آرزو، شاہ حاتم، میاں مضمون، مظہر جانجاناں جیسے بلند پایہ شاعر ہندوستان میں گزر چکے تھے۔ تعجب کی بات ہے کہ فراق اس قدر کوتاہ بین ہیں کہ وہ "اردو" کے رائج ہونے اور اس کا ادبی سرمایہ ختم ہونے کے باوجود یہ کہتے ہیں کہ اس عہد میں ہندوستان کی کسی زبان کا نام "اردو" نہیں تھا۔ فراق اپنی غلطی پر نادم ہوں اور اب اردو کی پیدائش پر غور کریں۔

دراصل اردو لاطینی زبان کے ایک لفظ "Horde" سے نکلا ہے۔ جس کے معنی "خانہ بدوش" کے ہیں۔ یہ لفظ "اردو" یعنی اجتماع، گروہ اور لشکر کے معنی میں استعمال ہوا اور پھر ترکی زبان میں پہنچا۔ وہاں سے اردو زبان میں آیا اس کی تحقیق اور صحیح تحقیق حکیم شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" میں ۱۹۲۵ء میں یوں پیش کی تھی کہ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے مگر اس کا ماخذ کچھ اور ہے۔

"میر علاؤ الدین جوینی کی تاریخ جہاں کشا اور وزیر رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے زمانے میں مغل بادشاہوں اور بادشاہزادوں کے فرودگاہوں اور لشکر گاہوں کو "اردو" کہا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا مستقر حکومت بھی اردو کہلاتا تھا۔ اور قراقرم کا قدیم نام "اردو بالیغ" تھا۔

چنگیز خاں کے فرزند جوجی خاں کی اولاد نے دشت قبچاق اور روس و بلغار میں ایک وسیع حکومت قائم کر لی تھی۔ اس کے حکمران جب کسی مہم پر مستقر سے روانہ ہوتے تو زریں خیموں میں قیام کرتے تھے۔ جن کے باعث ان کی لشکر گاہیں اردوئے طلائی (Golden Horde) کہلاتی تھیں۔ خود انہیں اردوئے طلائی کے لقب سے شہرت ہو گئی تھی۔

خروج چنگیز خاں کے بعد سلطان شمس الدین التمش کے زمانے سے سلطان محمد بن تغلق کے عہدِ حکومت تک مغلوں نے ہندوستان پر کئی بار حملے کئے اور کم و بیش سو سال تک ہندوستان کا شمالی خطہ ان کی تاخت و تاز کا جولانگاہ بنا رہا۔ اسی زمانے سے ہندوستان میں لفظ اردو کا استعمال شروع ہوا اور یہاں بھی لشکرگاہ کو اردو کہنے لگے "۔ (ص ۸۱)

حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے بھی تحریر کیا ہے کہ لفظ اردو کا ماخذ Horde ہے اور یہی پروفیسر حامد اللہ افسر کا بھی نظریہ ہے شمس الدین عفیف کی تاریخ فیروز شاہی میں بھی لشکر فیروز شاہی کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ بابر نے اپنے لشکرگاہ کو "اردوئے لفرت شعار" کہا۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد کے مورخ بھی لفظ "اردو" شاہی لشکر اور شاہی فرودگاہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اب فراق گورکھپوری دیکھیں کہ کس طرح بابر، اکبر اور جہانگیر کو اُردو سے تعلق ہے۔ بابر جس وقت ہندوستان میں آیا تو اس نے ہندوستان کے لشکر کی زبان یعنی اردو میں شعر کہا ؎

مجکا نہ ہوس کچھ مانک و موتی — فقرا ہلیغہ بس بولغوسید در پانی در روتی

بابر اس شعر میں ہندوستانی تخیل پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے یاقوت اور موتی درکار نہیں۔ میں مست فقیر ہوں۔ میں ایک روٹی کا ٹکڑا اور ایک آبخورہ پانی چاہتا ہوں۔ ہمایوں پریشان حال رہا۔ اکبر ابو الفضل کے قتل کے بعد جہانگیر سے ناراض تھا اور جہانگیر اکبر کو راضی کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اکبر کے سامنے آئے اس وجہ سے اس نے نیک ساعت کی غرض سے اپنی عرضی بھیجی۔ اس پر اکبر نے ذیل کی رباعی لکھی جو عہد حاضر کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت — تو جبھی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت

ساعت کا بہانہ نہیں خوش بر ساعت — ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت

جہانگیر کے عہد کی اُردو ملاحظہ ہو۔ شاہجہاں کی پیدائش پر جشن ہوا اس وقت حق کی طلبی یوں ہوتی ہے ؎

لاجی کا نال نہ چھوائے — ملنگے ہے جو دھاجی کا راج

وہ بھی نہ لیوے یہ دائے — تھال بھر موتی جو دھا رانی لائی

فراق گورکھپوری اس اردو کو دیکھیں جس کے متعلق ان کا یہ خیال ہے کہ وہ مخلوط بولی کی شکل میں تھی۔ مہر النساء مرزا غیاث کی بیٹی، جہانگیر کے حرم سرا کی ملکہ بنی، شاہی کر رہی تھی۔ اس کے جذبات "اردو" میں یوں ظاہر ہوتے ہیں ؎

دیکھیں گر کچھ بھی وفا ہم بہت بیباک ہیں ہم — دیں جگہ زخمِ جفا کو دلِ صد چاک ہیں ہم

تیرے قدموں سے جدا ہو کے خاک ہیں ہم — نقشِ پا کی طرح لے راحت جانِ عاشق

یہ تھی وہ عسکری زبان جو لشکرگاہ میں بولی جاتی تھی اور جو اُردو کہلاتی تھی۔ فراق کی یہ افترا پردازی کہ یہ مغلوں کے عہد میں محض کا معیاری زبان تھی کسی طرح قابلِ معافی نہیں۔ یہ زبان بابر کے عہد سے شعر و شاعری کی زبان بن چکی تھی اس کی مثالیں اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ غالباً فراق اب یہ کہنے سے گریز کریں گے کہ یہ زبان کبھی لکھی نہ جاتی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے اس کو لکھو(؟) اور فارسی رسم الخط میں کیونکہ فارسی ان کی مادری زبان تھی، حکومت کی زبان تھی اور اس کا اثر اس قدر تھا کہ خود ہندو بھی ناگری رسم الخط کو بھول گئے فارسی انہوں نے سیکھی اور فارسی رسم الخط میں لکھنا شروع کیا ہندوؤں کی اکثریت حکومت کی زبان کی طرف رجوع تھی نہ کہ ناگری رسم الخط اور کھڑی بولی کی طرف۔

؎ مغل اور اردو۔ مصنفہ نصیر حسین خیال

فراق کو غلط بیانیوں سے سیری نہیں ہوتی وہ بلا خوف تردید یہ لکھتے ہیں کہ سندھی، مراٹھی، گجراتی اور بنگالی زبانوں میں سنسکرت کے فقرے اور الفاظ زور پیدا کر دیتے تھے۔ گویا اس کا مقصد یہ ہے کہ ان زبانوں کو بجائے فارسی و عربی کے سنسکرت نے زیادہ متاثر کیا۔ فراق کی عبارت ملاحظہ فرمایئے۔

"پھر بھی دہلی کی بولی میں جو رچاؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا اس سے سندھی، مراٹھی، گجراتی اور بنگالی زبانیں محروم تھیں۔ فارسی و عربی ان زبانوں میں بھی آ گئی تھیں لیکن اس خوش سلیقگی اور اس انداز سے نہیں جس طرح دہلی کی ہندی میں آئی تھیں پھر ان زبانوں کے جو اپنے الفاظ اور فقرے تھے۔ انہیں بھی کھرا دپر چڑھنے کا سان اور لچک، لوچ اور نزاکت، تابندگی، رنگینی اور لطافت فصاحت اور بلاغت حاصل کرنے کے وہ موقع اور سہولتیں حاصل نہیں تھیں جو دلی کی بولی کو حاصل تھیں ان زبانوں کی فصاحت و بلاغت اور زور کلام کی بنیاد نوے فیصدی سنسکرت الفاظ اور سنسکرت کے ٹکڑوں پر تھی۔ نتیجہ حصہ ان زبانوں کا کافی عرصہ تک کھردرا رہ گیا اور اب تک ہے" (اردو ادبی دنیا ص ۴۴)

دہلی کی وہ زبان جو "کھڑی بولی" پر اثر انداز ہو رہی تھی فارسی تھی کیونکہ دہلی مسلمانوں کا دارالسلطنت ہو گیا اور رہا۔ کھڑی بولی یا برج کی زبان برج بھاشا نے ان اثرات کو قبول کیا اور یہاں سے "اردو" پیدا ہوئی۔ فراق صحیح طور پر ان اثرات کا اندازہ لگاتے ہوئے اور دہلی کی اردو کی دنیٰ زبان سے تعریف کرتے ہوئے ایک اور غیر ذمہ دارانہ بات کہہ جاتے ہیں اور وہ یہ کہ نوے فیصدی سندھی، گجراتی، بنگالی اور مراٹھی زبانوں میں جو زور پیدا ہوا وہ سنسکرت کے فقروں یا ٹکڑوں کی وجہ سے۔ فراق کو یہ معلوم ہے کہ سنسکرت اسی دن سے ایک مردہ زبان ہو گئی تھی جس دن سے کہ آریوں نے اس کو برہمنوں تک محدود کر دیا تھا۔ وہ زبان جو ایک محدود طبقہ کی بولی جاتی اور وہ بھی صرف اس وقت جبکہ اس طبقہ کے لوگ پتھر کے بتوں کے سامنے بیٹھ کر دیومالا پڑھیں۔ اور کاروباری مزدوروں میں بھی اسے استعمال نہ کریں۔ کس طرح عوام سے قبول عام کی سند حاصل کر سکتی ہے جبکہ اس کے سننے پر کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جاتا ہو۔ وہ زبان کس طرح مردہ زبان نہ ہو جائے؟ یہی وجہ تھی کہ سنسکرت کی جگہ پالی پراکرت نے لی اور وہ عوام کی زبان سے بتدریج ترقی کر کے خواص کے کانوں اور زبانوں تک پہنچ گئی۔ شنکراچاریہ کے زمانہ میں سنسکرت کے محدود تبدیل کر کے اس کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر مسلمانوں کی آمد اور فارسی کی پل چل کی ضرورت نے سنسکرت کو بالکل ختم کر دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ زبان جو صرف "زبان الٰہی" ہو ہندوؤں کے ہونٹ کبھی اس سے آشنا نہ ہوئے ہوں کس طرح عوام کی زبان پر اثر انداز ہو سکتی ہے؟ اور دوسری زبانیں کس طرح نوے فیصدی الفاظ اور فقرے سنسکرت سے لے سکتی ہیں۔ فراق کے جتنے دعوے ہیں ان میں کوئی نوے فیصدی سے کم نہیں اور سب کے سب باطل اور بے دلیل۔ یہ سب فراق کی دینی تعصب اور ذہنی بے راہ روی کا نتیجہ ہیں۔

فراق تاریخ نویسی میں کہیں کہیں جذباتی بھی ہو گئے ہیں۔ حقائق نگاری کو پس پشت ڈال کر [illegible] دل نے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔ فراق نے ایک ایسے نزاعی مسئلہ کو چھیڑ دیا ہے جس [illegible] نظریوں کا اختلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اردو زبان دکن میں پیدا نہیں ہوئی اور نہ پیدا ہو سکتی تھی لیکن کچھ [illegible] کچھ دکنی [illegible]

اُردو میں ادبی تصنیفوں کا آغاز اس زمانے میں یعنی اب سے کم و بیش تین سو برس پہلے دکن میں ہوا"

(ص ۵۵ - ۶۴)

فراق اس پر سند دیتے ہیں کہ نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ صحیح نہیں۔ انہوں نے جو یہ خیال پیش کیا ہے کہ اُردو کی ابتدا جنوبی ہندوستان سے ہوئی۔ فراق کے نزدیک غلط ہے۔ غالباً ہے طرہ مگر بغیر کسی سبب اور دلیل کے۔ لیکن فراق اس میں یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ جنوبی ہندوستان میں ادبی کام اس زبان سے لیا جانے لگا تھا۔ جو "دکنی یا قدیم اردو" تھی یعنی جس وقت شمالی ہندوستان کی ادبی دنیا میں سناٹا پڑا تھا۔ اس وقت وہاں ادبی کام جاری تھا۔ مگر یہیں سے فراق ایک نئی قلابازی کھاتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

"وطن سے چھوٹ کر دکن میں جا بسنے والی نوآبادی کو وطن کی بولی کی محبت ستانے لگی۔ اس بولی کی قدریں ان پر کھلنے لگیں اور قفس میں پھنس کر اردو کا بلبل ایسے تیز سروں میں چہکنے لگا، وطن سے بیوگ کی ایسی آگ اس کی آواز میں تھی کہ بازار کی بولی نغموں میں بدل گئی اور یوں اُردو شاعری کا آغاز ہوا۔ بادشاہوں نے اپنی بیگمات اور محبوبہ عورتوں کی شان میں غزلیں اور نظمیں کہیں۔"

گویا فراق نے تاریخِ ہند کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے وہ اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں جس کو تغلق سے وابستہ کیا جاتا ہے کہ اس نے دہلی سے دارالخلافہ تبدیل کر کے دیوگری کو اپنا دارالخلافہ تبدیل کر کے دیوگری کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور تمام رعایا کو دہلی سے منتقل ہو جانے کا حکم بھی صادر کر دیا۔ یہ لوگ دکن پہنچے مگر وہاں ان کو دہلی کی یاد نے ستایا۔ یہ نظریہ محمود شیرانی صاحب کا ہے کہ مسلمان شمالی ہندوستان سے ایک زبان لے کر جنوبی ہندوستان گئے یہ اسی واقعہ سے متعلق ہے۔ مگر فراق جنوبی ہندوستان میں شاعری کی ابتدا حب الوطنی، وطن کی یاد اور دیار کے چھوٹ جانے کی آگ کو قرار دیتے ہیں لوگوں کے یہ وطنی جذبات شاعری کی بحروں میں بہ نکلے۔ پھر کیا تھا راستہ مل گیا۔ غزل اور قصیدے لکھے جانے لگے فراق ایک نیا نظریہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ یہ سرد پا جس کی ابتدا نہ انتہا۔ ان کا خیال آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہے۔ انہیں اس خیال کے اظہار سے قبل چار کتابوں کا مطالعہ کر لینا ضروری تھا۔ اول۔ آبحیات مصنفہ محمد حسین آزاد۔ دوم۔ پنجاب میں اردو مصنفہ محمود شیرانی۔ سوم۔ دکن میں اُردو۔ مصنفہ نصیر الدین ہاشمی چہارم اردو زبان کی نئی تحقیق مصنفہ الیس احمد ادیب۔

انہیں ابھی اُردو کے پیدائش کے صحیح نقطۂ آغاز ہی کا علم نہیں ہے۔ مگر شوق سے ما معتوب فراق مجبور ہو کے جا رہے ہیں تاکہ "اردو داں" ان کو بھی تاریخ داں تسلیم کر لیں اور اپنی تحریروں میں فراق گورکھپوری کا حوالہ دیا کریں۔ ایک اور مقام پر خود ہی اپنے مذکورہ بالا خیال کی تردید یوں کی ہے۔

"دلی میں ابھی اُردو ہونٹوں ہی پر تھرک رہی تھی کہ دکن میں وہ صفحۂ قرطاس پر اپنا کمال دکھانے لگی۔ وقت گذرتا گیا، اردو بولی دلی میں حسین سے حسین تر ہوتی گئی اور اُردو ادب دکن میں بنتا گیا۔ یہاں تک کہ شاہ عالم اور ظفر یا شاہجہان کے زمانے میں ولی دکنی نے ردیف وار اپنا ضخیم دیوان مرتب کر کے دکن سے دلی کا رخ کیا یہ سمجھ کر کہ اہل دکن اہل ادب ہیں لیکن اہل زبان دلی والے ہی ہیں۔ دہلی کے فارسی پڑھے لکھے اور فارسی میں کہنے والے ادبا یہ دیکھ کر ٹھٹک گئے کہ ان کی گھریلو اور بازاری

بولی دلّی کے دیوان میں منتقل ہوگئی ہے ۔ (ص ۵۷)

یہ اقتباس اس تبصرے کے مقدمے جو کہ اس سے فراق کے اقتباس سے پیش کیا جاچکا ہے اُردو دکن میں ادبی زبان شمالی ہندوستان کے مقابلہ میں پہلے ہوگئی۔ فراقؔ اس زبان کو دکنی مائل اردو گردانتے ہیں مگر اس اقتباس میں وہ عملی اعلان یہ کہہ دیتے ہیں کہ "اردو ادب" دکن میں بنتا گیا۔ فراقؔ اردو کو ہزار مٹانے اور مسخ کرنے کی کوشش کریں۔ مگر اس کے باوجود یہ زبان دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے گی۔ وہ ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا حسین احمد صاحب۔ مدنی سے گورکھپور میں جو اردو زبان کے سلسلہ میں چند سوالات کئے گئے تھے۔ یوں جواب دیتے ہیں۔

"اُردو نے مقبولیت عامہ حاصل کی اور باوجود اس کے کہ اس کے بننے اور پالنے والوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوگیا مگر یہ زبان روز افزوں ترقی کرتی رہی۔ آج نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونِ ہندوستان، افغانستان، ایران، عراق، شام، فلسطین، عرب، مصر، الجیریا، ٹیونس، برما، تبت چین، جاپان، جاوا، فلپائن، امریکہ۔ اسٹریلیا ایسٹ افریقہ، ساؤتھ افریقہ، جزائر ہند چینی وغیرہ کے بڑے بڑے شہروں میں اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔"

(ہماری زبان یکم اپریل ۱۹۴۵ء ص ۴)

فراقؔ یہ کوشش نہ کریں کہ ہندی ہندوستان کی قومی اور ملکی زبان بن جائے۔ اردو کے سوا ہندوستان کی کوئی زبان قومی اور ملکی زبان ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ جبکہ وہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ غیر ملکوں میں بھی سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں اگر فراقؔ اُردو کی مقبولیت پر غور کریں گے۔ تو انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ اُردو کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ صرف پنجاب یونیورسٹی کے یہ اعداد و شمار اس ثبوت میں کافی ہوں گے۔

مادری زبان	سنہ		طلباء		طلباء
	۱۹۳۷ء –	اُردو	۱۳۸۸۸	ہندی —	۷۲۰
	۱۹۳۸ء	اُردو	۱۳۴۷۴	ہندی	۷۵۷
	۱۹۳۹ء	اُردو	۱۳۳۲۷	ہندی	۷۶۶
	۱۹۴۰ء	اُردو	۱۳۵۹۰	ہندی	۶۵۸

جن زبانوں کو طلباء نے ذریعہ اظہار خیالات بنایا ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سنہ	اُردو	ہندی
۱۹۳۷ء	۱۴۷۶۳	۱۸۹
۱۹۳۸ء	۱۴۳۲۰	۱۷۶
۱۹۳۹ء	۱۴۱۹۷	۱۷۴
۱۹۴۰ء	۱۳۵۹۰	۶۵۸

(ماخوذ از ہماری زبان۔ یکم مارچ ۱۹۴۵ء ص ۳-۴)

فراقؔ کے لئے شاید یہ خبر اور سوہان روح ہوگی۔ کہ اُردو کے بعد زیادہ تعداد ایسے طلبار کی ہے جو فارسی

پڑھتے ہیں۔ فراقؔ کا دبی زبان سے ہندی کی حمایت کرنا اور اُردو کی مخالفت کرنا اُردو کے بہاؤ کو نہیں روک سکتا۔ فراقؔ نے ایک مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ اُردو میں ہندی کے الفاظ کی بہتات ہے حالانکہ ذیل کی تفصیل سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو میں غیر زبانوں کے الفاظ ہیں مگر اس میں "ہندی" کی کوئی جگہ نہیں۔

ہندوستان کی قدیم پراکرتوں کے الفاظ	۲۱۶۴۴
اتحاد سے غیر زبانوں کے الفاظ	۱۷۵۰۵
عربی زبان کے الفاظ	۷۵۸۴
فارسی زبان کے الفاظ	۶۰۲۱
تبدیل ہوئے الفاظ	۵۰۰
ساختہ الفاظ	۴۰–
دوسری غیر زبانوں کے الفاظ	۱۸۱
کل الفاظ	۵۳۸۵۵

فراقؔ کی غلط بیانیاں اور اُردو کے پردے میں ہندی نوازی، ان کے بہروپ کے پردے کو چاک کئے دیتی ہے اور وہ اپنے علمی و ادبی تعصب اور جانبدارانہ انداز بیان اور طرز تحریر کے بدولت اردو کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندی کے آگے سر جھکانے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ وہ ہندی کو اُردو کا محسن قرار دیتے ہیں مگر میرے نزدیک "اُردو کا جنم" ہندی سے نہیں بلکہ "ہندی کا جنم" اُردو سے ہوا۔

فہرست کتب جو زیر مطالعہ رہیں اور جن سے مدد لی گئی

(۱) قدیم ہندوستان از Rapson
(۲) تاریخ ادب ہندی از کیٹی
(۳) Imperial Gazetteer of India I, II
(۴) عرب و ہند کے تعلقات از سید سلیمان ندوی۔
(۵) Linguistic Survey by Grierson
(۶) ہند و ہسٹری از مردم دار۔
(۷) ہندوستانی لسانیات۔ ڈاکٹر محی الدین قادری۔
(۸) اردوئے قدیم از حکیم شمس اللہ قادری۔
(۹) مغل اور اردو۔ از نصیر حسین خیال
(۱۰) دکن میں اردو۔ از نصیر الدین ہاشمی
(۱۱) پنجاب میں اُردو۔ از محمود شیرانی
(۱۲) آبحیات۔ محمد حسین آزاد۔
(۱۳) اردو زبان کی نئی تحقیق۔ از اویس احمد ادیب
(۱۴) داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری۔
(۱۵) چند تنقیدی مضامین۔ از حامد حسن بلگرامی۔
(۱۶) ملیبار۔ از حکیم شمس اللہ قادری۔
(۱۷) ہندی بھاشا کا دکاس از شیام سندر داس۔
(۱۸) ہماری زبان۔
(۱۹) آریائی زبانیں از سد حیشور دما۔
(۲۰) مرہٹی پر فارسی کے اثرات۔ از ڈاکٹر عبدالحق۔

اویس احمد ادیب ایم۔ اے

قولِ فیصل کا ایک ورق

یک بہ یک چلتی ہوئی ہر نبضِ دولت رُک گئی
امتیازِ بندہ و آقا کی گردن جھک گئی!

طبعِ انسانی پہ ہر رازِ نہاں کھلتا گیا!
فطرتِ دوراں پہ حُسنِ جاوداں کھلتا گیا!

پستیِ احساسِ انسانی کی چولیں ہل گئیں
زندگی کو اصل آزادی کی راہیں مل گئیں!

عقل پر تھا جو حجابِ ناتمامی اُٹھ گیا
عرصۂ ہستی سے دستورِ غلامی اُٹھ گیا!

جادۂ اسرارِ باطن کا پتہ ملتا گیا
ہر قدم پر مُدّعا کیا ہے خُدا ملتا گیا!

قلزمِ ہستی کا دھارا تیز تر چلنے لگا
بندۂ مزدور سینہ تان کر چلنے لگا!

ایک طوفانِ یقیں آیا، اُڑا کر لے گیا
فتنۂ اوہامِ ہستی کو بہا کر لے گیا!

خار و خس پر ابرِ رنگیں بن کے چھائی زندگی!
گنگنائی، لہلہائی، مسکرائی زندگی!

علی اختر

بے لوث خدمتگزار

گلشنِ امید ہوا کیف بار
آئی نظر نورِ نظر کی بہار

نورِ نظر سے ہے شعورِ نظر
مطلعِ انوار ہے نورِ نظر

نورِ نظر ہی سے ہے تابندہ تر
سلسلۂ ہستی عشرت اثر

رونقِ معمورۂ عالم ہے کون
باپ کا ہر حال میں ہمدم ہے کون

حکم اِدھر باپ نے اس کو دیا
خم سرِ تسلیم ادھر اس نے کیا

حسنِ ادب، مانعِ چون و چرا
اس سے ادب کا نہ چھٹا دائرہ

پائے جو فرزند اطاعت گزار
کیوں اُسے جینا ہو بھلا ناگوار

جلوہ دہِ گلکدۂ رنگ و بو
ہے پسرِ خوش سیر و خوبرو

لے کے نکلتا ہے جو بیٹے کو ساتھ
ڈال بھی سکتا ہے کوئی اُس پہ ہاتھ

ہمدمِ ظاہری و معنوی
کیوں نہ کرے باپ کے دل کو قوی

باپ پہ گر وقت بُرا آپڑے
باپ کی تائید میں بیٹا لڑے

خوش ہے جو فرزند خوش اطوار سے
کیا غرض اس کو کسی غمخوار سے

خاص ہیں فرزند کی غمخواریاں
اوروں میں یہ شانِ خصوصی کہاں

باپ ہے مسرور تو مسرور یہ
باپ ہے رنجور تو رنجور یہ

باپ جو ہو جائے قضا را علیل
جلد یہ صحت کی نکالے سبیل

لائقِ دید اس کی نگہ کی ہے یاس
دوڑ کے جاتا ہے طبیبوں کے پاس

محو یہ رہتا ہے اسی فکر میں
لطف کہاں اور کسی ذکر میں

کوئی حکیم اور کوئی ڈاکٹر
اس کے تصور سے نہیں دور تر

کرتی ہے ظاہر ہر اک اس کی ادا
باپ کا سایہ رہے سر پر سدا

ڈھونڈ رہا ہے کوئی ایسا طبیب
باپ کو ہو فائدہ جس سے نصیب

اوروں کی قربت سے نہیں مطمئن
باپ کے نزدیک ہی خود رات دن

ہے ہمہ وقتی یہ وہ تیماردار
گھر سے نکلنا ہے جسے ناگوار

ادویہ لانے کے لئے شاپ سے
ہٹتا ہے کچھ دیر جدا باپ سے

غفلتِ یک لمحہ بھی ہے ناروا
وقت پہ دیتا ہے غذا و دوا

دیکھ کے فرزند کی دلبستگی
باپ کی گھٹنے لگی آشفتگی

باپ شفایاب جو ہونے لگا
چین سے کچھ دیر یہ سونے لگا

سعیِ پُر اخلاص عجب چیز ہے
اس کا تصور بھی طرب خیز ہے

مژدۂ راحت پسرانہ خلوص
خوش نظر انسان کے لئے بالخصوص

علی منظور

ورجینیا

کردار :۔ (بالترتیب)

(۱) مغنی (۲) مارکس (۳) کلاڈیس (۴) ورجینیا
(۵) ورجینیا کا باپ (۶) ویلرو (۷) ہیتنو (۸) کورنی
(۹) موریا (۱۰) کرسپس (۱۱) لیسنییس (۱۲) ورجینیس
(۱۳) تبر بردار (۱۴) اور بہت سے لوگ۔

مغنی :۔ روم کے اے نیک عوام!
روم کے اے نیک عوام جو درد مند اور انصاف پسند
دل رکھتے ہو
جو اپنے اُن نڈر رٹ بیونوں کے حق میں ہو، جو
ہمیشہ تمہاری امداد پر کمربستہ ہیں۔
آؤ میرے گرد جمع ہو جاؤ۔
اور انتخابات میں اُمراء کو رائے دینے سے پہلے
سرگزشت سُن لو جو میں تمہیں سُناتا ہوں۔
یہ کوئی بے سروپا یونانی داستان نہیں۔
جس میں تذکرہ ہوتا ہے شراب کے چشموں کا۔
اور ایسی دوشیزاؤں کا جن کے سر سے زلفوں کی
بجائے ناگنیں لٹکا کرتی تھیں۔
اور ایسے جانوروں کا جو خنزیر کی صورت میں بدل دیئے
گئے تھے۔
یہ وہ واقعہ ہے جو ہمارے اپنے روم پر گزر چکا ہے۔
وہ واقعہ جو اسی فورم میں دوپہر کے سورج کے سامنے
رونما ہوا تھا۔
وہ دلگداز اور خونیں واقعہ جسے روم کی خلقت نے
اپنی آنکھوں سے خود دیکھا تھا۔
وہ بوڑھے اب تک لٹھیا کے سہارے ہمارے درمیان
رینگ رہے ہیں۔ جو اس خوفناک تاریخی واقعہ کی شہادت
دے سکتے ہیں۔
اسے صرف ستر سال ہوئے۔
یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب اُمراء میں سے دس
ملعون روم کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔
اور اُن میں سے سب سے زیادہ قابلِ نفرت "امیر
اپیس کلاڈیس" تھا۔
(دُور سے بہت سی آوازیں، مارچ کی مناسب موسیقی
پر۔ امیر اپیس کلاڈیس کی سواری۔ امیر اپیس
کلاڈیس کی سواری! کوڑے پڑنے کی آواز کے
ساتھ۔ ہٹو بچو راستہ چھوڑ دو۔ ہٹو بچو راستہ چھوڑ دو)
امیر اپیس کلاڈیس کی سواری۔ امیر اپیس کلاڈیس
کی سواری!
ہٹو ہٹو راستہ چھوڑ دو۔ ہٹو ہٹو راستہ چھوڑ دو،
امیر اپیس کلاڈیس۔ امیر اپیس کلاڈیس!
(فوراً ایک ٹولی کی آوازیں۔ دبی ہوئی۔
اِن دبی ہوئی آوازوں کے پس منظر میں
سواری کا ملا جُلا شور جاری)

۱۔ (انتہائی نفرت سے) امیراسپیس کلاڈیس!
۲۔ کس تبختر سے اپنی ہاتھی دانت کی چوکی پر بیٹھا ہے۔
۳۔ ہونہہ! بارہ گدھوں نے چوکی کا تخت سنبھال رکھا ہے۔
۱۔ اس کی رعونت میں وہی ملوکیت پھر پروان چڑھتی نظر آرہی ہے جسے روم نے اپنی سرزمین سے جلاوطن کر ڈالا تھا۔
۲۔ اس کا تجمل روم کے آخری ملعون بادشاہ تارکوئن سے کم نہیں۔
۳۔ دائیں بائیں تبر برداروں کے دستے لے کر نکلتا ہے۔
۴۔ عوام کیسی دہشت سے سواری کے لئے راستے چھوڑ رہے ہیں۔

(فوراً پھر بہت سی آوازیں۔ مارچ کی موسیقی پر
راستہ چھوڑو۔ راستہ چھوڑو۔)

امیراسپیس کلاڈیس کی سواری۔ امیراسپیس کلاڈیس کی سواری! ہٹو بچو راستہ چھوڑو۔ ہٹو بچو راستہ چھوڑو۔ (کوڑوں کی آوازیں) امیراسپیس کلاڈیس۔ امیراسپیس کلاڈیس!

(فوراً ایک دوسری ٹولی کی آوازیں۔ دبی ہوئی)
ان دبی ہوئی آوازوں
کے پس منظر میں سواری کا شور و غل جاری)

۱۔ (انتہائی نفرت سے) امیراسپیس کلاڈیس!
۲۔ راتوں کی سیاہ کاریاں لعنت بن کر چہرے پر برس رہی ہیں۔
۳۔ ان کے بغیر بھی چہرہ کچھ کم قابلِ نفرت نہ تھا۔
۱۔ غضبناک جھڑاں ابرو۔
۲ فتنہ پرور کرنجی آنکھیں۔
۳۔ کلہاڑا سی ناک۔
۱۔ جھکی ہوئی باچھیں۔
۲۔ گول ٹھوڑی
۳۔ دوشیزاؤں کو خواب میں بھی گھن دلانے کو بہت کافی۔
۱۔ لیکن حریص نظریں دوشیزاؤں ہی کو راستے میں ڈھونڈ رہی ہیں۔

(فوراً بہت سی آوازیں۔ مارچ کی موسیقی پر۔)
راستہ چھوڑو۔ راستہ چھوڑو۔
امیراسپیس کلاڈیس کی سواری! امیراسپیس کلاڈیس کی سواری!
ہٹو بچو راستہ چھوڑو۔ ہٹو بچو راستہ چھوڑو۔
امیراسپیس کلاڈیس! امیراسپیس کلاڈیس!
(فوراً ایک تیسری ٹولی کی آوازیں۔ دبی ہوئی۔
ان دبی ہوئی آوازوں کے
پس منظر میں سواری کا شور و غل جاری۔)

۱۔ امیراسپیس کلاڈیس (انتہائی نفرت سے)
۲۔ اپنے بھڑوے مارکس کو ساتھ لے کر نکلا ہے۔
۳۔ بھڑوے کو دیکھو کیسا ترت ترت ساتھ جا رہا ہے۔ چہرے پر فروتنی کی مسکراہٹ۔ خوشامد سے جیسے بچھا ہو۔
۱۔ ایسے کمینے دروغ گو یونانیوں میں ہوا کرتے تھے۔
۲۔ جانور کی لاش جہاں بھی ہو گی۔ گدھ آن موجود ہوں گے
۳۔ دیکھو بھڑوا اپنے آقا سے بات کر رہا ہے۔
(سواری کے مدھم شور اور مارچ کے پس منظر پر)

مارکس۔ میرے آقا!
کلاڈیس۔ (چونک کر) ایں؟
مارکس۔ امیراسپیس کلاڈیس خوش نظر نہیں آتا؟
کلاڈیس۔ خوش کرنے کو ہے کیا۔ (جماہی لے کر) خالی بالاخانے جن پر حسن کی چور نظریں نہیں۔ ویران جھرو کے جن میں دعوت کی مسکراہٹ نہیں۔
مارکس۔ (خوشامدانہ ہنسی) ہی ہی ہی ہی ہی ہی!
کلاڈیس۔ ہنستا ہے کمینے۔ ایں؟
مارکس۔ جوانی کی اس بے صبری اور جھنجھلاہٹ پر۔ ہی ہی

ہی ہی ہی ہی!

کلاڈیس۔ جوانی د۔۔ کُتّا کہیں کا۔ فقرے کستا ہے۔

مارکس۔ جب تک امیر کلاڈیس کا دل نوجوان ہے۔ وہ عمر کا ذکر کرکے مجھے لاجواب نہیں کرسکتا۔

کلاڈیس۔ ہوں، دل نوجوان۔ لچّے تو بات بدل لینے کا ڈھب خوب جانتا ہے۔

مارکس۔ صرف اتنی داد، ہی ہی ہی ہی ہی ہی۔ امیر کلاڈیس یہ کیوں ماننے لگا کہ وہ قائل ہوگیا ہے۔

کلاڈیس۔ قائل بہ لاجواب۔

مارکس۔ اور اگر میں اس نوجوان دل کے پچھلے ہفتے کے سارے کارنامے دُہرا دوں؟

کلاڈیس۔ ایں؟ (ہنستا ہے) ہاہا ہاہا سُوّر۔

مارکس۔ میرے آقا گالی یوں دیجئے کہ راستے میں حسنِ نظر سے چوُکنے نہ پائے۔

(فوراً بہت سی آوازیں۔ مارچ کی موسیقی پر)

راستہ چھوڑو! راستہ چھوڑو۔

امیر اسپیں کلاڈیس کی سواری! امیر اسپیں کلاڈیس کی سواری!

(کوڑے پڑنے کی آواز)

ہٹو بچو راستہ چھوڑو۔ ہٹو بچو راستہ چھوڑو۔

امیر اسپیں کلاڈیس کی سواری! امیر اسپیں کلاڈیس کی سواری!

(آوازیں رُکتی ہیں۔ مارچ اور مدھم شور جاری اور اس کے پس منظر پر)

مارکس۔ میرے آقا! میرے آقا! اس شہ نشین پر۔

کلاڈیس۔ ایں؟ اُونہہ! زیادہ گوری۔ پکا چہرہ۔ پختہ عمر۔ حسُن کے یہ ایک ہی سے نمونے۔ یہ تجربہ کار عورتیں۔

مارکس۔ لیکن جہاں تک ادا شناسی کا تعلق ہے۔

کلاڈیس۔ ہوں؟ (جماہی لے کر) کوئی اچنبھا نہیں ان میں۔

مارکس۔ ہی ہی ہی ہی ہی ہی!

کلاڈیس۔ کُتّے!۔ بیٹھ کوڑوں کے لئے کھُجلا رہی ہے۔ ایں!

مارکس۔ ہتھیلی بخشش کے لئے میرے آقا!

کلاڈیس۔ بخشش اس بے ثمر سواری کے بعد؟

مارکس۔ بعد۔ کیوں؟

کلاڈیس۔ طول دینا لاحاصل نظر آرہا ہے

مارکس۔ لوئرفورم میں گھُومے بغیر۔

کلاڈیس۔ ہوں۔ بڑا خیال نہیں۔ لوئرفورم کے غلیظ بازاروں میں گھُوم کر دل ایک پیاس محسوس کرتا ہے۔ لذیذ اور پُراسرار۔ ایں؟ شاید اس لئے کہ وہاں جنسی شائستگی کا معیار اور ہے۔

مارکس۔ اور پھر لال گدڑیوں سے بھی دستیاب ہوجاتے ہیں۔

کلاڈیس۔ ہوں؟۔ ہاں!۔ ہاں!۔ تو۔۔؟

مارکس۔ (بلند آواز میں) بائیں ہاتھ چلو۔ بائیں ہاتھ! لوئر فورم کو!

آوازیں۔ لوئرفورم کو! لوئرفورم کو!

ہٹو بچو راستہ چھوڑو۔ ہٹو بچو راستہ چھوڑو

(آوازیں دُور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ آخری لفظ "سواری" جب دُور سے مدھم سا سنائی دیتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی یعنی تقریباً اس کے اوپر ورجینیا کا گانا شروع ہوجاتا ہے۔ ورجینیا گا رہی ہے۔)

ورجینیا۔ سواری آئی صحنِ باغ میں بادِ بہاری کی
گُلوں نے عطرپاشی کی صبا نے مشکباری کی
چمن کے طائروں نے اس خوشی میں مَیگساری کی
بجائیں تالیاں پتّوں نے گائے گیت بلبل نے
کمر لچکائی ڈالی نے سنواری زلف سنبل نے
کلی کے لب پہ تھرّائے ہوئے لب کھ دیئے گُل نے

باپ۔ (دُور سے) ورجینیا! آگئی مکتب سے؟

ورجینیا۔ (بلند آواز میں) جی ابّا۔

باپ ۔ (دور سے) یہاں آ بچی! ذرا دیر میری گود میں آ کر بیٹھ ۔

ورجینیا ۔ (قریب پہنچ چکی ہے) گود میں؟

باپ ۔ کیوں؟ سمجھتی ہے تیرا گود میں بیٹھنے کا سن نہیں رہا؟

ورجینیا ۔ نہیں ۔ آپ کی خاطر سے بڑی اور بوجھل جو ہو گئی ہوں ۔

باپ ۔ (ہنس کر) بوجھل! ــــ اور پھر اپنے آپ کو بڑی بھی کہتی ہے! پگلی! (ہنستا ہے) بڑی ہو گئی ہوتی، تو تجھے معلوم ہو چکا کہ ماں باپ کی گود کے لئے اولاد کبھی بوجھل نہیں ہوا کرتی ۔

ورجینیا ۔ ایک من سے زیادہ ہو جائے جب بھی نہیں؟

باپ ۔ جب بھی نہیں؛

ورجینیا ۔ کیونکر یقین آئے ۔ اتنا بہت وزن بھلا کیسے سہارا جا سکتا ہے؟

باپ ۔ دیوانی ۔ اولاد کو ماں باپ کا جسم نہیں وہ سرور و کیف سہارتا ہے جو اولاد کے وزن کی ایک ایک رتی کے ساتھ خود ایک ایک سیر بڑھتا رہتا ہے ۔

ورجینیا ۔ سچ مچ؟ ــــ تو بیٹھ جاؤں گود میں؛

باپ ۔ ادھر آ ــ یوں ــــ اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دے ۔ ایسے ۔ اپنا یہ ہاتھ میرے دوسرے کندھے پر رکھ لے ۔ اس طرح ۔ اب دونوں چپ ہو جائیں اور آنکھیں بند کر لیں ۔ یہ راحت ۔ مکروہاتِ زندگی میں سے یہ کشید کی ہوئی راحت ۔ جو غریب تک کی روح کو پھیلا کر ساری کائنات پر مسلط کر دیتی ہے ۔ (آہ بھر کر) اس ناپائدار اور (ورجینیا کی سسکی) سسکی! کیوں؟ اونچا کیجو اپنا سر ــ آنسو! ارے ارے کیوں بچی؟

ورجینیا ۔ کچھ نہیں ۔ مجھے اپنی ماں یاد آ گئی تھی ۔

باپ ۔ ماں ــــ میری بچی میرے سینے سے لگ جا ۔ میری ننھی ورجی! تیری ماں کس قدر چاہتی تھی تجھے اس کی مسکراتی ہوئی حسرت تیرے طفلانہ چہرے میں حسن کے کیسے کیسے سہانے خواب دیکھا کرتی تھی ۔ اس کی روح ایک تصور بن کر تیری ناتوانی کو تکتی رہتی تھی ۔ کاش تو اس کے سامنے کلی سے پھول بنتی ۔ وہ خود دیکھ سکتی، کہ تو رومن امیروں کی رنگیلی لڑکیوں سے کتنی مختلف پروان چڑھی ہے ۔

ورجینیا ۔ میری ماں رومن امیروں کی لڑکیوں کو ناپسند کرتی تھی؟

باپ ۔ ایسی کسی لڑکی کی ماں کہلانا اُس کے لئے موت کے عذاب سے بھی زیادہ تکلیف دِہ ہوتا ۔

ورجینیا ۔ رومن امیروں کی لڑکیاں بہت بُری ہوتی ہیں ابا؟

باپ ۔ اتنی ناپاک کہ تیرے جسم پر میں اُن کا سایہ پڑنا بھی گوارا نہ کروں؟

ورجینیا ۔ ان کے ماں باپ بھی انہیں نصیحت نہیں کرتے؟

باپ ۔ ماں باپ اپنی بیٹیوں کے مشاغل کا علم تک رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے ۔ کاش میری کھولتی ہوئی غیرت اُن نوجوان بیٹیوں کے عصیاں کی داستانیں ان کے بے حس ماں باپوں کے سامنے دُہرانے کا موقع پا سکتیں لیکن یہ کیا گھناؤنی باتیں لے بیٹھے ہم ۔ ستارۂ صبح کے سے معصوم حسن کی گود میں رکھ کر یہ باتیں! ہمیں کیا ۔ ہمیں ان سے یا کسی سے کیا ۔ آ ہم آبرو باختگی کے یہ واہیات قصے بھول جائیں ۔ اُن نکھری ہوئی خوشیوں کی باتیں کریں جنہیں ناداری بھی محبت کرنے والے دلوں سے نہیں چھین سکتی ۔ کل جو نو دیوی کا تہوار ہے ۔ مکتب سے تیری تعطیل بھی ہے ۔ کل کا دن کیونکر گزاریں گے باپ بیٹی؟

ورجینیا ۔ مندر سے لوٹ کر کہیں باہر ۔

باپ ۔ کسی باغ میں؟

ورجینیا۔ نہیں ابا! کھیل تماشوں میں۔ تپلیوں کے تماشے میں ابا۔ یاد ہے پچھلے سال جو تماشہ ہم نے دیکھا تھا؛ اسی میں اس چھوٹے سے موٹے فوجی افسر نے کیسے کیسے تماشے کئے تھے۔ باہر مجمع کا شور و غل سنتا تو بے قرار ہو کر میدانِ جنگ میں جانا چاہتا۔ محبوبہ مسکرا کر کہتی "پیارے" تو رکتا اور ٹھٹکتا ہوا واپس آ جاتا۔ میں تو اس کے تانے بانے پر ہنس ہنس کر لوٹ گئی تھی۔

باپ۔ لیکن اس تماشے نے مجھ کو اداس بنا دیا تھا۔

ورجینیا۔ اداس! ۔ کیوں؟

باپ۔ اس لئے کہ میں خود سپاہی ہوں۔ سپاہی اپنی زندگی میں صرف ایک ہی سبق سیکھتا ہے۔ جو بات دل میں ٹھانا ہر قیمت پر کر گزرنا۔ نہ رحم سے ہاتھ روکنا اور نہ خوف سے منہ موڑنا۔ سپاہی کی عزت کے لئے نہ حسن کوئی شے ہے نہ الفت و محبت کوئی چیز۔ پھر جس تماشے میں فوجی ان ہی خوبیوں سے خالی دکھایا جائے ان کے ایمان کا مذاق اڑایا جائے، وہ ایک سپاہی کو کیونکر پسند آ سکتا ہے؟

ورجینیا۔ لیکن اس مرتبہ تو شاید کوئی دوسرا تماشہ ہو ابا؟

باپ۔ مگر یہ تماشے مجھے پسند ہی نہیں بچی۔

ورجینیا۔ (ٹھنک کر) ابا!

باپ۔ تجھ کو میں بھیج دوں گا۔

ورجینیا۔ (منہ بنا کر) اکیلی میں نہ جاؤں گی۔

باپ۔ اکیلی کیوں؟ کرسپس چلا جائے گا ساتھ۔

ورجینیا۔ (چونک کر) ارے!

باپ۔ کیا؟

ورجینیا۔ میں تو بھول ہی گئی۔ چچا کرسپس نے بلایا تھا مجھے

باپ۔ کب؟

ورجینیا۔ ابھی جب میں مکتب سے واپس آ رہی تھی۔

باپ۔ پگلی بچی۔ اس کی مانگ محلے کے ہر دوکاندار کے ہاں رہتی ہے۔

ورجینیا۔ چچا کرسپس شاعر لیسنیس لئے کھڑے تھے، اور دونوں کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے میرے لئے کوئی اچنبھے کی چیز تیار کر رکھی ہے۔

باپ۔ اچنبھے کی چیز۔ شاید کرسپس نے تیرے گلے کے لئے کوئی ٹوٹکا سی دیا ہو۔

ورجینیا۔ لیکن شاعر لیسنیس بھی تو مسکرا رہا تھا۔

باپ۔ شاعر لیسنیس!

ورجینیا۔ (کھڑی ہو کر) جلدی سے ہو آؤں میں۔

باپ۔ ناشتہ تو کرتی جا۔

ورجینیا۔ (فاصلے سے) ناشتا؟ اوں ہوں۔

باپ۔ کیوں؟

ورجینیا۔ چچا دولیرو کی دکان پر کروں گی۔ ابھی ابھی کہہ رہے تھے وہ آج مجھے کلیجی کے کباب کھلائیں گے۔

باپ۔ اوہ! کلیجی کے کباب!

ورجینیا۔ جناب!

(بازار کی آوازیں مدھم سے اونچی ہوتی ہیں)

ورجینیا۔ (گنگناتی ہے) خوشی کے زمزمے گاتی ہوئی فصلِ بہار آئی۔

آواز ۱۔ مرحبا ننھی ورجینیا مرحبا!

ورجینیا۔ مرحبا چچا مرحبا!

دولیرو۔ (دور سے) ارے ورجی کلیجی کے کباب کھانے کب آئے گی؟

ورجینیا۔ ابھی آئی چچا دولیرو ابھی!

دولیرو۔ ٹھنڈے ہو جائیں گے کباب۔

ورجینیا۔ اور ساتھ ہی آپ جو گرم ہو جائیں گے (ہنس کر)

آپ کی چلبلی باتیں کبابوں سے بھی زیادہ لذیذ ہونگی۔

وولیبو۔ بڑی کونی کی ہے یہ بچی۔

ورجینیا۔ (گنگناتی ہے)

ہنیبو۔ ارے ورجی بچی۔ میرے آرے کی آواز کے ساتھ
گائے گی نہیں آج؟

ورجینیا۔ پھر آؤں گی چچا ہنیبو!

ہنیبو۔ پھر کب۔ تب تک تو لکڑی کٹ بھی چکے گی۔

ورجینیا۔ آرے کی آواز کے ساتھ گا نہ سکوں گی، تو بیٹھ کر
بوڑھے چچا ہنیبو کے سوکھے ہوئے ہاتھ دباؤں گی۔

ہنیبو۔ جیتی رہو بچی جیتی رہو۔

ورجینیا۔ (گنگناتی ہے)

کورنی۔ (دور سے) اری ورجی کہاں جا رہی ہے لپکی ہوئی؟

ورجینیا۔ دیکھا ہوا لوہا پیٹا جا رہا ہے، چچا کورنی!

کورنی۔ (ہتھوڑے مارتے ہوئے) آکر دیکھ تو چوٹ کی
چنگاریوں سے کیسی آتش بازی چھوٹ رہی ہے۔

ورجینیا۔ (ہنس کر) جیسی غصے میں چچا کورنی کی زبان
سے چھوٹا کرتی ہے۔

کورنی۔ پھر میرے غصے کا ذکر! بڑی شریر ہے تو۔

ورجینیا۔ دیکھئے زبان کی آتش بازی کہیں چھوٹنے نہ لگے!

کورنی۔ اس شوخ بچی کی روک ٹوک ایک روز بھیڑ بنا
کر چھوڑے گی مجھے۔

ورجینیا۔ (ہنس کر بڑھ جاتی ہے اور گنگناتی ہے)

موریتا۔ ورجی، ورجی کدھر کو؟

ورجینیا۔ سامنے کی گلی میں!

موریتا۔ کریسپس کے ہاں؟

ورجینیا۔ اُنہوں نے بُلا رکھا ہے مجھے۔

موریتا۔ اوہو! ورجی اب بُلائے بغیر نہیں جاتی کسی کے
ہاں! ہیں؟

ورجینیا۔ یوں کیوں کہتے ہیں چچا موریتا۔

موریتا۔ آئی جو نہیں چچا موریتا کے ہاں کئی دن سے۔

ورجینیا۔ اچھا چچا کریسپس سے بات کر لوں۔ پھر آؤں گی
گھڑی کھڑے۔

موریتا۔ کتنی دیر میں؟

ورجینیا۔ ابھی بات کرتے ہی۔

موریتا۔ (دور سے) تو میں کھڑا ہوں یہیں۔

ورجینیا۔ (گنگناتی ہے)

کریسپس۔ ورجی! اب آئی ہے بچی!

ورجینیا۔ کیوں کیا دیر ہو گئی چچا کریسپس؟

کریسپس۔ ننھی ورجی کو ایک تحفہ دینے کے لئے میں کب
سے بے تاب ہو رہا ہوں۔

ورجینیا۔ (خوشی سے) تحفہ!

کریسپس۔ بتا تو کیا ہوگا بھلا؟

ورجینیا۔ میرے گڈے کے لئے لڑکا۔

کریسپس۔ اُوں ہُوں۔ (امداد) (آواز دور جاتی ہے)

ورجینیا۔ (دور سے قریب) اللہ یہاں تو شاعر لیسنیس بھی بیٹھے
ہیں۔

لیسنیس۔ مرحبا ورجینیا مرحبا!

کریسپس۔ یہ دیکھو اپنے لئے تحفہ۔

ورجینیا۔ اہاہ پھولوں کا تاج۔

کریسپس۔ اپنی ننھی شہزادی کے سر پر رکھنے کو۔

ورجینیا۔ (ہنس کر) میں شہزادی!

لیسنیس۔ جو لور فورم کے دل پر حکومت کرتی ہے۔

ورجینیا۔ اوہ کیسے کھلکھلاتے ہوئے پھول۔

لیسنیس۔ اپنے سر پر رکھ۔ ان چمکتے ہوئے گھنے بالوں پر۔
یوں۔ اب دیکھ آئینہ۔ آسمانی لباس پر تارا سی آنکھیں
اور ان کے اُوپر پیشانی سے لپٹی ہوئی پھولوں کی کہکشاں۔

ورجینیا۔ کس قدر خوش نما۔

لیسنیس۔ پھول کب یوں جیتے جاگتے نظر آئے تھے۔

کریپس۔ معلوم ہے یہ تاج میں نے کیوں بنوایا ہے؟
ورجینیا۔ کیوں؟
کریپس۔ کل جونو دیوی کے تہوار کے روز لورنزم کی شہزادی کا جلوس نکلے گا۔
ورجینیا۔ جلوس؟ کس کا؟
کریپس۔ ہماری ننھی ورجی کا۔ ہم سب دکاندار اس کے سر پر پھولوں کا تاج رکھیں گے۔ اسے ایک چوکی پر بٹھائیں گے لینیس اس کی شان میں ایک قصیدہ پڑھے گا۔ اور پھر چوکی کو کندھوں پر اٹھا کر ہم پورے لورنزم کا چکر لگائیں گے
ورجینیا۔ میرا جلوس؟
لینیس۔ اس ننھی دیوی کا جو ایک دل شاد قمری کی طرح لورنزم میں دکان دکان پر چہچہاتی اور اپنی بشاشت کے سے تھکی ہاری مفلسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آتی ہے
ورجینیا۔ اپنا جلوس نکلواؤں گی نہیں، شرم آئے گی مجھے۔
لینیس۔ شرم! کیوں؟ شرم اُن کا حصہ ہے جن کے دل غربت کے جھکے ہوئے کندھوں کو کچلنے والا بوجھ محسوس ہوتے ہیں۔ تجھے شرم کیوں؟ ہماری ورجی کو شرم کیوں جس کی جاں نواز مسکراہٹ کو ہنستی اور کھلکھلاتی ہوئی محبت سواری دینا . . . . .

(کلاڈیس کی سواری کی آوازیں)

آوازیں۔ (دور سے) امیر اپیس کلاڈیس کی سواری! امیر اپیس کلاڈیس کی سواری!
ورجینیا۔ (جیسے کان لگا کر) سواری۔
آوازیں۔ (کسی قدر واضح) امیر اپیس کلاڈیس کی سواری! امیر اپیس کلاڈیس کی سواری!
کریپس۔ کلاڈیس کی سواری لورنزم میں!
ورجینیا۔ (باہر مل کر) دیکھیں۔
لینیس۔ اس ملعون کی سواری کا نظارہ دیکھنے والے کو فرحت نہیں بخش سکتا۔

ورجینیا۔ (جاتے ہوئے) پھر بھی۔
کریپس۔ بچی!
ورجینیا۔ (ٹھٹک کر) چچا
کریپس۔ ارے دیوانی
لینیس۔ نہیں۔ ورجینیا نہیں۔
ورجینیا۔ سواری گزر بھی جائے گی۔ ابھی آئی۔ گلی کے نکڑ پر سے ایک نظر دیکھ لوں۔
کریپس۔ تم بیٹھو لینیس میں اس کے ساتھ جاتا ہوں۔ ورجینیا ورجینیا! (جاتا ہے)
آوازیں۔ (تھوڑے فاصلے پر) امیر اپیس کی سواری۔ امیر اپیس کلاڈیس کی سواری۔ ہٹو۔ بچو۔ چھوڑ دو راستہ۔ امیر اپیس کلاڈیس۔ امیر اپیس کلاڈیس
مورینا۔ (سڑک کے پار سے) ورجینیا!
ورجینیا۔ مورینا چچا!
مورینا۔ گلی میں کیوں اکیلی کھڑی ہے بھاگ کر میری دکان پر آ جا۔
ورجینیا۔ مگر سواری۔
مورینا۔ بھاگ آ۔ بھاگ آ۔ جلدی سے بھاگ آ۔
کریپس۔ (دور سے قریب آتے ہوئے) ورجی کہاں جا رہی ہے ورجی؟
ورجینیا۔ (قریب سے دور) چچا مورینا کی دکان سے دیکھوں گی۔
کریپس۔ ارے آن پہنچی سواری۔ اوہ! . . . .
آوازیں۔ ہٹو۔ چھوڑ دو راستہ۔ ہٹو چھوڑ دو راستہ۔
کلاڈیس۔ ٹھہرو۔ (پردیسی)
مارکس۔ میرے آقا!
کلاڈیس۔ کون تھی یہ . . . ایں؟
مارکس۔ کس بالا خانے پر آقا؟
کلاڈیس۔ گدھے یہ لڑکی۔ جو گلی سے نکل کر اس دکان پر گئی۔

مارکس۔ کس دُکان پر میرے آقا!

کلاڈیس۔ جی۔ جو آسمانی لباس پہنے اور سر پر پھولوں کا تاج رکھے۔ داہنے ہاتھ اِس دُکان پر کھڑی ہے۔

مارکس۔ وُہ میرے آقا!

کلاڈیس۔ اشارہ نہ کر۔ کتنی نئی، کیسی تر و تازہ! ایں! گھور مت اُدھر۔ سب سے الگ۔ اُف کبھی لذت کے کیا کیا اسرار اپنے اندر لئے ہوئے۔

مارکس۔ لیکن کمسن نہیں وُہ؟

کلاڈیس۔ ایں! کمسنی اس کے افسوں کا صرف ایک حصّہ ہے۔ میرے لئے حاصل کر اسے ابھی۔

مارکس۔ سواری لور فورم کے آخر تک چلی جائے۔ واپسی میں لڑکی سواری کے ساتھ محل کو چلے گی۔

کلاڈیس۔ چلو!

مارکس۔ سواری آگے بڑھاؤ۔

آوازیں۔ امیرا بیپس کلاڈیس کی سواری۔ امیرا بیپس کلاڈیس کی سواری! ہٹو بچو۔ راستہ چھوڑ دو!
امیرا بیپس کلاڈیس ـــ امیرا بیپس کلاڈیس

مارکس۔ (آوازیں مدھم پڑتے ہی دُور سے قریب) امیرا بیپس کلاڈیس کے نام پر لڑکی میرے ساتھ چل۔

ورجینیا۔ میں؟

مورینا۔ یہ کیوں

مارکس۔ اِس لئے کہ اس لڑکی کا والی میں ہوں۔

مورینا۔ حضور! اس لڑکی کے والی؟

مارکس۔ بے شک یہ میری ہے۔ مَیں اس بات کے گواہ رکھتا ہوں۔

کریپس۔ (دُور سے قریب) کیا بات ہے؟

ورجینیا۔ چچا کریپس، چچا کریپس۔ یہ مجھے اپنی ملکیت ٹھہرا کر کھینچ رہا ہے۔

کریپس۔ کیا فرما رہے ہیں حضور؟

مورینا۔ حضور کو شاید دھوکا ہُوا۔ غالباً اِس لڑکی کی شکل کسی دوسری لڑکی سے مشابہ ہے۔

مارکس۔ مارکس کی آنکھ دھوکا کھانا نہیں جانتی۔

کریپس۔ مگر سارا لور فورم شہادت دے سکتا ہے کہ وُہ اِس لڑکی کو اس کے بچپن سے جانتا ہے۔

مارکس۔ لور فورم کی شہادت سے زیادہ مارکس کو اپنی شناخت پر اعتماد ہے۔ یہ لڑکی میری کنیز اور خانہ زاد ہے۔

مورینا۔ میرے حضور۔ یہ لڑکی ارمنی سپاہی ورجینیس کی بیٹی ہے۔

مارکس۔ تو ورجینیس ایک چرائی ہوئی کنیز کو خریدنے کے جُرم میں سزا پائے گا۔

کریپس۔ ہم حلف اُٹھا سکتے ہیں کہ یہ لڑکی ہماری آنکھوں کے سامنے بچی سے بڑی ہوئی ہے۔

مارکس۔ مارکس بھی حلف اُٹھا سکتا ہے کہ یہ اس کے گھر میں اور اس کی ایک کنیز کے پیٹ سے پیدا ہوئی۔

مورینا۔ تو پھر عدالت فیصلہ کر سکے گی کہ ہم میں سے کون سچا ہے اور کس کو دھوکا ہُوا ہے۔

مارکس۔ تو جاؤ اور عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔

کریپس۔ عدالت کے دروازے پر جانے کی ضرورت ہی کو ہوتی ہے حضور!

مارکس۔ اُسے جو عدالت کی امداد کے بغیر بھی اپنا حق حاصل کرنے کی قدرت رکھتا ہے؟

کریپس۔ زبردستی؟

مارکس۔ اپنی چیز کو لینا زبردستی نہیں کہلاتا۔

مورینا۔ یہ ظلم ہے، جبر ہے۔

مارکس۔ لڑکی چل میرے ساتھ۔

ورجینیا۔ اوہ! ـــ چھوڑ دو میرا ہاتھ

مارکس۔ تو میری ہے اور مَیں تجھے لے کر رہوں گا۔

ورجینیا۔ مجھے چھوڑ دو ـــ مجھے چھوڑ دو!

کرسپس ۔ حضور چھوڑ دیجئے اسے۔

مارکس ۔ خبردار جو کسی نے قدم آگے بڑھایا۔

ورجینیا ۔ مجھے چھڑاؤ ۔ مجھے چھڑاؤ۔

موردینا ۔ یہ شخص ورجینیا کو پکڑے لئے جا رہا ہے۔ آؤ آؤ!

ورجینیا ۔ مجھے بچاؤ ۔ مجھے بچاؤ۔

لوگ ۔ کیا ہے ۔ کیا ہے؟

مارکس ۔ بازار کے غلیظ کتو ۔ زندگی عزیز ہے تو ہٹ جاؤ۔

کرسپس ۔ ہنیو ذرا جا کر ورجینیا کے باپ کو بلاؤ۔

ہنیو ۔ (جاتے ہوئے) میں ابھی آیا۔

لیسنیس (آتے ہوئے) کیا ہے؟ کون پکڑے لئے جا رہا ہے ورجینیا کو؟

کرسپس یہ شخص ۔ یہ ورجینیا کو اپنی کنیز بتا رہا ہے۔

لیسنیس ۔ کلاڈیس کا یہ غنڈا!

مارکس ۔ گستاخ شخص کون ہے تو؟

لیسنیس ۔ شاعر لیسنیس!

مارکس ۔ گندی نالیوں میں زندگی بسر کرنے والے کیڑے تجھے ایک معزز رومن کی توہین کی جرأت ہوئی۔

لیسنیس ۔ میں کسی معزز رومن کو مخاطب نہیں کر رہا۔ ضرورت نے مجھے کلاڈیس کے بھڑوے کو مخاطب کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

لوگ ۔ (خاموش کرانے کے لئے) لیسنیس! لیسنیس!

مارکس ۔ لقمۂ اجل، تجھے اِن لفظوں کی قیمت بہت مہنگی ادا کرنی ہوگی۔

لیسنیس ۔ اجل کا خوف اُسے ہو سکتا ہے جو کلاڈیس کی ٹھوکر کو جہنم نہ سمجھتا ہو۔

کرسپس ۔ خاموش ہو جا لیسنیس خاموش ہو جا!

موردینا ۔ تجھے معلوم نہیں تُو کیا کہہ رہا ہے؟

کرسپس ۔ یہ بغاوت ہے اس کی سزا یقینی موت ہے۔

لیسنیس ۔ بزدلو! پھر ذلت کی وہ کون سی حد ہے جس پر پہنچ کر تم موت کو زندگی پر ترجیح دے سکو گے۔ تم سمجھتے نہیں کہ یہ ایک غریب رومن سپاہی کی لڑکی کو کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کیوں اس کی دروغ بافی اس قدر ڈھٹائی سے ہماری ورجینیا کو چھین لینا چاہتی ہے۔ احمقو! اس بوڑھے عیاش کا بستر سجانے کے لئے جس کی کمینگی اور ہوس رانی جائز اور ناجائز تک میں تمیز کرنے کے قابل نہیں رہی۔

مارکس ۔ سربازار امیر کلاڈیس کی توہین کرنے والے تیرے سانس گنے جا چکے۔

لیسنیس ۔ اس لئے میں بہت بے فکری سے انہیں امیر کلاڈیس پر سربازار لعنت بھیجنے میں صرف کروں گا۔ اور اُن سب امیروں پر ۔ جن کے جابر ہاتھوں نے غریبوں سے اُن کی ہر قابل قدر متاع چھین کر انہیں قلاش اور محتاج بنا ڈالا ۔ اُن امیروں پر جن کے بخل نے غریبوں کو اپنی نمائندگی کے حق سے محروم کیا۔ جن کی حرص نے اُن کی املاک پر قبضہ کر لیا۔ جن کی پیچ نے صرف ان کے لئے ایک جدا آئین بنا دیا۔ لعنت ہو تم پر اور تمہارے بزرگوں پر جنہوں نے انسانیت کو اعلےٰ اور ادنیٰ میں تقسیم کیا۔ لعنت ہو تم پر اور تمہاری آل پر جنہوں نے غریب کا پسینہ اور لہو پیا۔ اور پھر لعنت ہو تم پر جس نے غریب کا حسن تک جبر سے چھین لینا چاہا۔

مارکس ۔ ہی ۔ ہی ۔ ہی ۔ ہی ۔ خطابت اکارت جا رہی ہے، چراغ بجھنے سے پہلے آخری بار بھڑک رہا ہے۔ مگر ہی ہی ہی ہی اندھے کیوں راستہ نہیں دیکھتے؟

لیسنیس ۔ کیوں راستہ نہیں دیکھتے، اِس لئے کہ استبداد ان کی رُوح کو کچل چکا ہے ۔ ان کے لئے زندگی ایک بے اختیاری کی کیفیت سے زیادہ نہیں رہی۔ اُمرا نے ان کی املاک ۔ مال اور حقوق کے ساتھ ان کی آزادی

قوت اور خود اعتمادی بھی چھین لی — ان کے جسم میں جو لہو باقی ہے تم اس کی آخری بوند بھی نچوڑ لو جن زنجیروں میں اِن غریبوں کو جکڑ رکھا ہے، اُنہیں اور وزنی کر دو! تمہاری بے رحم حقارت کے جواب میں یہ بھیڑ ہی کے حِلم سے کام لیتے رہیں گے۔ لیکن جو سائے ہمارے قدموں کے تلے ہیں، اور جو دیوتا ہمیں آسمان سے تک رہے ہیں، اُن کا واسطہ۔ تم اپنی بے رحم حقارت میں اپنے بے رحم ترعشق کی آمیزش نہ کرو۔

مارکس۔ مجنون نوجوان کافی بک لیا۔ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیئے جانے سے پہلے خود خاموش ہو جا۔

لسینیس۔ خاموش کر دیئے جانے سے پیشتر مجھے تم سے پُوچھنا ہے کہ کیا تمہارے آراستہ محلوں میں وہ حسین دلربائیں موجود نہیں جن کا بے داغ سلسلۂ نسب شاہوں اور مدبروں اور پروہتوں سے شروع ہوتا ہے۔ وہ نازنینیں جن کے بلوریں قدم ہماری گلیوں میں سے گزرنا تک پسند نہیں کرتے، جو اپنی سواریوں کی استراحت سے ہماری ناداری پر رعونت کی نظر ڈالتی گزر جاتی ہیں، جن کی خود آرائی اپنے جمال کو کورنتھیا کے آئینوں میں دیکھ کر مسکراتی ہے۔ جن کا سپالوزی سونے سے سجا ہُوا جسم کیسپوا کی نکہتوں کی لپٹیں نکالتا ہے۔ تو پھر کیوں اِن غریبوں کو اس اکیلی نعمت سے محروم کر ڈالنا چاہتے ہو، جس نے انہیں اپنی دردناک زندگی سے وابستہ کر رکھا ہے؟ بیٹی، بہن اور بیوی کی شیریں اُلفت سے۔ اُس نرم گفتاری سے جو ان کی خستہ و رنجور رُوح کے لئے مرہم کا کام کرتی ہے۔ محبت کے اُن بوسوں سے جن میں یہ تمہارے وزنی جوئے تک کو بھول جاتے ہیں۔ لڑکیوں کے حُسن کو بخش دو کہ اسے دیکھ کر ایک باپ کا سینہ فخر محسوس کر سکے۔ ایک فلاکت زدہ دولہا اپنے بازوؤں میں بے داغ عصمت کو لے سکے غریبوں

کو اس ظلم اور ذِلت کا شکار نہ بناؤ، جو بزدلوں تک کے دِل کو نڑلا دے اور نامردوں تک کے لہو کو شعلہ بنا دیتی ہے۔ اُس گھڑی سے خوف کھاؤ جو یاس کی انتہا کو غیض و غضب کی ابتدا بنا ڈالتی ہے۔

مارکس۔ امیراپیس کلاڈیس کی سواری واپس آ لے، پل بھر میں کُھلا جاتا ہے کہ خوف کی گھڑی کس کے لئے آ چکی ہے۔ کمینو! بکھر جاؤ۔ سواری کے لئے راستہ چھوڑ دو۔ کلاڈیس کے خادم کی کنیز اُس کے حوالے کرو۔ ورنہ امیر کے طیش کا نتیجہ بھگتنے کے لئے تیار رہو۔

کورنی۔ ہمارے جیتے جی ورجینیا کو کوئی چھو نہیں سکتا۔

مارکس۔ کس کی جرأت ہے کہ اس کا بازو میرے ہاتھ سے چھڑائے۔

ورجینیا۔ سی۔ چچا کورنی۔ لسینیس۔ چچا وولیرا یہ میرا بازو کچلے دے رہا ہے۔ اوہ —

وولیرو۔ سلامتی چاہتا ہے تو فی الفور چھوڑ دے اسے۔

مارکس۔ کمینے قصائی اپنے غلیظ لباس کی عفونت کو لے کر دُور کھڑا رہ۔

وولیرو۔ فی الفور اسے چھوڑ نہ دیا، تو وولیرو کا گھونسہ اس کے لباس کی عفونت سے بہت زیادہ اذیت بخش ثابت ہو گا۔

مارکس۔ بدتمیز، گستاخ، لُچے!

وولیرو۔ پھر بھی نہیں مانتا تو یہ لے!

مارکس۔ اوہ! اجل گرفتہ — آہ! — تُو نے اپیس کلاڈیس کے ملازمِ خاص پر وار کیا ہے۔ امیراپیس کلاڈیس کے — آہ — مارکس کی فریاد خالی نہیں جا سکتی۔ تیرے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔

لسینیس۔ اینٹ سے اینٹ بجانے والے اگر اپنے جسم کے قیمے میں اپنی ہڈی سے ہڈی بجوانا نہیں چاہتا تو اپنا راستہ لے۔

آوازیں۔ (دُور سے مدھم) راستہ چھوڑ دو۔ ہٹو بچو۔

راستہ چھوڑ دو — امیر ایپیس کلاڈیس —
— امیر ایپیس کلاڈیس — !
مارکس ۔ وہ! امیر ایپیس کلاڈیس آن پہنچا ۔ میرا امیر آن پہنچا ۔ اُس کی سواری آن پہنچی ۔ اب آؤ تم میں سے کون میرے مقابلے میں آتا ہے ۔ اب دیکھو مارکس کا انتقام تمہیں کس انجام کو پہنچاتا ہے ۔ چھُریاں تمہاری لمبی دبالوں کو قطع کریں گی ۔ شیروں کے جبڑے تمہارے کھُردرے ہاتھوں کا قیمہ بنائیں گے ۔ تم سب ۔ تم میں سے ایک ایک اسی وقت بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا جائے گا ۔
لیسنیس ۔ اِس سے پیشتر کہ اس کی افترا پرداز زبان ہم سب پر جھوٹا الزام لگا سکے ۔ میں اسے ہمیشہ کو خاموش کر دینا چاہتا ہوں ۔
مارکس ۔ نہیں نہیں — نہیں نہیں — (ایک لحنت بھاگتے ہوئے) میرے آقا! میرے آقا!
وولیرو ۔ بچ کر نکل گیا ۔
کرسپس ۔ کلاڈیس کے یہاں پہنچنے تک ہم سب کو بکھر جانا چاہیئے ۔
مورینا ۔ ورنہ آج ہم سے کوئی زندہ نہ بچ پائے گا ۔
کورنی ۔ اور ہماری دُوکانیں ؛
کرسپس ۔ جان پیاری ہے تو یوں ہی چھوڑ دو ۔
مورینا ۔ سب اپنے اپنے گھروں میں جا کر چھپ جاؤ ۔
کرسپس ۔ ورجینیا کا باپ نہیں آیا اب تک ؛
مورینا ۔ وولیرو ورجی کو تم اپنے ساتھ رکھو!
کرسپس ۔ بھاگ چلو! بھاگ چلو!
لیسنیس ۔ بزدلو! ٹھہرو ۔ کمینے کے انتقام سے کوئی دیوار تمہیں چھپا نہیں سکتی ۔ کھڑے رہو ۔ ہمارے معصوم پر قضا کی مُہر لگ چکی ۔ مِٹ جانے سے پہلے اپنے آپ کو شجاعوں کی اولاد ثابت کرو ۔

وولیرو ۔ یہ سچ کہتا ہے ۔ کمینہ پرور مارکس کی آنکھ سے کوئی پناہ گاہ نہیں بچ سکتی ۔
کورنی ۔ جو لوگ یہاں موجود ہیں ، اگر بچ بھی گئے ، تو انتقام کی پیاس بے قصوروں کو پکڑ کر بجھائی جائے گی ۔
لیسنیس ۔ ہم سب یہیں ٹھہریں گے ۔
وولیرو ۔ ہمیں مرنا ہی ہے تو ہم مردوں کی طرح مریں گے ۔
کورنی ۔ خاموش ۔ خاموش! سواری آن پہنچی ۔
آوازیں ۔ امیر ایپیس کلاڈیس کی سواری ۔ امیر ایپیس کلاڈیس کی سواری ۔
ہٹو بچو ، راستہ چھوڑ دو ۔
امیر ایپیس کلاڈیس کی سواری ۔ امیر ایپیس کلاڈیس
مارکس ۔ امیر ایپیس کلاڈیس میرے آقا یہ ہیں وہ سب باغی جنہوں نے آپ کی شان میں ناقابلِ معافی گستاخی کی اور میری مسروقہ کنیز دبا رکھی ہے ۔
کلاڈیس ۔ باجیو ۔ یہ ہم کیا سُن رہے ہیں ۔ تم سب کیوں یہاں جمع ہو ۔ تمہاری خم کھائی ہوئی پیٹھیں دُرّوں کے لئے کھُجلا رہی ہیں ۔ مارکس کی کنیز اس کے حوالے کرو ، اور منتشر ہو جاؤ ۔
وولیرو ۔ مارکس جھوٹا ہے امیر ،
مارکس ۔ میرے آقا ، میرے آقا یہی ہے وہ شخص جس نے میرے جبڑے پر سرِ بازار گھونسا رسید کیا ۔
کلاڈیس ۔ تجھ سے انصاف کیا جائے گا ۔ غروبِ آفتاب سے پیشتر اسے سُولی پر لٹکنا ہوگا ۔
مارکس ۔ میرے آقا! تیری عمر دراز ہو ۔ تُو نے اپنے خادم کی ذلّت کا داغ مٹا دیا ۔
لیسنیس ۔ لیکن اپنے انصاف کے داغدار دامن پر ایک اور داغ لگا لیا ۔
کلاڈیس ۔ ایں ؛
مارکس ۔ میرے حضور ، میرے حضور ۔ یہی ہے وہ شخص جو نہیں

بغاوت پر آمادہ کر رہا تھا۔

کلاڈیس۔ ایں! بغاوت پر؟

مارکس۔ یہ ایک شاعر ہے جو ان سب کو طرح طرح سے غیرت دلا کر اکساتا ہے۔

کلاڈیس۔ ایسے شورش پسندوں کی جگہ دہانِ شیر ہے۔

مارکس۔ میں نے اسے بتا دیا تھا آقا لیکن یہ پھر بھی خاموش نہ ہوا۔

لسینیس۔ اس واسطے کہ غریب کے لئے کلاڈیس کا رحم بھی دہانِ شیر بن چکا ہے۔

کلاڈیس۔ ایں؟

مارکس۔ میرے آقا اس کی زبان کو لگام نہیں دہانِ شیر کے حوالے کرنے سے پیشتر اس کی زبان قطع ہونی چاہئے۔

کلاڈیس۔ اس سے نپٹنے کا اختیار مارکس ہم نے تجھ کو بخشا۔

مارکس۔ زندہ باد! امیر اپیس کلاڈیس!

کلاڈیس۔ سواری بڑھاؤ۔

مارکس۔ مگر میرے آقا یہ سب غلیظ لوگ جو یہاں جمع ہیں۔ تیری توہین اور تیرے غلام کی ذلت پر قہقہے لگا رہے ہیں۔

کلاڈیس۔ ایں! قہقہے ہماری توہین اور ہمارے غلام کی ذلت پر۔ تو ان کی نظریں اب کیوں جھکنا سیکھ گئیں۔ کیسی مُنحسی صورتیں لئے کھڑے ہیں۔ (قہقہے) ہا ہا ہا! سور کہیں کے تجھے ان سے ان قہقہوں کی عبرت انگیز قیمت وصول کرنی ہوگی مارکس!

مارکس۔ پائندہ باد! امیر اپیس کلاڈیس!

کلاڈیس۔ خبردار رہو! مارکس کی کنیز کو ساتھ لے لو آگے بڑھو! خبردار۔ چل لڑکی۔

ورجینیس۔ (دور سے قریب آ) ٹھہرو!

ورجینیا۔ (قریب سے دوڑ) ابا! میرے ابا۔ (سسکیاں لیتی ہوئی باپ سے لپٹ جاتی ہے) یہ مجھے لئے جا رہے تھے۔ تم کہاں تھے مجھے بچاؤ۔ مجھے چھڑاؤ میرے ابا!

مارکس۔ یہ ہے وہ شخص جس نے میری مسروقہ کنیز کو مارقوس سے خریدا اور لڑکی کو اس سے جُدا کر لو۔

ورجینیس۔ لیکن میں لڑکی کا دعویٰ کرنے، اس پر اپنا کوئی حق جمانے نہیں آیا۔ میں سب کچھ سُن چکا ہوں۔ میں سب کچھ سمجھ چکا ہوں۔ میں ــــ میں صرف اس لئے آیا ہوں کہ اسے اپنے ہاتھ سے تمہارے حوالے کروں۔

ورجینیا۔ ابا!

مارکس۔ تو الگ کر اپنے بازوؤں سے اسے۔

ورجینیس۔ الگ کرنے سے پہلے میں اس سے صرف چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیا روم کا امیر روم کے ایک خدمت گزار سپاہی کی اتنی التجا بھی پوری نہ کرے گا؟

کلاڈیس۔ نامعقول شخص نہیں۔ ایں؟ اجازت ہے تجھے!

ورجینیس۔ میری بچی! میرے ساتھ ادھر آ۔

ورجینیا۔ تم مجھے ان کے حوالے کر رہے ہو میرے ابا؟

ورجینیس۔ الوداع جانِ پدر الوداع۔ میرے سینے سے لگ آخری بار۔ اس طرح۔ تو کس قدر عزیز رہی ہے مجھے۔ میں نے کس قدر محبت کی ہے تجھ سے:ــــ اوہ ــــ کچھ نہ بول میری بچی! چپ چاپ میرے سینے سے لپٹی رہ۔ میں جانتا ہوں تو اپنے باپ کی دیوانی ہے۔ مجھے کیا یاد نہیں کہ جنگ سے میری واپسی پر تو ہی تو خوشی سے ناچتی اور بے خودی سے تالیاں بجاتی تھی۔ کون میرے ہتھیار اُتارتا! اُنہیں بھاگ کر دیوار پر ٹانکتا، اور ہنستا ہوا امیرانہ فخر لے آتا تھا۔ تخت جگر سب کچھ بھول جا۔ تیرے شیریں اطوار، تیری میٹھی باتیں۔ تیرے سہانے گیت، اب کوئی نہ ہوگا جو میری رخصت پر آنسو بہائے اور میری آمد پر مسرت سے کھلکھلائے۔ بوڑھا بیمار اپنے بستر پر پڑا اکیلا چھت کو تکتا رہے گا، اور اس کی تاریک نظریں پیاری ورجینیا کو ترستی رہیں گی۔ گھر کی دیواروں کے اندر جس گھر سے

بشاش کرنی چار دیواری دیتی، جو گھر کیپولا کے صدر یا بولر کر خاطر میں نہ لاتا تھا، تیری مسکراہٹ کی روشنی سے محروم ہو کر اس گھر میں غم کے لمبے لمبے سائے آ تائیں گے تیری آواز کی موسیقی نکل جانے سے اس گھر پر تربتوں کا سکوت بیٹھ جائے گا — میری جان! کون جانتا تھا کہ ابدی کی گھڑی یہیں یوں اچانک آ جائے گی — دیکھ وہ کس طرح تجھ کو تک رہا ہے۔ اس کی حرص آلود نظریں، اس کے پھڑکتے ہوئے نتھنے، اس کا اٹھتا اور بیٹھتا ہوا سینہ، — عیار ہوتے ہوئے نہیں سمجھ سکتا کہ مقہور اور مجبور باپ کے پاس اپنی یاس میں ایک دہشتناک حربہ ابھی باقی ہے۔ اسے گمان تک نہیں کہ لڑکا کے اندر میرے ہاتھ نے اس شے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے جو تیری معصوم کمسنی کو اس مکروہ تعدی سے بچا سکتی ہے جس کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ اس گھناؤنی بےحرمتی سے جسے نہ تو جانتی ہے اور نہ کبھی جانے گی —

اس لئے میری پیاری ایک بار پھر میرے سینے سے لپٹ جا کہ ہماری روحیں ایک دوسرے کو چوم لیں۔ آخری بار — آخری بار۔ مجھے اپنی پیشانی کا ایک اور بوسہ دے۔ آخری! — اور اب میرے دل کے ٹکڑے، آنکھیں بند کر لے۔ بے بس باپ کی غیرت بے نیام ہوتی ہے۔

(لوگوں کی آوازیں)

خنجر! خنجر! ورجینیں! ورجینیں!

کلاڈیس۔ اس کے ہاتھ سے خنجر چھینو!

مارکس۔ اس کو پکڑ لو۔ چھین لو خنجر!

ورجینیس۔ خبردار! یہ خنجر غیرت مند باپ کی دختر کو معصوم رکھے گا اور یہ اپنی منزل پر یوں پہنچ کر رہے گا۔

(ورجینیا کی چیخ اور پھر کامل سکوت)

(ایک لحظہ لوگوں کی آوازیں)

۱۔ لڑکی کو اس سے ہاتھ سے لے لو۔

۲۔ دیکھو! دیکھو! شاید اس میں جان ہو۔

۳۔ بھاگ کر جاؤ۔ کسی طبیب کو بلاؤ۔

۴۔ اس کی نبض دیکھو۔

۵۔ زخم پر کچھ باندھ دو۔

۶۔ ٹھہرو۔ میں اپنے چوغے سے دھجی پھاڑے دیتا ہوں۔

۷۔ رہنے دو۔ اس میں کچھ باقی نہیں۔

۸۔ ورجینیس۔ ورجینیس۔ تو نے کیا کیا؟

۹۔ ورجینیس تو ہوش میں ہے؟

۱۰۔ یہ اپنے سامنے کیا تک رہا ہے؟ کیا اس کا دماغ چل نکلا ہے؟ ورجینیس!

ورجینیس۔ اے پاتال کے ظلمات میں بسنے والو۔ فریاد ہے فریاد — مقتولوں کے خون کا قصاص لینے والو۔ فریاد ہے فریاد۔ تمہیں میرے اپنے بہے ہوئے محبوب خون کی قسم۔ میرا انصاف کرتے وقت میری اس دعا کو فراموش نہ کرنا کہ جو کچھ اپیس کلاڈیس نے آج مجھ سے اور میری اولاد سے کیا۔ وہی کچھ اپیس کلاڈیس اور اس کی آل کا مقسوم ہو۔

(جاتا ہے)

کلاڈیس۔ اسے روکو! اسے پکڑو!

مارکس۔ تبر بردارو۔ اسے زنجیروں میں جکڑ لو۔

کلاڈیس۔ دس ہزار دینار اس کے لئے جو اس قاتل کا سر قلم کر کے میرے قدموں میں ڈال دے۔

مارکس۔ تبر بردارو۔ تم بڑھتے کیوں نہیں۔ قاتل چلا جا رہا ہے۔ اسے پکڑتے کیوں نہیں؟

کلاڈیس۔ سؤرو! تم بت کیوں بن گئے؟

مارکس۔ پاجیو! تم قاتل کو دیکھ کر کانپ کیوں رہے ہو؟

کلاڈیس۔ اوہ! وہ ہجوم میں غایب ہو گیا۔ نمک حرامو! ڈھونڈو تبر بردارو۔ تم میں سے ایک ایک دہانِ شیر کے حوالے

کیا جائے گا۔

مارکس۔ میرے آقا وہ لڑکی کی لاش بھی لے چلے!

کلاڈیس۔ (پکار کر) لاش کے گرد بھیڑ کیوں لگ گیا؟ وردیلو! بکھر جاؤ۔ منتشر ہو جاؤ، اپنا اپنا کام کرو، تبر بردارو، ہجوم کو اپنے کوڑوں سے صاف کرو۔ اور لاش کو ان سے چھین لو۔

لیسیئس۔ لاش کو ان سے چھین لو؟ کتے۔ ابھی تیرے کلیجے میں ٹھنڈک نہیں پڑی۔ اس سرد لاش کو دیکھ اور اپنے گریبان میں منہ ڈال۔ ان پتھرائی ہوئی آنکھوں اور ڈھلکی ہوئی گردن کو دیکھ اور اپنی آستین کے لہو کی پکار سن! بدنصیب دمنو۔ تمہیں سروئیس نے آئین اس لئے بخشا تھا کہ تم یہ دن دیکھو، لوکریس کا لہو اسی لئے بہا تھا کہ تم ان ذلتوں کا شکار ہو۔ ٹارکون کی لعنتی نسل سے دہشتناک انتقام کیوں لیا گیا تھا؟ اس لئے کہ امراء غریبوں کو پیس کر رکھ دیں؟ سکیوولا کا داہنا ہاتھ آتشیں میں کیوں جلا تھا؟ اس لئے کہ ہوس کار امیر تمہاری معصوم بیٹیوں کی عصمت دری کریں؟ کہاں گئی تمہاری وہ روح جس نے کبھی سینٹ تک کی آمریت کو عناں گیر کر رکھا تھا؟ کہاں گیا تمہارا وہ خروش جس نے اپنے خیموں سے قلۂ مقدس کو دودھ سا سفید کر دیا تھا؟ کیا بلوں میں رہنے والی لومڑیاں، اُن جانبازوں کی آل کو مرعوب کر لیں گی، جو شیروں کے بھٹ میں پھاند پڑتے تھے؟ کیا وہ قوم جو ایک امیر کی مطلق العنانی برداشت نہ کر سکتی تھی، دس ملعونوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گی؟ تمہیں اپنی ننھی بیٹیوں کے گہوارے کی قسم۔ تمہیں اپنی مرحوم ماؤں کے مقدس کی قسم۔ ورجینیا کا خون اکارت نہ جانے پائے۔ یہ بے گناہ لہو جو آج تمہاری آنکھوں کے سامنے بہا ہے، روم کی تاریخ میں رنگ لائے۔ اس گناہ کی حکومت کا تختہ آج ہی پلٹے۔ دس ملعونوں کا اقتدار آج ہی نابود ہو۔ ہم پر ہمارے ٹریبیون حکومت کریں۔ ہم آج ہی ٹریبیون چن کر لے کر رہیں۔ زندہ باد ٹریبیون۔ زندہ باد ٹریبیون۔

ہجوم۔ زندہ باد ٹریبیون!

(ہجوم کا شور و غل)

مارکس۔ میرے آقا ہجوم بپھرا جا رہا ہے۔

کلاڈیس۔ واپس چلو۔ فوراً واپس چلو۔

مارکس۔ بھاگو۔ تبر بردارو۔ بھاگو۔

کلاڈیس۔ لوگ بے قابو ہوئے جا رہے ہیں۔

مارکس۔ وہ ناکے نہ گھیر لیں۔

کلاڈیس۔ ہجوم جیسے ایک بہت بڑے جسم کی طرح بڑھ رہا ہے۔

مارکس۔ چیتے کی طرح آہستہ آہستہ۔

کلاڈیس۔ مگر مجھ پر نظریں گاڑے۔ اچانک مجھ پر چھلانگ پڑنے کے لئے۔

مارکس۔ میرے آقا، یہ ہم میں سے کسی کو جیتا نہ چھوڑیں گے

کلاڈیس۔ میرے پیارے تبر بردارو۔ میرے جانثار تبر بردارو میری مدد کرو۔ یہ بپھرا ہوا ہجوم مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔ واپسی کا راستہ نکال لو۔ جلد سے جلد مجھے گھر پہنچا دو۔ میں تمہیں مالامال کر دوں گا۔ میں تمہیں نہال کر دوں گا۔

لیسیئس۔ (دور سے) بزدل کلاڈیس کے تبر بردار بھاگ کھڑے ہوئے۔

ع۱۔ اگر ہم اسے پکڑ نہ سکے، تو ہم اسے سنگسار کر کے ورجینیا کا انتقام لیں گے۔

ع۲۔ اسی پر پھینکو۔ جو کچھ تمہارے ہاتھ آئے۔

(شور، پتھر پڑنے ——— اور ٹوٹنے پھوٹنے کی آوازیں)

لوگ۔ مُردہ باد دس ملعون۔ زندہ باد ٹریبیون!

(کلاڈیس اور مارکس کے کراہنے کی آوازیں)

راوی:۔ اور کلاڈیس کی جھکی کہاروں کے کندھوں پر

یوں جھول رہی تھی، جیسے بیٹھے ہوئے بادبانوں کی کشتی
جھولتی ہے ۔ ایڈریاٹک کے اُبال پر، اُس وقت
جب مشرقی جھکڑ اسے غضب ناک بنائے ہوتے ہیں
اور جب کریسین کف کے بادلوں میں گم ہو جاتا ہے اور
سارا ساحل ظلمت کدہ دکھائی دیتا ہے ۔ ایک پتھر ایپیس
کلاڈیس کے منہ پر بیٹھا اور دوسرا اس کی کنپٹی پر ۔
پیلیٹائن کی پہاڑی پر پہنچتے پہنچتے
وہ خوف اور درد کے مارے بے شعور ہو چکا تھا ۔
اس کا ملعون سر جسے تکبر سے وہ اونچا رکھا کرتا تھا ۔
کسی مدہوش کے سر کی طرح لٹک گیا اور جھول رہا تھا ۔
جب چوکی بردار اسے اُٹھائے ہوئے اس کے دروازے
پر پہنچے ۔
تو اس کا تمام چہرہ غلاظتوں سے لت پت تھا ۔
جو حالت ایپیس کلاڈیس کی اُس روز ہوئی ۔
ویسی ہی اُس کی آل اولاد کی ہو ۔
دیوتا روم کو ایسا ایک دن اور دکھائیں ۔
اور میری دعا ہے کہ اس کا نظارہ کرنے کے لئے
مجھے وہاں پہنچائیں ۔

سید امتیاز علی تاج

غزلِ مسلسل

زندگی یوں بھی گزر جائے گی — تُو نہیں گر تو ترا غم ہی سہی
نغمۂ کیف مبارک ہو تجھے — مجھے تقدیر کا ماتم ہی سہی
تُو شناسائے مسرت ہے تو کیا — مَیں غم و درد کا محرم ہی سہی
زخمِ دل کا جو مداوا نہ ملا — مجھ کو اب حسرتِ مرہم ہی سہی
اپنی دیرینہ اُمیدوں کے لئے — آنکھ پُرنم ہے تو پُرنم ہی سہی
کیفِ راحت کی جھلک دیکھ چکا — اب غم و یاس کا عالم ہی سہی
مَیں جو ناکامِ تمنا ہوں تو کیا — نقش پھر نقش ہے مبہم ہی سہی
زندگی کیا ہے رضا ہے تیری — صورتِ گریۂ شبنم ہی سہی
تو جو چاہے مری چاہت ہے وہی — گر نہیں آبِ بقا سم ہی سہی
اس میں بھی نشہ ترے عشق کا ہے — زندگی حسرتِ پیہم ہی سہی
تیری درگاہ میں مَیں بھی تھا کبھی — اِک تعلق تو ہے کم کم ہی سہی

فکر ہے تیری سلامت کا مجھے
تیرا مشتاق کوئی دم ہی سہی

مشتاق بھٹی

اے مشرق!

پیمبرانِ سحر کو ہے انتظار ترا — کہاں ہے آج وہ خورشیدِ زرنگار ترا
بہت فریب دیئے زندگی کو مغرب نے — ہنوز رُوحِ بشر پر ہے اقتدار ترا
نہیں ہے گردِ خزاں تیرے کارواں کا مآل — شبِ بہار تری، خیمۂ بہار ترا
کسی کی کم نگہی کا قصور بھی کیا ہے — بہت بلند ہے ایوانِ اعتبار ترا
یہ راز، کیا کوئی ظاہر پرست سمجھے گا — کہ تیرے جبر میں شامل ہے اختیار ترا

فنا پذیر تری رفعتِ کمال نہیں
ترا زوال تری رُوح کا زوال نہیں

زمانہ کشتۂ جادوئے سامری کب تک — یہ خونِ دل، یہ تماشائے دلبری کب تک
جسے خدا سے نہیں ماسوٰی سے نسبت ہے — وہ اشتباہ و گماں کی پیمبری کب تک
خود اپنی آگ میں جلتا ہے دامنِ بیداد — ستمگروں کی قبائے ستمگری کب تک
یہ بتگرانِ خرد، بندگانِ وہم و گماں — جس آذری پہ ہیں نازاں وہ آذری کب تک
وہ مطمئن ہیں کہ روزِ جزا قریب نہیں — مگر یہ خوابِ پریشانِ کافری کب تک
ترا جلالِ خداداد کیا رہے گا نہاں — سحاب، پردۂ خورشیدِ خاوری کب تک

اسی خزاں کو نقیبِ بہار ہونا ہے
بہشت بن کے تجھے آشکار ہونا ہے

(ناتمام)

روشؔ صدیقی

کتاب اور زندگی

چند روز ہوئے جب انڈیا بک ایجنسی نے مجھے اپنے آل انڈیا کتابی نمائش میں آکر حصہ لینے اور تقریر کرنے کی دعوت دی تو خلافِ معمول میں نے فوراً اُن کی دعوت منظور کر لی۔ مجھے بچپن ہی سے کتاب سے نسبت نہیں عشق رہا ہے، وہ میری ہمدم و ہمراز رہی ہے۔ ذرا ڈرتے ہوئے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ وہ تقریباً نصف صدی میری رفیقِ زندگی بنی رہی ہے۔ خواہ میں اپنی لائبریری میں کتابوں کے جھرمٹ میں بیٹھا رہا یا کسی ایک کتاب کو لے کر اپنا الگ کسی کونے میں محوِ مطالعہ رہا میرے لئے وہ زندگی کا انتہائی عیش تھا اور آج بھی یہ حالت ہے کہ میں کتاب کی صورت دیکھ کر فوراً اس کا دلدادہ ہو جاتا ہوں کیونکہ: ؎

وہ میرے پاس ہوتی ہے گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کتابوں کی خریداری کے معاملے میں میری وہی حالت ہوتی ہے جو عورتوں کی کپڑے یا زیور خریدتے وقت ہوتی ہے۔ ضرورت ہو نہ ہو استعمال ہو سکے یا نہ ہو سکے، جی یہی چاہتا ہے کہ یہ بھی خرید لو وہ بھی خرید لو، بس اپنے قبضے میں کر لو۔ اور عورتوں ہی کی طرح میں بھی اپنے اس زیور کو کسی کو مانگے دینے سے حتی المقدور پرہیز کرتا ہوں، خود کتاب پر رنگ رنگ کی پنسلوں سے نشانات لگا کر اُسے مسخ کرتا رہتا ہوں لیکن اسے ذرا پسند نہیں کرتا کہ کوئی غیر اُس کی طرف نیک نیتی سے بھی ہاتھ بڑھائے، اس بارے میں میں بہت بخیل اور حاسد واقع ہوا ہوں۔ اور میرا بخل اور حسد قطعاً بے جا بھی نہیں، کبھی کبھی بعض شریف و متین عزیزوں دوستوں نے میری بعض نایاب کتابوں پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اُن کی علم دوستی کی داد دوں یا اُن کی دوست دشمنی پر ناک بھوں چڑھاؤں؟ بہر صورت مصلحت اسی میں ہے کہ اب میں اس ذاتی داستان کو طول نہ دوں۔ اور ٹھنڈے دل سے غور کروں کہ انسانی زندگی میں کتاب کی کیا حیثیت ہے؟

میرا مقصد یہ نہیں کہ پوری طرح تفتیش کروں کہ پہلے پہل کتاب کب وجود میں آئی۔ کتاب سے پہلے ادب پیدا ہوا اور اس ادب نے پہلے پہل غالباً شعر کی صورت اختیار کی۔ سو شاعروں کو آج کل کے عقلمند سائنس دان یا فلسفی حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ جب انسان نے پہلے پہل خوشی میں آکر رقص کیا تو شاعر ہی تھا جس نے اُس کے لئے خوشی کا گیت وضع کیا اور ممکن ہے کہ جب دنیا کا خاتمہ ہونے لگے تو شاعر ہی کی زبان سے اُس کا مرثیہ سنائی دے۔ شعر نے پہلے پہل انسان کو ربط و ضبط کی تعلیم دی۔ اُس وقت لکھنا ایجاد نہ ہوا تھا۔ انسان کا کتب خانہ اُس کا اپنا حافظہ تھا۔ کتابت کا پہلا نمونہ مصر میں ایک بڑے بت کے گھٹنے پر لکھا پایا گیا ہے جو غالباً ساتویں صدی ق م میں لکھا گیا۔ جرجیانی کے الفاظ پہلے پہل ایک کتابت کے خریطے پر لکھے گئے۔ بابل اور اشوریا کی کتابیں مٹی کے کتبے تھے۔ مصر، یونان اور روم کی "کتابیں" چرمی کاغذ پر لکھی جاتی تھیں۔ عربوں میں اس مطلب کے لئے کھجور کے پتے بھی استعمال کرتے تھے۔ روئی کا کاغذ پہلے پہل مکہ میں ۷۰۶ء میں استعمال ہونے لگا۔ یہ وہ دمشقی کاغذ ہے جس کا یونانی مؤرخین ذکر کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چھاپہ پندرھویں صدی میں جرمنی میں ایجاد ہوا۔ لیکن اُس سے پہلے عربوں کے ہاں بغداد اور قرطبہ وغیرہ میں کتابیں لاکھوں کی تعداد میں موجود تھیں۔ سپین میں الحاکم ثانی کے کتب خانے میں چار لاکھ جلدیں تھیں اور اُن کی فہرستیں ہی ۴۴ جلدوں میں تھیں، قاہرہ کے کتب خانے میں ایک لاکھ

؎ یہ مضمون آل انڈیا بک لیگ کے جلسہ منعقدہ ۱۶ نومبر ۱۹۴۵ء میں یونیورسٹی ہال لاہور میں پڑھا گیا۔

قلمی نسخے بھی تھے اور یہاں طلبا کو عاریۃً کتابیں لینے کی عام اجازت تھی۔ اس مضمون میں علمی تحقیق میرے پیش نظر نہیں اس لئے میں اس قدرے خشک موضوع کو چھوڑ کر پھر اس دلچسپ بات پر غور کرتا ہوں کہ انسانی زندگی میں کتاب کا کیا مرتبہ ہے؟ میں کتاب کو زندگی کی ایک بہترین نعمت سمجھتا ہوں۔ کتاب توسیع زندگی ہے وہ فی الحقیقت زندگی کی تکمیل کرتی ہے۔ وہ ہمیں گزرے ہوئے زمانوں اور مُردہ انسانوں سے ملاتی ہے وہ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا میں کیا ہوا کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ کتاب وقت کی زنجیروں میں قید نہیں اور کتاب میں ماضی حال اور مستقبل سب آکر باہم مل جاتے ہیں۔ ادب کمالِ زندگی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ ادیبوں نے دنیا بلکہ کائنات بھر کی دلچسپیوں کو شوق کی نظروں سے دیکھا ہے اور پھر اسے محنت کے ہاتھوں سے کتاب کی صورت میں محفوظ کر دیا ہے۔ پس کون اس صریح حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ کتاب انسانی زندگی کی لوحِ محفوظ ہے اور انسان کی بہترین رہنما۔ کتاب کے مطالعہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے انسان بہتر انسان بنے اُس سے اُس کی خودی کی بہترین قوتیں بیدار ہوں۔ کتابوں کی سیڑھی لگا کر زمین پر رہنے والا انسان آسمان کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کتاب بہترین تفریح کا ذریعہ بھی ہے۔ سچ یہ ہے کہ کتاب ایک ایسی رفیقِ حیات ہے جو ہمارے دل کی ہر کیفیت کے مطابق ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ کبھی وہ ہمیں ہنساتی ہے کبھی رُلاتی ہے کبھی ہمیں غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہے نظم سُن کر ہم گانے لگتے ہیں ڈرامہ دیکھ کر ہم حرکت میں آجاتے ہیں سائنس کے کرشموں سے ہم انسانی طاقت کا نشہ لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

کتاب کے متعلق ادیبوں شاعروں نے کیسی کیسی پُرلطف باتیں کہی ہیں، ان میں سے چند باتیں سنیئے۔ اس وقت مغربی مقولات کی ایک کتاب میرے سامنے ہے، چنانچہ میں صرف چند مغربی مفکرین کے خیالات پیش کرتا ہوں۔ "کتاب ہی بقا کی ایک صورت ہے" (رُوڈفس کوئیٹ)۔ "اچھی کتاب بہترین دوست ہے آج اور ہمیشہ کے لئے" (ٹپر)۔ "کتابیں زمانے کے عظیم الشان سمندر میں روشنی کے مینار ہیں" (وہپل)۔ "ہمارے زمانے کی اصلی یونیورسٹی کتابوں کا ایک مجموعہ ہے" (کارلائل)۔ "کارآمد کتابیں ساتھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ تنہائیاں ہیں جن میں ہم اور ہماری فکر و تشویش سب کھو جاتی ہے" (ربیلی)۔ "اگر کوئی کتاب کسی دل سے نکلی ہو تو وہ یقیناً دوسرے دلوں میں جگہ پائے گی" (کارلائل)۔ "نوعِ انسان نے جو کچھ بھی کیا سوچا پایا حاصل کیا ہے یا جو کچھ بھی انسان بنا ہے وہ گویا ایک جادو کی طرح کتابوں کے صفحات میں محفوظ ہے" (کارلائل)۔ "لوگوں کو ایک دوسرے سے اپنی الفت کا اکثر اس طرح پتہ چلتا ہے کہ انہیں کسی ایک ہی خاص کتاب سے محبت ہوتی ہے" (سیموئل سمائلز)۔ "اگر یورپ بھر کی تمام سلطنتوں کے تاج میرے پاؤں میں ڈال دیئے جائیں کہ یہ لے لو اور اپنی کتابیں دے دو اور پڑھنا چھوڑ دو تو میں یقیناً اُن سب کو ٹھکرا دوں" (فینیلان)۔ "جب کوئی کتاب تمہارے نفس کو بلند کرے اور تمہارے دل میں شرافت اور دلیری کے جذبات پیدا کر دے تو پھر تم اُس کی خوبی کا اندازہ کرنے کے لئے اور قاعدے ڈھونڈتے پھرو یہ سمجھ لو وہ قطعی طور پر اچھی ہے اور اُسے ایک اچھے کاریگر نے بنایا ہے" (بروئیر)۔ "کتابیں مساوات پیدا کرتی ہیں۔ جو لوگ وفاداری سے اُن کا استعمال کرتے ہیں وہ انسانی نسل کے بہترین اور عظیم الشان افراد کی صحبت اور رُوحانی موجودگی سے فیض یاب ہوتے ہیں" (چیننگ)۔ "گزرا ہوا زمانہ لفظوں میں زندہ ہے ہزارہا سال خالی رہ جاتے اگر کتابیں اُنہیں زندہ نہ رکھتیں بے جسم روحوں کے بے گوشت لب کتابوں ہی کے ذریعے ہم کلام ہوتے ہیں" (بلورلٹن)۔ "کتابوں کے بغیر خدا خاموش ہے، عدل خوابیدہ، سائنس غیر متحرک، فلسفہ لنگڑا، ادب بے زبان اور تمام اشیاء تاریکیوں میں گُم صُم" (بیارتھولن)۔ "اُن تمام چیزوں میں سے جو انسان یہاں دنیا میں کر سکتا ہے یقیناً سب سے عظیم الشان اور حیرت انگیز اور قابل قدر وہ ہیں جنہیں ہم کتابیں کہتے ہیں" (کارلائل)۔ "کتابوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ہمیں مُردہ لوگوں سے بات چیت کرنے میں مدد دیتی ہیں" (بربرجز)۔ "آدمیوں اور کتابوں کا مقابلہ کرتے وقت یہ خاص فرق یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان کتابوں کو جب چاہے طاق پر رکھ سکتا ہے۔ جیسا سکاٹ نے کہا ہے افلاطون کبھی بیزار نہیں ہوتا سروینٹیز کبھی چڑچڑا نہیں بنتا ڈیماس تھینز کبھی بے وقت نہیں آجاتا، دانتے کبھی ضرورت سے زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا" (ولیس)۔

کتابوں کی خاموش طاقت دُنیا کی ایک بڑی زبردست طاقت ہے۔ اُن کے مطالعہ میں ایک ایسا لطف ہے جسے کچھ وہی جانتے ہیں جو اُنہیں دل لگا کر اور سرگرمی سے پڑھیں۔ اور گو وہ خاموش، جامد اور بے شور و غل ہیں تاہم وہ بے شمار لوگوں کو عمل پر اُکسا سکتی اور قوموں کی قسمت کو تبدیل

کرسکتی ہیں" (انبری جوناز) : جیسا کہ ڈراٹرن نے خوب کہا ہے کتابیں وہ عینک ہیں جن سے ہم فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ اُس کی حقیقت نہیں کھلاتی اور محسوس کراتی ہیں۔ اور ہمارے حواس کے تصویری حروف انہیں کے ذریعے سے پڑھے اور سمجھے جا سکتے ہیں" (ڈمیرا) "کتابوں سے دلی محبت کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ ہم نے تمام گزشتہ وقتوں کے بڑے اور اچھے انسانوں سے ذاتی تعارف حاصل کرلیا۔ یہ درست ہے کہ کتابیں اپنی الماریوں میں پڑی ہوئی خاموش ہیں لیکن باوجود اُن کی اس خاموشی کے جب میں ایک لائبریری میں داخل ہوتا ہوں تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے مُردہ لوگ یہاں موجود ہیں اور میں خوب جانتا ہوں کہ اگر میں ان کتابوں سے سوال کروں گا تو وہ مجھے برابر جواب دیں گی" (رجان برائٹ)

غرض کتاب کی عظمت اور سُودمندی کو ایک دنیا مانتی ہے، مشرق و مغرب دونوں اُس کے مدّاح ہیں۔ کیا دین کیا دنیا دونوں اُس کے نام لیوا ہیں۔ ہندوستان میں ہندو عہد میں ٹیکسلا، بنارس، نالندہ کی یونیورسٹیوں میں ملک کے ہر حصے سے طالب علم آتے اور کسبِ علوم کرتے تھے۔ وید، اُپ وید، رامائن مہابھارت گیتا، شکنتلا کون ہے جو ان عظمت مآب کتابوں سے واقف نہیں؟ ہندوستان غور و فکر اور حصولِ علوم میں اتنا محو ہوا کہ اُس کی آزادی بھی اُس کے ساتھ غرق ہوگئی۔ مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں جنھوں نے علم و ادب کی بے حد قدر کی بابر اور جہانگیر نے اپنے حالات خود لکھے، ہمایوں جہاں جاتا اپنی کتابیں ساتھ لے جاتا۔ آخر کار وہ مرا بھی تو اپنے کتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر۔ مغل شہزادیوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔ گلبدن بیگم نے اپنے بھائی کی یاد میں ہمایوں نامہ لکھی، زیب النسا مخفی جذبات سے شعر و سخن کی محفل گرماتی ہے۔ اورنگ زیب جس نے سنتے ہیں حکم دے دیا تھا کہ ملک میں کوئی شخص دیوانِ حافظ اپنے پاس نہ رکھے، اپنے سرہانے ۔۔۔ دیوانِ حافظ کا ایک نسخہ رکھتا تھا۔ اورنگ زیب کا خیال تھا کہ حافظ کی باریکیوں کا سمجھنا انتہا درجہ دشوار ہے اور اُس کی غلط تاویل کرکے معتقد ۔۔۔ توہین کرتے ہیں۔

بغداد اور قرطبہ اور قاہرہ اور اسلامی تمدن کے دوسرے مرکز فی الحقیقت علم و فضل کے مرکز تھے۔ عربی مورخ طبری ۸۳۹ء تا ۹۲۳ء کی تاریخ آٹھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ ابن الاثیر ۱۱۶۰ء تا ۱۲۳۳ء نے اپنی تاریخ دُنیا "الکامل" بارہ جلدوں میں لکھی۔ تیرھویں صدی میں عربی کاغذ قسطنطنیہ میں استعمال ہونے لگا جہاں سے فرانس، اطالیہ، انگلستان اور جرمنی نے اسے تیار کرنا سیکھا۔ ابن جہاں نے چالیس جلدوں میں سپین کی ایک تاریخ لکھی۔ مامون الرشید نے قسطنطنیہ کے شاہنشاہ تھیوفانس کو درخواست کے پیرائے میں لکھا کہ وہ ازراہِ نوازش تمام مستند اور مفید یونانی کتابیں اُس کے پاس بھجوا دے تاکہ وہ تراجم کے ذریعے سے اُن کی دُنیا بھر میں اشاعت کر سکے۔ شاہنشاہ نے خلیفہ کو اُس کے جواب میں ایک نہایت گستاخانہ خط لکھا جو بجیثیت علمی ذوق اور راست پسندی کا گویا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اسلامی دنیا مشرق و مغرب کی بجائے اتصال تھی۔ اُس نے دونوں کے علوم جمع کئے۔ علوم کو ترقی دینے کا مسلمانوں کو اس قدر خیال تھا کہ جب کوئی امیر خود مختار ہو جاتا تو وہ فوراً اپنے کتب خانے عوام کے لئے کھول دیتا۔ اندلس میں ستر عام کتب خانے تھے اور ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ شمالی افریقہ کے شہر فاس کے بڑے کتب خانے میں لوی کی ساری تصنیفات عربی میں موجود تھیں۔ سڈ ہیرٹ لکھا ہے کہ ایک عالم نے اس وجہ سے سلطان بخارا کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا کہ اُس کی کتابیں لادنے اور لے جانے کے لئے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوتی۔ بعض اسلامی درسگاہوں کے دروازوں پر یہ حروف کندہ ہوتے تھے: دنیا چار چیزوں سے قائم ہے، حکیموں کا علم، بادشاہوں کا عدل، پاکبازوں کی عبادت اور بہادری کی شجاعت۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علم دوستی اور کتب بینی محض آج کل کے زمانے کی پیداوار نہیں بلکہ مشرق نے تمدن کے اس اہم شعبے کی طرف نسبتاً بھی زیادہ توجہ دی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب حصولِ علم کی خواہش خاص و عام سب میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے جس کا نتیجہ بلاشبہ نوعِ انسان کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ علم و فن روحانی اثرات سے خالی نہ ہو جائیں۔

یہ خیال بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ مذہب علمیت اور کتب بینی کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ دنیا میں مذہب علم کا پہلا سرپرست تھا۔ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآنِ کریم کی علم پروری اور کتاب پسندی اس کا بہترین ثبوت ہے۔ شروع کی مشہور آیت ہے ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ یہ وہ کتاب

ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں) خود قرآن کے معنی ہیں ایسی چیز جو پڑھی جائے سب سے پہلی آیت جو رسولِ کریم پر اُتری سب سے پہلا لفظ جو رُوحِ کائنات نے عرب کے صحراؤں سے دُنیا بھر کے لئے نشر کیا علم اور کتاب سے متعلق تھا یعنی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (پڑھ خدا کے نام سے جس نے سب کچھ پیدا کیا۔

لیکن قرآن مجید نے یہ بھی بتایا اور سمجھایا کہ نرا علم اور نری کتاب کافی نہیں زندگی کی صحیح ترقی کے لئے اُس کے ساتھ ہی نیکی اور ایثار بھی لازم ہیں۔ علم بغیر عمل کے بے سود ہے عمل کا فرض زیادہ شدت سے عائد ہوتا ہے۔ اَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (کیا تم لوگوں سے نیکی کرنے کو کہتے ہو اور اپنی خبر نہیں لیتے حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہوئے ہو۔ کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے)۔ ؎

نہ ہو جس میں ادب اور ہو کتابوں سے لدا پھرتا ظفر اُس آدمی کو ہم تصور بیل کرتے ہیں

کتاب کو زندگی کی کتاب کا ضمیمہ یا تتمہ یا حاشیہ سمجھنا چاہئے پہلے اصل متن کو دیکھو پھر حاشیے سے اُس کی اصلیت کو سمجھو: ؎

ملے گا منزلِ مقصود کا اُسی کو سراغ اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ
کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

جو شخص محض کتابوں میں گھر گیا وہ زندگی کی وسعتوں سے آگاہ نہیں ہو سکتا: ؎

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

محض ساکن سطح پر بہنے والے کبھی زندگی کی گہرائی سے واقف نہیں ہو سکتے، کتاب کو محض سرسری طور پر پڑھنے والے کبھی کتاب اور زندگی کے اندرونی رشتے کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور پھر سچا عالم وہی ہے جو انسانی علوم کی کوتاہیوں کو سمجھے: ؎

اک ذرّہ ناچیز کو انجم سمجھا اک موجِ خفیف کو تلاطم سمجھا
اس علمِ قلیل کو کہ ہے صرف اک بوند افسوس کہ جاہلوں نے قلزم سمجھا

بلکہ بعضوں نے بائرن کی طرح یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

'All that we know is nothing can be known.

یعنی: ؎

ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا علم اُسی وقت صحیح معنوں میں ہمارے لئے سودمند ہو سکتا ہے جب ہم زندگی سے اُس کا رشتہ جوڑ دیں جب ہم جو جانیں اور مانیں اپنی روزمرہ کی زندگی کو اُس کے مطابق کر دکھائیں۔ جو شخص زندگی کے تجربات سے صحیح طور پر مستفید ہوتا ہے زندگی کے سب پہلو دیکھتا ہے ہر قسم کے لوگوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ کتابوں میں عموماً اپنے تجربوں کی گونج سُنے گا۔ وہ کتابوں میں اپنی دیکھی ہوئی دُنیا کو منعکس دیکھے گا۔ اور اُس کے لئے ان دیکھی حقیقتیں بھی زیادہ آسانی سے منکشف ہو جائیں گی: ؎

اُلٹے گا فلک نقاب تیرے آگے کھل جائے گی ہر کتاب تیرے آگے
ہو جائے گا سب عارضِ یک ذرّۂ خاک جھک جائے گا آفتاب تیرے آگے

اس کا مدعا یہ ہے کہ سیرِ زندگی کی جگہ تمہاری کتب بینی نہ لے لے بلکہ سیرِ زندگی کے ساتھ ساتھ کتب بینی بھی ہو کتاب کا کیڑا مشہور ہے بلکہ بدنام ہے ہمیشہ زندگی سے بھاگ کر کتاب میں پناہ نہ لیتے رہو۔ ورنہ دل کا بھاگا ہوا قیدی ایک دن پھر بری طرح پکڑا جائے گا۔ علم و زندگی ایک دوسرے کے منافی نہیں۔

وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں۔ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور غور سے دیکھو تو انسان کتاب سے بہت زیادہ بڑی کتاب ہے۔ فلک پیما جو بلا شبہ اردو میں اپنی طرز کے بے نظیر انشا پرداز ہیں اپنے دلکش مضمون "بڑی کتابیں اور چھوٹے آدمی" میں لکھتے ہیں:۔

"کتابیں سب غلط ہیں انسان سب صحیح ہیں۔

انسان سچا اس لئے ہے کہ وہ اپنے جذبہ پرستش کو چھپاتا نہیں۔ کتابیں غلط اس لئے ہیں کہ وہ جذبۂ پرستش کے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا دعوے کرتی ہیں۔ کتابوں میں کچھ لکھا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ بہت کچھ لکھا ہوتا ہے مگر جو کچھ بھی ہو جہاں بھی ہو جتنا کم ہو یا زیادہ ہو بہت تاریک ہوتا ہے۔ بہترین کتابیں وہ ہیں جن میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ غریب کے ذمے امیر کا قرض ہے۔ بہترین غالباً وہ ہیں جن میں انسان کے ذمے خدا کا قرض درج ہو۔ خدا نے جب انسان کو تصنیف کیا تو صرف ایک ہی حکم دیا یعنی یہ کہ جو جی چاہے کر دیکھ مگر مجھ سے نہ پھر۔ ایک ماہر دہ ہے جو کہتا ہے کہ کتابیں سانپ ہیں انسان تریاق ہے۔ انصاف یہ ہے کہ کتاب اور انسان میں ایک بین فرق ہے۔ کتاب کو پیار کرو تو میٹھی ہو جاتی ہے مباداً تو جل جاتی ہے نکتہ چینی کرو تو بے بنیاد بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس انسان کو دنیا چھیڑ دے جس قدر ستاؤ جہاں تک ستاؤ اور بڑھتا ہے۔ انسان کو اس کا جذبۂ پرستش مرنے نہیں دیتا۔ کتاب چونکہ جذبۂ پرستش کو لفظی شکنجے میں کھینچتی ہے کبھی زندہ رہ نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا سب سے عظیم الشان کام یہ ہے کہ وہ اپنی کتابیں بدلتا رہے۔ بڑے انسان وہ ہیں جو ایسی کتابیں چھوڑ جائیں جنہیں داخل کرنے کے لئے سیکڑوں اور کتابیں لکھی جائیں۔ جن کے معنی اتنے وسیع ہوں کہ مشرق مغرب سب سما جائیں اور جن کی محبت میں گرفتار ہو کر لوگ کٹ کٹ مریں۔ چھوٹے آدمی وہ ہیں جن کی بات منقسم ہو اور اس کے معنی ایک ناول، ایک چھوٹا قصہ سنیں اور برباد کر لیں"۔ ــــ فلک پیما کا یہ پورا مضمون پڑھنے کے قابل ہے۔ انسان کی عظمت سے متاثر ہو کر ان لفظوں پر مضمون کو ختم کرتے ہیں کہ چھوٹے آدمیوں کی غلطیوں پر بڑی کتابوں کی ہزار صحت قربان ہے"!

جس طرح اوپر میں نے کتاب کی تعریف میں بعض مغربی مصنفوں کے اقوال نقل کئے اب اسی طرح ان کا کھینچا ہوا تصویر کا دوسرا رخ دکھاتا ہوں:۔

خبردار! ہشیار! کتابیں کہیں تم کو نگل نہ جائیں" (جان ذریلے) "جس طرح بعض دوستوں کی صحبت ضرر رساں ہوتی ہے اس طرح بعض کتابیں بھی مضر ثابت ہوتی ہے" (فیلڈنگ) "بعض کتابوں کو صرف چکھنا چاہئے بعضوں کو محض نگل جانا چاہئے اور چند در چند کو چبانا اور ہضم کرنا چاہئے" (بیکن) "کتابوں کو ہضم کرنا ضروری ہے ورنہ وہ ہمارے حافظے میں تو گھس جائیں گی لیکن ہمارے دلوں میں کبھی جگہ نہ پا سکیں گی" (رینیکا) "نئی کتابوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ہمیں پرانی کتابوں کے پڑھنے سے باز رکھتی ہیں" (ٹرویٹر) "جو کتاب بھی بار بار پڑھنے سے زیادہ دلکش معلوم نہیں ہوتی وہ قطعاً پڑھنے کے قابل نہیں" (کارلائل) "کتابوں کی بھی وہی صورت ہے جو عورتوں کی ہوتی ہے۔ انداز اور لباس میں ایک خاص تازگی زیادہ دل آویز ہوتی ہے بہ نسبت غازہ کی چمک اور مصنوعی چال ڈھال اور بھڑکیلے لباس کے جو ممکن ہے آن کی آن نظر کو فریب دے لیں لیکن جو کبھی دل کو نہیں موہ سکتیں" (ریحام)۔ "کچھ نئی کتابیں تو ہمیں پڑھنی پڑتی ہیں بعض معلومات کی خاطر اور بعض اس لئے کہ ہم جس زمانے میں رہتے

ہیں اُس کے ادب سے واقف رہیں لیکن میری رائے میں ایسی بہت سی کتابیں پڑھنے کی بجائے بہتر ہے کہ ہم ایسی کتابیں تھوڑی سے تھوڑی پڑھیں۔" (لارڈ ڈڈلے) سائنس میں ترجیح دو نئی سے نئی کتابوں کو، لٹریچر میں پرانی سے پرانی کتابوں کو۔ نئی کتابیں پرانے خیالات کو جِلاتی اور دوبارہ آراستہ کرتی ہیں۔ اس کے برعکس پرانی کتابیں نئے خیالات سُجھاتی اور تازہ کرتی ہیں۔" (بُلور لٹن) "کتابیں دوستوں کی طرح کم ہونی چاہئیں۔ لیکن احتیاط سے چُنی ہوئی۔ ہر وقت پڑھتے رہنے سے عقلمند بن جانے کی اُمید ایسی ہی ہے جیسے ہر وقت کھاتے رہنے سے مضبوط ہو جانے کی اُمید۔" (فُلر) "کتابیں بہترین چیزیں ہیں اگر اُن کا استعمال درست ہو بدترین چیزیں اگر اُن کا استعمال غلط ہو۔" (ایمرسن)۔ "خود کتابوں سے کتابوں کے استعمال کا طریقہ نہیں سیکھ سکتے بلکہ لوگوں سے میل جول ہی ہمارے خیالات کو عمل میں تبدیل کر سکتا ہے۔" (جانسٹن)

کتابوں کا مطالعہ کس طرح کرنا چاہئیے؟ خواجہ غلام السیدین نے اپنے ایک دلچسپ مضمون "کتابوں کی دنیا" میں (جو میری درخواست پر اُنہوں نے مجھے عنایت کیا اور جو ستمبر ۴۲ء کے ہمایوں میں شائع ہوا) پڑھنے کے لئے تین شرائط کا ذکر کیا ہے:۔ پہلی شرط یہ ہے کہ پڑھنے والے کی نظر اور سمجھ اُس پردے کو چاک کر سکے جو لفظ اور معنی کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ اگر پڑھنے والے کا تجربہ وسیع دماغ روشن اور دل نرم اور گداز ہے تو وہ ایک اچھی کتاب سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے ورنہ نہیں دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مختلف کتابوں کے لئے آدابِ شناسائی مختلف ہیں۔ بعض تو اس قابل ہی نہیں ہوتیں کہ اُنہیں منہ لگایا جائے۔ بعض محض سرسری مطالعہ کے قابل ہیں، اور بہت تھوڑی سی کتابیں ایسی ہیں جو انسانی دماغ کا بہترین شاہکار اور اخلاق و شرافت کا بہترین سرمایہ ہیں۔ ہر وہ کتاب بُری ہے جو زندگی کی لہر کو زیادہ تیز نظر کو زیادہ وسیع دماغ کو زیادہ روشن اور دل کو زیادہ گداز نہ کرے، جو اُمید کی بجائے یاس سربلندی کی بجائے سرنگونی کی طرف مائل کرے بقولِ اقبال:ــ

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو — شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ہر لحظہ نیا طُور نئی برقِ تجلّی — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

تیسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کتاب کو اس طرح سے پڑھنا چاہئیے۔ کہ وہ زندگی میں ایک خلّاق اور حرکت آفریں قوّت بن جائے۔ زندگی یقیناً سراسر عمل ہے۔ لیکن اس عمل کی ہدایت کے لئے اور اُس کو زیادہ کامیاب موثر اور دور رَس بنانے کے لئے علم کی ضرورت ہے جو تجربے یعنی بامعنی عمل کا ثمر ہے۔ علم کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ وہ عمل کی دست گیری کرے ادب کا مطالعہ اس وقت کامیاب کہا جا سکتا ہے جب ادب زندگی کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے۔ علامہ اقبال کے والدِ مرحوم نے ایک موقع پر اپنے ہونہار فرزند کو یہ نصیحت کی تھی کہ "بیٹا! جب کبھی تم قرآن شریف کا مطالعہ کرو تو اُس کو اسی طرح پڑھنا گویا وہ اُس وقت براہِ راست تم پر نازل ہو رہا ہے۔" ہر بڑی کتاب کو کم و بیش اسی جذبے اور کیفیت کے ساتھ پڑھنا چاہئیے۔ تب جا کر ادب کا مطالعہ زندگی کی اعلےٰ قدروں میں شمار ہو سکتا ہے۔" اپنے مضمون کے اخیر میں سیدین صاحب لکھتے ہیں کہ "ادب کا کام اور کتابوں کا احسان یہی ہے کہ وہ لوگوں کی انسانیت اور ہمدردی اور محبت کو وسیع کریں۔ اور اُن کے دل و دماغ کو تنگ نظری، تعصب اور بے انصافی کی یورش سے بچائیں۔ اگر کتابیں ایسا کریں تو وہ ہماری محسن ہیں ورنہ محض وقت گزارنے اور تفریح کا ذریعہ ہیں یا چارپائے بر معلومات کا بوجھ ہیں۔ کہ ان میں کوئی چیز بھی بہت قدر کے قابل نہیں۔"

کتابوں کے انتخاب میں وسعتِ نظر سے کام لینا چاہئیے۔ پُرانی اور نئی کتابوں میں، واقعیت پسند ادب اور

ردمان آمیز ادب ہیں۔ ان دونوں میں اصولاً ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا غلط ہے۔ اعتدال کا رستہ اور انتخاب کا طریقہ درست بھی ہے اور مفید بھی۔ اچھی چیز جس کسی کی ہو جہاں کہیں تمہیں ملے اسے اپنا لو اُسے اپنی فطرت کا جزو بنا لو تاکہ تمہاری فطرت قدرت کے خزانے پر حتی الوسع حاوی ہو سکے۔ تمہارے کل کی تربیت میں بیسیوں نہیں سینکڑوں قیمتی اجزا ہوں۔ تعصب حصولِ کمال کے لئے زہر قاتل ہے۔ وسعتِ نظر اطمینان دہ بھی ہے اور ترقی پرور بھی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم دوسروں کی رائے کے آگے ہتھیار ڈال دیں اور فیشن سے مرعوب ہو کر اپنی اپنی مدار رائے پر بیجا نا گنا ہ سمجھیں۔

ایک بات قابلِ غور ہے ہماری موجودہ دنیا اس قدر بڑی اور اس کی معلومات اس قدر وسیع اور اُس کی ضروریات اُس قدر متنوع ہو گئی ہیں کہ زندگی سے پوری طرح مستفید ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں اُس کے مختلف شعبوں سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل ہو۔ یعنی آج کل کی دنیا میں یہ لازم ہو گیا ہے کہ ہر شخص ایک حد تک ہرن مولا کا مرتبہ ہو۔ اس کے لئے اخبارات و رسائل کا مطالعہ لابدی ہے۔

مطالعہ کرتے وقت بعض امور کا دھیان رہے تو مفید ثابت ہو گا۔ توجہ، دلچسپی، مشکلات سے نہ گھبرانا، تیزی یا کر آہستگی سے پڑھنا مناسب وقت پر اور مناسب جگہ پر مطالعہ کرنا یہ اور کئی ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت ہم پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ کیا ہمیں اپنے مطالعہ کا ایک خاکہ بنا لینا چاہئے یا جو سامنے آ جائے پڑھتے جانا چاہئے؟ اس میں اختلاف رائے ہے، غالباً یہاں بھی اعتدال مفید ہو گا۔ بہتر یہی ہے کہ نہ انسان اپنے پروگرام کا غلام بن جائے اور نہ بے راہ روی شکار ہو جائے، بلکہ حالات کے مطابق یوں اپنی رہنمائی کرے کہ نہ بندشیں اُسے جکڑ دیں اور نہ وہ شترِ بے مہار ہو کر ہانک لیپے مارتا پھرے اور اسی کو لطفِ زندگی تصور کرے۔

کتب بینی کے سلسلے میں بہت سے اور امور ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا اور ڈکشنریوں کا مصرف، پبلک لائبریریوں کا استعمال اپنے کتب خانے کے لئے مختلف مضامین پر بہترین پرانی اور نئی کتابوں کا انتخاب، اور حال اپنی ان کتابوں کی حفاظت اور نگہداشت اور بیسیوں اور ایسی چیزیں ہیں جن کی طرف ایک تعلیم یافتہ کتاب پسند آدمی کو گاہے گاہے توجہ کرنی چاہئے یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ مطالعہ اور کتب کے متعلق حال کے مغربی ادب میں اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ اگر کسی کو ان کے پڑھنے کا خبط ہو جائے تو ممکن ہے کہ وہ کتابوں کے متعلق ان کتاب نما کتابوں ہی کے پڑھنے میں ایک عمر گزار دے اور اصلی کتابوں کی طرف کبھی رجوع نہ کرے۔ اس سے مجھے اپنا ایک تجربہ یاد آتا ہے کہ میں نے عمر بھر ناول بہت کم پڑھے ہیں اور ناولوں پر تنقیدی کتابیں بہت زیادہ پڑھی ہیں۔

کتاب اور زندگی کے موضوع پر غور کرتے ہوئے اخیر میں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہم ہندوستانی لوگ غیروں کے تمدن سے اس قدر متاثر ہو گئے ہیں کہ جس طرح ہمارا لباس ہماری معاشرت، ہماری اقتصادی زندگی ہمارے سیاسی خیالات زیادہ تر مغرب زدہ ہو چکے ہیں اُسی طرح شاید اُس سے بھی زیادہ ہماری زبان اور ہمارا ادب مغرب کی نذر ہو چکے ہیں۔

ہمارے کئی تعلیم یافتہ نوجوان انگریزی ٹٹ پٹ اور انگریزی لٹریچر میں زیادہ ماہر ہیں۔ لیکن اپنی زبان اور اپنے ادب سے اُنہیں بہت کم واقفیت ہے۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں کہ ہمارے اکثر تعلیم یافتہ اصحاب بے دھڑک انگریزی کے بڑے بڑے لفظ سمجھتے اور استعمال کرتے ہیں لیکن اپنی زبان کے اکثر الفاظ کو مشکل کہہ کر ان پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں؟ نا معلوم نہ جانے انگلش ہر وقت Environment ہمارے لئے آسان ہے لیکن ماحول سخت مشکل ہے (REALISM)

پسندیدہ ہے لیکن واقعیت، قابلِ اعتراض ہے ر) قابلِ قدر ہے لیکن "سیاسیات" ہماری نظروں سے گرا ہوا ہے۔ دراصل وجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی نظروں میں گرے ہوئے ہیں، ہمیں اپنی چیزوں کی قدر نہیں، پھر ہم جو ایک زمانے میں انتہا درجہ صلح پسند اور ملنسار مشہور تھے۔ اور اب بھی ذلت کی حد تک مغرب کی چیزوں کے مداح ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی زبان اور ادب اور طرزِ خیال پر اعتراض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج دوسروں کے غلام ہیں اور اگر ہمارے تعصب اور تنگ نظری کی یہی حالت رہی تو پھر ہماری آزادی کا دن بہت دور ہے اور ممکن ہے کہ ہماری تباہی کا وقت بہت قریب آجائے۔

ان حالات میں ہمارا فرض ہے کہ کم از کم وہ لوگ جو تعصب کی رَو میں بہ نہیں گئے جن کا ضمیر صاف ہے، جن کی نیت نیک ہے اور جن میں رواداری اور ہمدردی کا ذرا سا مادہ بھی موجود ہے وہ کم از کم ایک دیسی زبان مثلاً اردو یا ہندی یا کسی اور ہندوستانی زبان کو اپنائیں، اسے بخوبی سیکھیں، اس کی کتابیں پڑھیں، اس کے روزانہ اخبارات و رسائل خریدیں اور اس سے دلی محبت پیدا کریں۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں اور عوام سے ربط پیدا ہو کر وہ صحیح معنوں میں مفید شہری اور مفید انسان بن گئے ہیں۔ یہی ہے صحیح علمیت اور یہی ہے صحیح انسانیت!

بشیر احمد

(المنظر، لاہور ۱۶، نومبر ۱۹۴۵ء)

"سوچتا ہوں ...."

رات کے دامن میں ظلمت بھی مہ و پروین بھی
شامِ غم سے مل گئیں صبحِ مسرت کی حدیں
کون جانے میری منزل تیرگی یا روشنی

ٹوٹتے تاروں سے کھیلوں یا سحر کو ساز دوں
عشرتِ بزمِ شبستاں سے تلخیٔ کارِ جہاں
موت کو آواز دوں یا زیست کو آواز دوں

زندگی میرے لئے ہے نیش بھی اور نوش بھی
باعثِ آرائشِ محفل ہے یہ کیفِ تضاد
عشق کا سوزِ دروں بھی حسن کی آغوش بھی

غلام ربانی تاباں

غزل

موت نہیں ہے زیست ہے، درد نہیں دوا بھی ہے
یہ مرا مشورہ بھی ہے یہ مرا فیصلہ بھی ہے

عقل بہ این یقین و عزم، شرک میں مبتلا بھی ہے
فضلِ خدا پہ ہے نظر منتِ ناخدا بھی ہے

عہدِ وفا کے ذکر نے، اور تباہ کر دیا
وہ تو یہ کہہ کے چھٹ گئے کچھ مجھے سوچنا بھی ہے

آہ! وہ آنکھ جس میں ہیں یاس و اُمید ساتھ ساتھ
ہائے! وہ آہِ سرد جو شکر بھی ہے، گلہ بھی ہے

موت کی شکل دیکھ کر آدمی مطمئن نہ ہو
یعنی اِس انتہا کے بعد اور اک ابتدا بھی ہے

آپ کے عہد میں کہیں حُسن کو لوگ بے وفا!
آپ کو کچھ خبر بھی ہے آپ نے کچھ سُنا بھی ہے

میری نگاہِ شوق کو، اُن کی نگاہِ شوخ سے
پاس کی نسبتیں بھی ہیں دُور کا واسطہ بھی ہے

ماہر خوش بیاں کوئی نغمۂ جانفزا سُنا
پھول بھی ہیں کھِلے ہوئے چھائی ہوئی گھٹا بھی ہے

ماہر القادری

دوراہا

کھانے کے کمرے سے گول کمرے میں آتے ہی مہمانوں کے قہقہے اور بھی طویل ہو گئے۔ کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور کھلی آستینوں کا کرتہ پہنے راج رتنم اس محفل میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ میزبان کے فرائض ادا کرنے کے خیال سے ڈیسائی اُس کی بغل میں موجود تھا۔ اور اُس کی سب سے بڑی کوشش یہی تھی کہ باتوں کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے۔

میزبان سے لے کر ہر چھوٹا بڑا مہمان کھدر کی سفید دھوتی قمیص اور گاندھی ٹوپی میں ملبوس تھا۔ راج رتنم نے اپنے ننگے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محسوس کیا کہ اگر وہ بھی ایسی محفلوں میں گاندھی ٹوپی پہننے کا دستور بنالے تو بہتر ہوگا۔

عورتوں نے ایک سے ایک بڑھیا ساڑھی پہن رکھی تھی اور جہاں تک کنگھی چوٹی کا تعلق تھا۔ ڈیسائی کی بڑی لڑکی کلیانی سب پہ بازی لے گئی تھی۔ اُس کا جوڑا کچھ تکونہ سا اور ڈھلکا ڈھلکا نظر آرہا تھا۔ اور وہ اپنی چھوٹی بہن رینو کی طرف رُخ کئے بیٹھی جانے اُسے کیا سمجھا رہی تھی۔

راج رتنم گول کمرے کی نیلی دیواروں پر نظریں گھما کر سُرخ قالین کو گھورنے لگا۔ نیلے اور سُرخ رنگ کا تضاد اُسے بہت کھٹکا۔ پھر اس نے گہرے سُرخ گلاب کا جائزہ لیا جو کلیانی کے کالے چمکیلے جوڑے پہ آویزاں تھا اور جس کی داد دئے بنا یہاں کوئی موقع نہ مِل سکتا تھا۔

دیواروں کے نیلے رنگ اور سرخ قالین کے نقش و نگار پہ غور کرتے ہوئے راج رتنم کو کلیانی اور رینو کا تضاد بھی کھٹکنے لگا۔ کلیانی کیسی روشن دماغ لڑکی ہے۔ لیکن رینو بیٹھی شال بنتی رہتی ہے ——— پیلا شال۔

جب سے وہ یہاں آیا تھا کلیانی اُس سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی اور وہ یہ محسوس کرتا کہ کلیانی کو ڈیسائی سے دماغ اور مسز ڈیسائی سے حُسن ورثہ میں ملا ہے۔ کلیانی نے اُسے بتایا تھا کہ وہ ہر سال اپنا جنم دن مناتی ہے اور اُس روز سہیلیوں کے ہمراہ نیا فوٹو کھنچواتی ہے۔ اس گول کمرے کی دیواروں کا نیلا رنگ اُسے ناپسند تھا لیکن ماں کا دل رکھنے کے لئے وہ کبھی اعتراض نہیں کرتی۔ اُس کا بس چلتا تو نیا قالین منگواتی ——— گہرا سُرخ قالین جس پر نقش و نگار نظر نہ آتے۔ اب تو اُس کی پسند اُس کے لباس اور سنگھار ہی میں نظر آسکتی تھی۔ اپنا ایک بڑے سائز کا فوٹو اس نے راج رتنم کو بھی دیا تھا اور مسکراتے ہوئے کہا تھا اسے جاوا کے سفر میں اپنے پاس رکھئے۔

مہمان راج رتنم کی طرف تیکھی چتونوں سے دیکھتے اور پھر آپس میں اُلجھ جاتے۔ ڈیسائی گھبرا رہا تھا۔ کہیں راج رتنم یہ نہ سمجھے کہ یہ لوگ اُسے نظر انداز کر رہے ہیں۔

سب کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے ڈیسائی کہہ اُٹھا۔" وہ رہے بٹیل، شاعر، سلیٹھ اور دانی۔ یہی یہی نظموں سے زیادہ ان کے دان ہی مشہور ہیں آپ بنگال سیوا منڈل کے پردھان ہیں ——— اور وہ ہے راول کارپوریشن کے میئر، جو شاعری کو بکواس سمجھتے ہیں ——— اور اُدھر کونے میں عینک والے پاریکھ بھائی جو میرا کے بھگت ہیں۔

اور کہتے ہیں میرزا نے ہندی ادب کی نہیں گجراتی ادب کی خدمت کی اور یہ ہندی والوں کی زبردستی ہے کہ وہ اُسے اپنی شاعرہ تسلیم کرانے کی اوٹ پٹانگ کوشش کیا کرتے ہیں —— اور وہ جو اس وقت اپنی گاندھی ٹوپی اپنے ہاتھوں میں اُچھال رہے ہیں احمد آباد ٹاکیز کے پروپرائٹر جوشی ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ اردو، ہندی اور گجراتی اپنی اپنی جگہ خواہ جو رنگ بھی رکھتی ہیں۔ لیکن ہندوستان کی مشترکہ زبان ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے اور اس کی تکمیل نہ کانگرس کر سکتی ہے نہ آل انڈیا ریڈیو۔ اس کی کامیابی کا سہرا احمد آباد ٹاکیز کے سر پر ہی بندھنا چاہیے........"

راج رتنم مسکراتا جا رہا تھا۔ اور آنکھیں پھیلا پھیلا کر یہ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کے اعزاز میں بڑے بڑے مہمان تشریف لائے ہیں، وہ ان کا ممنون ہے۔ لیکن دراصل وہ یہاں سے اُٹھ جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ تو اپنی ہی باتوں میں مست تھے۔

ابھی تک راج رتنم کے ذہن میں گرم گرم کھانوں کی خوشبوئیں تیر رہی تھیں اور کھانے کے کمرے کا منظر اس کے تصور میں برابر اُبھر رہا تھا۔ دو طرف دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی ساگوان کی چوکیاں کتنی خوبصورت معلوم ہوتی تھیں اور جب سب لوگ بیٹھ گئے یعنی ایک طرف مرد اور ایک طرف عورتیں تو اُن کے سامنے ایسی ہی ایک ایک چوکی اور رکھ دی گئی اور ان پر تھال آنے لگے جن میں کھانا پہلے سے پروسا جا چکا تھا۔ چاندی کے تھال اور کٹوریاں، چمچے اور گلاس بھی چاندی کے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی ریاستی دعوت ہے۔ کلیانی نے جانے کیا سوچ کر کہہ دیا تھا۔ بنگال ابھی تک بھوکا ہے۔ اور مسز دیسائی اُسے ٹوکتے ہوئے کہہ اُٹھی تھی —— بس بس، کلیانی، تمہارا بنگال تو ہمیشہ بھوکا رہے گا۔

گول کمرے کی فضا چہ میگوئیوں سے بوجھل ہو رہی تھی۔ مسز دیسائی نے جوشی سے پوچھا: "کہئے، احمد آباد ٹاکیز کا نیا فلم کب تک آ رہا ہے؟"

جوشی کہہ اُٹھا: "بس اب آیا ہی سمجھئے، مسز دیسائی!"

کلیانی بولی: "کہانی کس کی ہے؟"

دیسائی نے لقمہ دیا: "یہ پوچھو کہ گانے کس کے ہیں اور ان کی دھنیں کس نے باندھی ہیں۔ کیونکہ ہمارے فلم تو گانوں کے بل بوتے پر کامیاب ہوتے ہیں۔"

اُدھر سے پاریکھ بھائی کہہ اُٹھا: "مجھے تو حیرانی ہوتی ہے کہ میرا کے گیتوں کی موجودگی میں گھٹیا بازاری قسم کے گانے کیوں لکھوائے جاتے ہیں۔"

جوشی نے ناک بھوں سکوڑی اور صفائی پیش کی: "میرا کے گیت ہر موقع پر تھوڑے ہی گائے جا سکتے ہیں۔ میرے ہاں ایک ایک گیت پر ہزار ہزار روپے ملتے جاتے ہیں۔"

کلیانی چمک کر بولی: "آپ کہنا چاہتے ہیں کہ میرا کو تو کسی نے پھوٹی کوڑی نہیں دی تھی!"

مسز دیسائی نے دیکھا کہ بدمزگی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ "چھوڑیئے چھوڑیئے" وہ کہہ اُٹھی "جوشی کا فلم آ رہا ہے، ہم خود دیکھ لیں گے۔"

دیسائی نے ہنس کر کہا: "جوشی کا فلم —— یہ بھی خوب رہی —— فلم نہ افسانہ نگار کا ہوتا ہے نہ مکالمے اور گیت لکھنے والے کا، نہ موسیقی ترتیب دینے والے کو یاد کیا جاتا ہے نہ ڈائرکٹر ہی کو۔ سارے کا سارا فلم پروڈیوسر کا، فلم

ہمیشہ تمہارا ہوتا ہے۔"

اس پر سب طرف سے قہقہوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ حتیٰ کہ جوشی بھی اُچھل اُچھل کر ہنسنے لگا۔ راج رتنم کے چہرے پر بھی خفیف سی مسکراہٹ لوچ دار ہنسی میں بدل گئی۔

اچانک دلیسائی نے کہا: "یہ تو آپ لوگ جانتے ہیں کہ راج رتنم نے ہندوستانی تمدن کے ترجمان کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ اب وہ جاوا کے ٹیگور میموریل کی دعوت پر وہاں تشریف لے جا رہے ہیں۔"

کلیانی نے شرارت سے کہا: "مزہ تو جب تھا کہ راج رتنم جاوا جاتے جب وہاں جاپانی قابض تھے۔ آج تو ہر شخص جاوا جا سکتا ہے۔"

مسز ڈلیسائی کہہ رہی تھی: "آج آپ نے خاص میری فرمائش پر روانگی ملتوی کی۔ اب کل کے جہاز سے وہ روانہ ہو رہے ہیں۔"

جوشی نے تھیلی پیش کرتے ہوئے کہا: "یہ ہمینٹ احمد آباد ٹاکیز کی طرف سے سولیکار کیجئے۔"

پھر دلیسائی نے سب کی طرف سے تھیلی پیش کی۔ اور مسز دلیسائی نے اُٹھ کر کہا: "ہم اپنے مہمان کی بہت خاطر نہیں کر سکے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ جب کبھی بمبئی آئیں ہمارے ہاں قیام فرمائیں۔"

کلیانی بولی: "راج رتنم یہ تھیلیاں بنگال کو دے دیتے جائیں۔ بھوکے بنگال کو ابھی مدد کی بہت ضرورت ہے۔ تینتالیس کے قحط کے اثرات ابھی تک باقی ہیں۔"

راج رتنم نے جھٹ کھڑے ہو کر کہا: "آپ نے یہ روپیہ مجھے دیا —— شکریہ۔ میں یہ روپیہ بنگال کو دیتا ہوں۔"

پٹیل نے اُٹھ کر کہا: "بنگال سیوا منڈل کی حیثیت سے میں راج رتنم کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن وہ یہ تھیلیاں اپنے پاس رکھیں۔ اتنا ہی روپیہ میں اُن کی طرف سے بنگال کو بھیج دوں گا۔"

کلیانی نے شرارت سے کہا: "اور اس میں بھی کیا حرج ہے کہ دونوں طرف سے بھوکے بنگال کو مدد مل جائے۔"

قہقہے بلند ہوئے اور کلیانی کی تجویز منظور کر لی گئی۔ پھر دلیسائی نے بات کا رُخ پلٹتے ہوئے کہا: "بندرگاہ کے اُفق پر کل مجھے کچھ مبہم سی تصویریں اُبھرتی محسوس ہوئیں۔"

"کیسی تصویریں؟" مسز ڈلیسائی نے پوچھ لیا۔

دلیسائی نے سنبھل کر کہا: "ناچ کی تصویریں۔"

مسز دلیسائی نے شرارت سے کہا: "اور ناچ بھی گربا سے ملتا جلتا —— جب تو تمہارا جی چاہتا ہوگا۔ کہ تم بھی ناچ میں شامل ہو جاؤ۔"

چاروں طرف سے قہقہے بلند ہوئے اور مسز دلیسائی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر سب لوگ رضامند ہوں تو صوفے کھسکا کر اسی جگہ گربا شروع کر دیا جائے۔ لیکن اُس کی تجویز قہقہوں کے نیچے دب گئی۔

دلیسائی نے راج رتنم کی تصنیف "نٹ راج" کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "راج رتنم نے نٹ کے دیباچہ میں اس بات کو خوب واضح کیا ہے کہ ہمارے ہاں رقص ہمیشہ تہذیب کا ترجمان رہا ہے۔ ہمارا گربا بھی تو پورا ناچ ہے۔ وہ گھڑا جس کے چاروں طرف سوراخ کر لیتے ہیں اور اندر دیا روشن کر دیا جاتا ہے شاستروں میں گربھ دیپ کہلاتا ہے اسے مرکز میں رکھ کر اُس کے گرد ناچتے ہیں۔ اسے سر پہ اٹھا کر ایک عورت ناچتی ہے۔ بدقسمتی سے شہروں میں گربا لفظی ناچ بن کر رہ گیا ہے۔ گاؤں کی طرح یہاں گربھ دیپ نظر نہیں آتا ہے۔ جیسے دیوی کا روپ مانتے ہیں اور

ناچ سے دیوی کو رجھانا منظور ہوتا ہے ہم تو یہاں یہ بھی بھول چکے ہیں کہ اسی گربھ دیپ سے گرتے پڑتے گربا اور پھر گربا رہ گیا۔ نٹ راج میں گربا کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہے۔

مسز دلیپائی کہہ اٹھی: "میں کل ہی نٹ راج کی ایک کاپی خرید لاؤں گی۔"

کلیانی نے نخوت سے کہا: "راج رتنم کی شخصیت اُس کی تصنیف نٹ راج سے بہت بلند ہے اور اس وقت وہ ہمارے درمیان موجود ہے۔"

مسز دلیپائی نے کلیانی کی طرف تیکھی چتون سے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو تعلیم کا مطلب گستاخی ہے تو کالج جانا چھوڑ دو، بھری مجلس میں تم میری ہتک پر اُتر آتی ہو۔

رینو کے ہاتھوں میں بدستور سلائیاں گھومتی رہیں۔ وہ پیلے رنگ کا شال بُن رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی زریں ساڑھی کی طرف دیکھنے لگتی۔ جیسے وہ کہنا چاہتی ہو۔ پیلا رنگ اور سنہری رنگ دونوں بھائی بھائی ہیں۔ کلیانی کی کالی ساڑھی کا کنارہ بھی پیلا ہے۔ پیلا رنگ بھلا کیسے ناپسند ہوگا۔

دلیپائی نے راج رتنم سے درخواست کی کہ وہ کوئی خوبصورت سا پیغام اس مجلس کو ضرور دیتا جائے۔ سب سے شوق جتایا۔ اور راج رتنم نے کہنا شروع کیا۔

"قدیم ہندوستانی رقص ایشیائی رقص میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ جاوا سماٹرا اور بالی کے رقص پر ہندوستانی اثر غالب نظر آتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب و تمدن نے دور دور تک فتح حاصل کی تھی۔ میں دعا مانگ رہا ہوں جہاں ہمارے بزرگوں کا ورثہ موجود ہے آج بھی ہندوستان دنیا کو بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ روحانیت کے بل بوتے پر ہم آزاد قوموں کی صف میں کھڑے ہو کر دکھائیں گے۔"

اہل مجلس کے سر فخر سے بلند ہو گئے۔ مسز دلیپائی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا: "ہندوستانی رقص زندہ ہے اور زندہ رہے گا ——— یہ اودے شنکر کا پیغام ہے جو اُس نے پچھلے ماہ اسی گول کمرے میں ہمیں دیا تھا۔ آج راج رتنم کا پیغام بھی مل گیا۔ روحانیت پر ہمیں ناز ہے۔ ہاں اسی کے بل بوتے پر ہم آزاد ہو سکتے ہیں۔"

کلیانی نے ماں کو گھورا جیسے کہنا چاہتی ہو، بڑی آئی ہے آزادی کی متوالی۔ کہو اس گھر میں کہاں تک آزادی دی جاتی ہے۔ اپنا حکم چلاتی ہو۔ تم نے تو پتا جی کو بھی غلام بنا رکھا ہے۔

نیلی دیواروں کی طرف دیکھتے ہوئے راج رتنم کو خیال آیا کہ "نیل ورن" عشق کا رنگ ہے، جیسا کہ پراچین پنڈت کہتے ہیں۔ ان مجلسوں میں عشق مچلتا ہے یہاں گربا ناچا جاتا ہے۔ پھر اُس کا دھیان رینو کے پیلے شال کی طرف گھوم گیا۔ جسے وہ توجہ ہی سے بُن رہی تھی۔ پیلا رنگ بھگوان کا رنگ ہے۔ جیسا کہ میں نے نٹ راج کے دیباچہ میں واضح کیا ہے۔ پھر اُس کی نگاہ اُس کی زریں ساڑھی پر ٹک گئی۔ شاستر کہتے ہیں سنہری رنگ شجاعت کا رنگ ہے۔ رینو نے تو فضول ہی یہ ساڑھی پہن رکھی ہے۔ کلیانی بہادر ہے زریں ساڑھی تو اُسے پہننی چاہئے۔

کلیانی اور اُس کی سہیلیاں دیوان پر یوں بیٹھی تھیں جیسے انہیں وہ ناچ پسند ہو جس میں گوپیاں پھول چنتی ہیں اور جنگل میں شہد کی مکھیوں سے بچتی بچاتی ندی کنارے بیٹھ کر منہ دھونے لگتی ہیں۔ پیچھے سے کسی کے قدموں کی چاپ سن کر گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں کنہیا کی طرف دیکھتی ہیں۔

اچانک ہاریکھ بھائی نے کہا: "یہ مشرق ہے اور مشرقی تہذیب کا تقاضہ ہے کہ پرائی عورت کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا

کرنہ دیکھے۔

عورتوں نے قہقہہ لگایا، جیسے کہہ رہی ہوں، "جب تو تم ہماری طرف بالکل نہیں دیکھتے۔"

پاریکھ بھائی نے پھر کہا: "ہم عورت کو دیوی سمجھ کر پوجتے ہیں۔"

"اور میرا کے گیت گاتے ہیں۔" جوشی نے چوٹ کی: "اور بھگتی اس میں ڈوب جاتے ہیں۔"

دیسائی بولا: "شاید بھگتی رس ہی کی وجہ سے ہم ہندوستانی اتنے حساس واقع ہوئے ہیں کہ کوئی غیر ملکی مصنف ہمارے خلاف ایک فقرہ تک لکھ دے۔ تو ہم کہنے لگتے ہیں کہ ہمیں ذلیل کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہم بہت سی باتوں میں سچ مچ ذلیل واقع ہوئے ہیں۔"

کلیانی نے بڑے فخر سے اپنا سر اٹھایا، جیسے کہہ رہی ہو: کبھی کبھی تو آپ پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ہوتا ہے جب آپ ماتاجی کی غلامی سے تھوڑے وقفے کے لئے آزاد ہو جاتے ہیں۔

جوشی نے شرارت سے کہا: "پاریکھ بھائی سے کوئی پوچھے کہ میرا کے گیت گا کر ہم کیسے آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔"

راج رتنم سمٹا سمٹایا بیٹھا تھا۔ اس نے سوچا یہ امیر لوگ ہر رنگ، ہر موضوع پر بول سکتے ہیں۔ یہ کہاں غلام ہیں! یہ تو آج بھی آزاد ہیں۔

جوشی کہہ رہا تھا: "ہم ایک ایسی کہانی لکھوانا چاہتے ہیں۔ جو ہندوستان کو جھنجوڑ کر رکھ دے۔"

کلیانی بولی: "میں نے بھی ایک ایسی کہانی لکھی ہے۔ آپ اسے پسند کریں گے۔ یوں دیکھئے ——— ایک لڑکی کھڑی ہے اس کے قریب سے بھوکوں کے قافلے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ لڑکی ان لوگوں سے نظریں ہٹائے دور افق کی جانب دیکھ رہی ہے۔ اس کے ذہن میں تصویریں ابھرتی اور مٹتی ہیں۔ گاؤں کے گاؤں اجڑ رہے ہیں۔ لیکن جب گاؤں سے آنے والے لوگ اس کے پاس سے گزرتے ہیں۔ وہ نہ ان کی طرف دیکھتی ہے اور نہ یہ سوچتی ہے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں ——— پھر ایک روز اس کا دماغ کروٹ لیتا ہے اور وہ دیکھتی ہے کہ شہر میں ان کا کیا حشر ہوا ——— اور پھر جب موت کے پنجے سے کسی نہ کسی طرح بچ کر آنے والے لوگ واپس آتے ہیں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ وہ لڑکی اسی طرح اپنی جگہ پر ابھی کھڑی ہے۔ سب یہی خیال کرتے ہیں کہ وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں۔ وہ اسے دیوی سمجھ کر اس کے قدموں میں جھک جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ کالی ہے کوئی کہتا ہے لکشمی ہے کوئی کہتا ہے کہ یہ تو بھارت ماتا ہے اور اپنی سنتان کے دکھ درد کا علاج سوچ رہی ہے ——— یہ لوگ چلے جاتے ہیں لیکن وہ وہیں کھڑی رہتی ہے۔ اور اس کے ذہن میں کچھ اور تصویریں ابھرتی ہیں ——— دیس میں انقلاب آ رہا ہے ——— اور یہ لڑکی بھی ایک قہقہہ لگاتی ہے اور ادھر ہی کو چل دیتی ہے جدھر صدیوں کا جمود ٹوٹ رہا ہے۔ اور نئی زندگی سانس لیا چاہتی ہے۔"

جوشی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بولا: "ہم اسے ضرور فلمائیں گے۔"

پاریکھ بھائی کہہ اٹھا: "میرا کا کوئی گیت اس میں ضرور رکھئے۔"

جوشی نے جیب سے چیک بک نکالی اور چیک لکھ کر کلیانی کو دیتے ہوئے کہا: "یہ ایڈوانس اسد آباد ٹاکیز کی طرف سے سویکار کیجئے۔"

کلیانی نے چیک لے لیا اور اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ پھینک کر کھڑی ہو گئی۔ بولی: "یہ سات ہزار کا چیک میں بنگال

کو دے رہی ہوں "

پھیل نے چیک لیتے ہوئے کہا: "میں بنگال کی طرف سے کلیانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں"

.... ندی کی سدا یاں اسی طرح چل رہی تھیں۔ جیسے نہ اس کے لئے وہ لڑکی حقیقت تھی نہ ہزاروں بھوکے ننگے انسان اور نہ یہ سات ہزار کا چیک جو کلیانی نے بنگال کو دے دیا تھا۔

راج رتنم جھنجھلا اُٹھا کہ وہ کہاں آ پھنسا۔ اس گول کمرے کی فضا میں ایک ہاری ہوئی تہذیب سسکیاں لے رہی تھی ناحق اُس نے رنگانگی کل پرلتوی کی۔ بھلا اُسے اس محفل میں کیوں گھسیٹا گیا۔

محفل پھر الگ الگ ٹولیوں میں بٹتی چلی گئی، جیسے دیکھتے ہی دیکھتے زمین کا وسیع ٹکڑا چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹ جائے۔ جاوا بھی تو ایک جزیرہ ہے۔ رتنم نے سوچا، کسی زمانے میں یہ ہندوستان کا حصہ تھا۔ بعد ازاں سمندر نے بڑھکر اُسے ہندوستان سے الگ کر دیا۔

راج رتنم نے اُٹھ کر اہلِ مجلس سے معذرت چاہی۔ سب اسے پرنام کر رہے تھے۔

کلیانی کو اپنا فرض یاد تھا۔ راج رتنم کو اُس کے کمرے تک چھوڑ آنے کے لئے وہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ بولی، - "گجرات میں کہتے ہیں —— جو جائے جاوے تو پاچھے نہیں آوے۔ نے جو آوے تو پری آپری آموتی لاوے —— یعنی جو جاوا جاتا ہے لوٹ کر نہیں آتا۔ اور آتا ہے تو اتنے موتی لاتا ہے کہ پشت بہ پشت ختم نہیں ہوتے "

راج رتنم جو چلتے چلتے کہا: "ہمارے سوداگروں کے اپنے جہاز ہوتے تھے۔ جہاز رسانی کی طرف پہلے پہل ہندوستان ہی نے تو توجہ دی تھی "

کلیانی کہہ رہی تھی: "موتی رولنے کا شوق ہمیں کہاں کہاں لے جاتا ہے"

راج رتنم نے صفائی پیش کی: "آج جاوا کو میری ضرورت ہے "

کلیانی کہہ اُٹھی: "لیکن جاوا سے کہیں زیادہ آج ہندوستان کو آپ کی ضرورت ہے "

وہ کمرے کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ کلیانی ہمہ تن گوش تھی۔ لیکن راج رتنم خاموش کھڑا رہا۔

کلیانی نے اجازت لی اور دور سے بڑے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے، جہاں مہمان اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر چلے جا رہے تھے، اپنے کمرے کی طرف گھوم گئی۔

مجھ سے تو رینو ہی اچھی ہے، راج رتنم نے سوچا، میں کیوں اپنے آدرش سے بھٹک جاتا ہوں؟ رینو بیٹھی پیلا شال بنتی رہتی ہے۔ اُس کی سلائیاں کبھی نہیں تھمتیں۔

ان محفلوں میں مجھے کبھی کبھار ہی شامل ہونا چاہئے، اُس نے فیصلہ کیا، میرا وقت میری سب سے بڑی دولت ہے، آخر اسے ہر گھڑی لٹاتے رہنے سے کیا حاصل؟

...... چاروں طرف سمندر ہی سمندر، جیسے جہاز جاوا کی طرف جا رہا ہو —— لیکن اُس کا ذہن بنگال کی طرف گھوم گیا۔ پولیس شہر کے بنگالیوں کو کلکتہ سے دور بھگا رہی تھی۔ اُسے کون روک سکتا تھا؟ اُسے کلیانی بھی نہ روک سکتی تھی۔

اب اگر احمد آباد ٹاکیز کا پروپرائیٹر بمبو کے بنگال کا منظر اپنے فلم میں پیش کرے گا۔ تو اس لئے نہیں کہ اُسے بنگال سے ہمدردی ہے۔ اُس کا تو محض ایک ہی مقصد ہے۔ وہ پیسہ کمانا چاہتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ یہ لوگ افسانے کیسے حاصل کرتے ہیں۔ کلیانی کی جگہ یہ افسانہ کوئی غریب بدصورت لڑکی پیش کرتی تو شاید اُسے سات روپے بھی نہ دیئے جاتے۔ کلیانی محفلوں کی تتلی ہے اور ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ دلیسائی کی بیٹی ہے۔ یہ لوگ ہندوستان کی قدیم عظمت سے بے بہرہ ہیں۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ فلم کی ایجاد کا جھلکیوں کے تماشے (SHADOW PLAYS) سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ جاوا میں جھلکیوں کا تماشہ آج بھی زندہ ہے۔ اگرچہ ہندوستان میں یہ فن بہت حد تک مر چکا ہے۔ لیکن جاوا میں یہ فن ہندوستان ہی سے تو گیا تھا —— اور گھوم پھر کر اُس کا ذہن مسز دلیسائی کو کوسنے دینے لگا۔ کمبخت نے کھانے کے کمرے میں کیسے کلیانی کو ٹوک دیا تھا کہ بنگال ابھی تک بھوکا ہے۔

وہ اُٹھ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا جہاں چاندنی آبشار کی طرح اندر آ رہی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کلیانی کی آواز کہیں سے گونج اُٹھی ہے —— ماں کو بُرا بھلا مت کہو، راج رتنم۔ ماں بیٹی کا رشتہ میں خوب سمجھتی ہوں —— اُس نے جھنجھلا کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دماغ میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔

کسمساہٹ کی حالت میں وہ کھڑا رہا جیسے رینو کی سلائیاں اُس کے دماغ میں کھٹکھٹا رہی ہوں۔ اُدھو۔ رینو تو بیوقوف سی لڑکی ہے۔ کلیانی سے اُس کا مقابلہ ہی کیا! ایک فلم کہانی کے سات ہزار روپے صرف کلیانی ہی کو مل سکتے ہیں۔ رینو کو ملتے تو وہ اُون خرید لاتی۔ اور عمر بھر بیٹھی شال بنتی رہتی۔ کلیانی کی کیا بات ہے۔ اُٹھ کر سات ہزار کا چیک بنگال کو دے دیا۔ مسز دلیسائی کا بس چلتا تو اُسے اُلٹی ہی پٹی پڑھاتی۔

وہ اپنے پلنگ پر آ بیٹھا اور سوچنے لگا۔ کہ میں نے اپنی تھیلیاں ناحق بنگال کو دے دیں۔ یہ روپیہ مجھے ملا تھا۔ تو مجھے ہی اسے خرچ کرنا چاہئے تھا۔

قریب تھا کہ اُس پر جمود کی کیفیت طاری ہو جائے۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اُس نے بڑے بڑے دُکھ دیکھے تھے۔ اور جب سے اُسے شہرت نصیب ہوئی اُسے امیر میزبانوں سے واسطہ پڑا۔ ان کے لئے تو معمولی بات ہے کہ ذرا سی مہمان نوازی دکھا دی۔ لیکن مہمان کی شخصیت پر یہ ذرا سی مہمان نوازی بھاری چٹان کی طرح گرتی ہے۔ میں بھی کتنا بیوقوف ہوں۔ اسی روپے سے میں جاوا میں امیر سیاح کی طرح گھوم سکتا تھا۔ بنگال کی بھوک صرف میرے روپے سے تو دور ہونے سے رہی۔

...... پانی ہی پانی جیسے جہاز پانی چیر رہا ہو —— جاوا پہنچ کر مجھے ہندوستان کا پیغام دینا ہے۔ جاوا جہاں ہندوستان کے سوداگر موتی بیچنے جاتے تھے —— جاوا جہاں آج بھی ہندوستانی ناچ زندہ ہیں۔ اپنی تقریروں میں جاوا والوں سے میں کہوں گا۔ کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں ہندوستان مُردہ ہو چکا ہے۔ لیکن جاوا تو زندہ ہے۔ اور جاوا کی زندگی کسی زمانے میں ہندوستان کی دین تھی۔ آج ہندوستان جاوا کی زندگی سے زندہ ہو سکتا ہے۔

اُس وقت کلیانی کے الفاظ اُس کے دماغ میں گونج اُٹھے —— جاوا سے کہیں زیادہ آج ہندوستان کو آپ کی ضرورت ہے۔ اُدھو۔ یہاں کیسے میری ضرورت ہے؟ چٹیل کو، جس کی نظمیں بکواس ہیں۔ اور زندہ بھی ہے تو اُس کی دولت کے بل بوتے پر —— وطن۔ اُدھو —— پہلے لوگوں کو خوب لوٹو۔ پھر اس لوٹ میں سے تھوڑا سا دان کر دو

اوہ۔ یہ کیسا دان ہے؟

وہ پھر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اور ایک انگڑائی لے کر لیٹ گیا۔ وہ چاہتا تھا بٹن دبا کر بجلی بجھا دے۔ لیکن وہ چت لیٹا قمقمے کی طرف دیکھتا رہا۔ آئینے میں اُسے اپنے بال نظر آ رہے تھے۔ اُسے خیال آیا کہ اتنے برس یونہی گزار دیئے۔ بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ تھوڑا بہت لکھ ڈالا۔ تقریریں کیں اور بس —— یہ بھی آخر کیا زندگی ہے؟ لیکن پھر اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے وہ اُن لوگوں کو کوسنے لگا جن سے آج دعوت پر ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بھی کیا کرتے ہیں؟ اُسے اپنے میزبان پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ پھر اُس کے ذہن میں نمک کا ڈھیلا ابھرنے لگا۔ جیسے یہ کہہ رہا ہو —— تم تو نمک حرام ہو۔ سے جلتے ہو۔ اپنے میزبان کو کون بُرا بھلا کہتا ہے؟ اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس کے منہ کا ذائقہ کسیلا ہو گیا ہے۔

نیند اپنا مورچہ چھوڑ کر جانے کدھر بھاگ گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پلکوں کے کواڑ بند کرنے لگا۔ جیسے کہیں سے جوشی کی آواز کڑک اُٹھی۔ وہ احمد آباد ٹاکیز کے فنکاروں اور اداکاروں پر گرج رہا تھا۔ اور اگلے ہی پل جیسے ان گنت روپے گھنن گھنن کر اُٹھے ہوں۔ فنکاروں اور اداکاروں کی کمائی وہ اپنی جیب میں اُنڈیل رہا تھا۔ اُس نے سوچا اب جب وہ کلیانی کی کہانی فلمائے گا تو اتنے ہی روپے پھر اُس کی جیب میں آ جائیں گے۔

وہ نیند کے دھارے میں بہہ گیا۔ .... وہ کھیتوں کی طرف سُبک خرامی سے چلا جا رہا تھا۔ جن کا اگلا سرا کسی انجان دوشیزہ کے اُڑتے ہوئے آنچل کی طرح افق کو چھو رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رُک گیا، جہاں زمین میں ان گنت سوراخ نظر آ رہے تھے۔ اور جہاں ایک لڑکی سر اُٹھائے کھڑی تھی۔ اتنا انہماک۔ اُفق کی طرف جانے وہ لڑکی کیا دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اُسے پکارا۔ وہ متوجہ نہ ہوئی۔ پرے سے لوگوں کے قافلے آئے اور گزر گئے۔ لڑکی اُسی طرح کھڑی رہی اور وہ بھی تو لڑکی کے پاس اُسی کے انداز میں کھڑا ہو گیا تھا ....

وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ یہ خواب نہ تھا۔ کلیانی کی کہانی کا اصلاح شدہ خاکہ تھا وہ چاہتا تھا۔ کہ اسی وقت جا کر کلیانی سے کہے کہ اکیلی لڑکی تو کہانی میں گہرائی پیدا نہیں کر سکتی۔ ایک نوجوان کا رول نہایت اہم ہے اور اگر اس لڑکی کے رول کے لئے اُسے ہی چنا جا رہا ہو تو وہ اس نوجوان کے رول کے لئے اپنا نام دے سکتا ہے —— لیکن جاوا کون جائے گا؟ اوہ۔ فلم کمپنی کی نوکری میں کیسے قبول کر سکتا ہوں؟ مجھے میرا آدرش بلا رہا ہے۔ میں جاوا جانے کا ارادہ کیسے ترک کر سکتا ہوں؟

وہ بے خیالی سے آئینے کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے دماغ میں ہزاروں آوازیں گونج اُٹھیں۔ جیسے سارا ملک اُس پر لعن طعن کر رہا ہو —— [illegible] ہم تو سمجھتے تھے تم غیر ملکوں میں ہندوستان کا نام روشن کرو گے۔ تم تو احمد آباد ٹاکیز کے ایکٹر بن کر رہ گئے۔

اُس کے دماغ میں لاوا اُبل رہا تھا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی بھی شرط پر اپنے آپ کو ایکٹر کی سطح پر نہ اُترنے دیگا اُسے اپنے جسم میں عجیب تھکن اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے وہ ایک ہفتے سے اِسی پلنگ پر بیمار پڑا رہا ہو۔ اُسے محسوس ہوا کہ خون کی رفتار کدھر جا رہی ہے۔ اور سانس کی رفتار کدھر۔ وہ پریشان تھا۔ اور سکون کے لئے تڑپ رہا تھا۔

آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر اُسے گھن سی آنے لگی۔ اور وہ اُٹھ کر کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ رات کی رانی کے پھولوں کی تیز خوشبو کا جھونکا اُس کے ناک کو چھو گیا۔ چاند کی طرف دیکھنے کو طبیعت نہ ہوئی —— نہ اُس نے ستاروں کو

گھومنے کی ضرورت محسوس کی۔ وہ چاندنی کی گہری گہری سلوٹوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اُسے یوں محسوس ہوا کہ پیڑ دل کی بُو رات کی رانی کی خوشبو میں تحلیل ہو رہی ہے۔ ضرور جوشی کی کار سے یہ پیڑ دل گرا ہو گا۔ اُس کے تخیل میں گونج سی پیدا ہوئی۔ جوشی کا چہرہ اُس کی آنکھوں میں بکھر گیا۔ لنگور رہے لنگور۔ کبھی تو وہ بھی آئینے میں اپنی صورت دیکھتا ہو گا۔ میں جاوا کو ہندوستان کا پیغام سنانے جا رہا ہوں۔ کیا اُس میں اس لنگور کا پیغام بھی شامل ہے؟

وہ پھر پلنگ پر آ بیٹھا۔ ایک انگڑائی لے کر وہ لیٹ گیا اور نیند کے دھارے میں بہ گیا —— ایک عورت اُسے بُلا رہی تھی —— اور دیکھو میرا بچہ مر رہا ہے۔ تم ہمارے گاؤں آئے تھے تو اسی کے سر پر ہاتھ پھیر کر تم نے کہا تھا۔ یہ بھی رابی بنے گا —— وہ اس کا کندھا پکڑ کر کھڑی ہو گئی اور بولی —— میرا بچہ مر گیا۔ تمہارا آشیرباد کسی کام نہ آیا۔ یہ اُس کی لاش پڑی ہے۔ لیکن تم تو اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ . . . . . . پھر اُسے ٹیگور کا چہرہ افق پر اُبھرتا نظر آیا۔ آہستہ آہستہ یہ قریب آ گیا۔ ٹیگور رو رہا تھا —— میرے گیت فنا ہو رہے ہیں۔ اُن کے گانے والے ہی نہ رہے تو وہ اب کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟ . . . . وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ آج میں کیسے کیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔

اب جو اس کی آنکھ لگی تو وہ سیدھا جاوا جا پہنچا۔ جاوا کی نرتکی ناچ رہی تھی۔ یہ تو کوئی دیو داسی معلوم ہوتی تھی۔ ناچ ختم ہوتے ہی وہ اُس کے قریب آ کر ہنس پڑی —— پردیسی، تم کدھر سے ٹپک پڑے؟ دیس میں کوئی کام نہ ملا کیا جو چلے آئے؟ . . . . ایک جگہ جاوا کے منبر پر کسی کی تقریر ہو رہی تھی۔ جونہی مقرر نیچے اُترا وہ خود منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مخاطب کرنے لگا۔ ہجوم کا شور بلند ہوا۔ بڑا آیا ہے خطیب۔ یہ ہمیں کیا بتائے گا؟ ہمارے اپنے خطیب زندہ رہیں۔ کوئی ہندوستانی معلوم ہوتا ہے —— ہاں بابا، آج کل ہندوستانی خطیب ہم پر بُری طرح ڈورے ڈال رہے ہیں . . . .

اور آنکھ کھلنے پر اُس نے دیکھا کہ وہی کمرہ ہے اور وہی پلنگ۔ رات کی رانی کی خوشبو پر وہ بُری طرح جھنجلا اُٹھا اور کالیانی کی آواز ایک بار پھر اُس کے ذہن میں گونج اُٹھی —— جاوا سے کہیں زیادہ آج ہندوستان کو آپ کی ضرورت ہے۔

بجلی کا بٹن دبا کر اُس نے کمرے میں اندھیرا کر دیا۔ کھڑکی کے راستے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ کمرے کے ایک کونے میں اُسے ایک اُداس چہرہ نظر آ رہا ہے۔ جیسے یہ شرت کا چہرہ ہو۔ فضا میں ایک سسکی گونج اُٹھی اور اب شرت کی آواز صاف سنائی دینے لگی —— بیکار چلے گئے میرے ناول۔ لوگ تو مر رہے ہیں۔ میرے ناول کون پڑھے گا . . . . . . وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ غور سے دیکھا تو کہیں کوئی چہرہ نظر نہ آیا۔ نہ کوئی آواز سنائی دی۔ اُس نے سوچا، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اُس کے تحت الشعور میں ہندوستان اور جاوا کے منظر بُری طرح خلط ملط ہو رہے تھے —— لاکھوں دیکھے ان دیکھے منظر!

اُس نے بٹن دبا کر روشنی کی اور بکس سے "ابدی جاوا" نکال کر تصویریں دیکھنے لگا۔ اُسے یک گونہ سکون سا محسوس ہوا۔ ایک لڑکی کا چہرہ تو بہت کچھ کالیانی سے ملتا تھا۔ لپک کر وہ بکس میں سے کالیانی کا بڑے سائز کا فوٹو نکال لایا۔ نہ جانے، پھر اُسے یقین۔ ہاں جاوا کی لڑکی ذرا نٹ کھٹ معلوم ہوتی ہے اُس نے جاوا کی بیسیوں تصویریں نکال کر دیکھیں لیکن اُس کا ذہن تو اسی نٹ کھٹ لڑکی سے چپک گیا تھا۔ اُس نے کتاب بند کر دی اور کالیانی کی تصویر بھی بکس میں رکھ آیا۔ پاگل نہ بنوں اور سو جاؤں۔ بٹن دبا کر اُس نے پھر اندھیرا کر دیا۔

اُس کے ذہن میں طرح طرح کی تصویریں اُبھر رہی تھیں —— دلہنیں اور کنواریاں ندی سے گھڑے بھر

گاؤں کی جانب آ رہی ہیں۔ پگ ڈنڈی پر ٹوٹے ہوئے گھڑوں کے ٹکڑے جانے کیا کیا کہانیاں سنا رہے ہیں۔ آج ان پنہاریوں کے چہرے اداس کیوں ہیں؟ نینوں سے کاجل کیوں ڈھلک گیا؟ گھڑوں کا توازن بھی تو قائم نظر نہیں آتا......... گھڑے ایک ساتھ گر پڑتے ہیں۔ وہ عورتیں کہہ رہی ہیں —— تم نے ہمیں دیکھا، ہمارے حسن کی تعریف کی کئی بار ہمارے گھڑوں سے پانی پیا۔ آج تم نے ہماری مدد نہ کی..........

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی .... کلیانی اہلِ مجلس کو کھری کھری سنا رہی تھی۔ —— تم میں سے لکھ پتی اور کروڑ پتی چاہتے تو ٹرک بھر بھر کر بنگال کے قحط زدہ لوگوں کو گجرات میں لا سکتے تھے۔ لیکن آپ نے تو دو دو چار چار ہزار کا چندہ بھیج کر یہی سمجھ لیا کہ بس فرض پورا ہو گیا۔ اور کس ملک میں یہ چیز برداشت کی جاتی ہے؟ پھر یہ دعویٰ کہ ہندوستان دنیا کو بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔ کیا سکھا سکتا ہے؟ یہی نا کہ ہم نے عورتوں کو بکنے دیا۔ بچوں اور بوڑھوں کو مرنے دیا۔ دنیا کہے گی کہ تم نے خود عورتوں کو بیچا اور اپنے ہاتھوں سے بچوں اور بوڑھوں کے گلے گھونٹے۔ کبھی تو یہ بھیک منگے کسان تھے آؤ ان کے منہ میں لقمے ڈالیں .... اور وہ اس مجلس سے اٹھ کر دور نکل گیا جہاں فضا میں گھومتی ہوئی روحیں رات کی تاریکی میں خوفناک پتلیاں اور پنجر دکھا دکھا کر ڈرانے لگیں۔ وہ دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ روحیں اس کا تعاقب کرنے لگیں —— سن او جانے والے، ہمیں زندوں سے نفرت ہے۔ تم لوگ بھی اتنے ہی مردہ ہو۔ جتنے کہ ہم رحم ہمدردی اور محبت کے سوتے خشک ہو چکے ہیں.......... اور روحوں کے کارواں اس کے گرد منڈلا رہے تھے —— بوڑھے جوان بچے۔ ان کی بھیانک چیخیں اسے پریشان کر رہی تھیں ....

وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے ہنسنے کی کوشش کی اور سوچا کہ انسانیت ختم ہو گئی۔ وہ بھی مر گئے۔ اور ہم جو زندہ ہیں۔ ہم بھی دراصل کہاں زندہ ہیں؟ کتنے ٹیگور کتنے نذرتِ خاک میں پنہاں ہو گئے! لیکن اپنے دل دماغ کو دھوکا دیتے ہوئے اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ جاوا ضرور جائے گا۔

نیند آئے نہ آئے، اس نے سوچا اب میں اٹھ کر نہیں بیٹھوں گا۔ ایک بار پھر آنکھ لگ جائے تو سر ذرا ہلکا ہو جائے اور اب جو اس کی آنکھ لگی تو کچھ اس طرح جیسے کوئی گہرے پانیوں میں ڈبکی لگائے اور باہر کے شور سے بے نیاز ہو جائے.....

وہ پانی سے باہر نکلا تو سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی —— وہی افق کی طرف دیکھتی ہوئی لڑکی۔ وہ روحیں جو اسے تنگ کرتی رہی تھیں، کہیں نظر نہ آتی تھیں۔ یہ لڑکی کب تک اس طرح کھڑی رہے گی۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ یہ گوشت پوست کے جسم والی لڑکی نہیں بلکہ کسی فنکار کا تراشا ہوا مجسمہ ہے جسے اس نے یہاں کچھ اس طرح نصب کر دیا ہے کہ دیکھنے والے کو اصل کا دھوکہ ہونے لگے۔ وہ قریب جا کر اسے چھونا چاہتا تھا۔ لیکن پھر اسے خیال آیا شاید اس میں کوئی ایسی برقی رو دوڑ رہی ہو۔ جو مجھے ہمیشہ کے لئے جھلس دے۔ وہ دور سے اسے دیکھتا رہا۔ یہ ضرور کوئی مجسمہ ہے۔ یہ زندہ لڑکی کیسے ہو سکتی ہے؟ اب تک وہ تھک چکی ہوتی .... اور پھر اس کی حیرت کی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ سب روحیں جو اسے تنگ کرتی رہی تھیں۔ اب اس لڑکی کے گرد ناچ رہی ہیں۔ بچے بوڑھے جوان سب ناچ رہے تھے۔ لڑکی اسی طرح کھڑی تھی —— وہ افق کی طرف دیکھتے ہوئے۔ روحیں اسے بھی بلا رہی تھیں۔ وہ کہیں چھپ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس میں بھاگنے کی سکت نہ تھی۔ یہ لٹی ہوئی تہذیب کا ناچ ہے، اس نے سوچا، اور یہ اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک کوئی نئی تہذیب جنم نہیں لیتی۔ لڑکی افق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے نئی تہذیب کا انتظار ہو......... یکایک وہ روحیں

غائب ہو گئیں۔ اور اگلے ہی لمحے اُس نے حیرت سے دیکھا کہ کلیانی وہاں آ نکلی اور جیسے وہ اب اُسے پہچانتی ہی نہ ہو، وہ اُس لڑکی کے گرد ناچ رہی تھی۔ وہی پیلے کنارے والی کالی ساڑھی اور وہی کالا چمکیلا، تکونہ سا، ڈھلکا ڈھلکا جوڑا جس پر گہرا سُرخ ادھ کھلا گلاب آویزاں تھا . . . . . . شاید یہ اس ناچ ہی کا کوئی جادو تھا کہ وہ لڑکی غائب ہو گئی اور اب اُس لڑکی کے انداز میں خود کلیانی کھڑی ہو گئی تھی۔ اور وہ اُس کے قریب جاتے جھجکتا تھا . . . .

راج رتنم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دروازے پر دستک دی جا رہی تھی۔ اُس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ کلیانی اور رینو تیار ہو کر آ گئی تھیں۔

راج رتنم جھینپ کر رہ گیا۔ بولا: "آپ بھی سمجھتی ہوں گی کہ میں کتنا سُست ہوں"

"ہاں ہاں" کلیانی نے رینو کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا: "آپ شاید آج بھی جاوا نہیں جا رہے، راج رتنم!"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!" راج رتنم نے چمک کر کہا: "سامان تو کل کا بندھا پڑا ہے اور میں بس تیار ہوں"

رینو کے ہاتھوں میں اُسی طرح سلائیاں گھوم رہی تھیں۔ جیسے وہ رات بھر یہ پیلا شال بنتی رہی ہو۔ راج رتنم نے اُس کی طرف کھبتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا: میں بھی تو رات بھر سپنے بنتا رہا ہوں ——— اپنا پیلا شال!

کلیانی نے رینو سے سلائیاں چھینتے ہوئے کہا: "دیکھو، رینو، تمہاری یہ عادت مجھے ناپسند ہے۔ کیوں یہ پیلا شال کسی نمائش میں بھیجو گی؟"

رینو منہ سے کچھ نہ بولی۔ اور کلیانی سے سلائیاں واپس لے کر پھر شال بُننے لگی۔ راج رتنم کو دونوں بہنوں کا تضاد بہت کھٹکا۔ لیکن وہ ایسے کسی موضوع پر بحث کرنے کو تیار نہ تھا۔

کلیانی کہہ رہی تھی: "تو آپ جاوا ضرور جا رہے ہیں؟"

راج رتنم بولا: "ہاں ہاں کلیانی۔ میں کیسے رُک سکتا ہوں؟"

رینو کی سلائیاں اور بھی تیز ہو گئیں، جیسے وہ کہہ رہی ہو، مجھے نہ راج رتنم کے جاوا جانے سے دلچسپی ہے نہ کلیانی کے جاوا نہ جانے سے۔

کلیانی کہہ رہی تھی: "تو ابدی جاوا مجھے دیتے جائیے؟"

رینو نے سر اوپر نہ اُٹھایا۔ اُس کے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ تمہاری یہ بھیک مانگنے کی عادت مجھے بالکل ناپسند ہے، کلیانی! کہو تم میں اور اُن بنگالی بھکارنوں میں کیا فرق ہے؟

راج رتنم اُٹھ کر ابدی جاوا نکال لایا اور اسے کلیانی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا: "لیجئے۔ شوق سے اسے پڑھئے!"

کلیانی کہہ اُٹھی: "میں اسے ختم کر کے دم لوں گی"

رینو نے سلائیاں تیز کر دیں۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ تو تم بھی اسے پڑھنے کے بعد جاوا جانے کی تیاری کرو گی اور یہ کتاب مجھے دیتی جاؤ گی ——— میں اسے لینے سے صاف انکار کر دوں گی۔

راج رتنم کہہ رہا تھا: "میں نے ابھی تک جاوا نہیں دیکھا"

کلیانی بولی: "اور میں نے بنگال کب دیکھا ہے؟"

رینو کی سلائیاں اور بھی تیز ہو گئیں، جیسے کہہ رہی ہو "تم دونوں تو پاگل ہو اور مجھے تمہاری باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔"

کلیانی کہہ رہی تھی۔ "بنگال بھوکا ہے۔ تینتالیس کے قحط کے اثرات نہ جانے کب تک باقی رہیں گے۔"

راج رتنم نے کچھ جواب نہ دیا۔ کلیانی نے پھر کہا: "جاوا تو آپ جا رہے ہیں، راج رتنم! لیکن بنگال آپ کا تعاقب کرے گا۔"

راج رتنم جانے کیا سوچ کر بولا: "وہ تمہاری فلم کہانی بڑی عجیب چیز ہوگی۔"

کلیانی نے وضاحت کی: "وہ تو یونہی ایک چھوٹا سا خیال ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ڈائرکٹر لوگ اسے کیسے پیش کرتے ہیں۔"

رینو کی سلائیاں سست پڑ گئیں۔ جیسے وہ پوچھنا چاہتی ہو کہ بنگال کے بھکاریوں کا منظر بنگال میں جا کر تیار کیا جائے گا۔ یا یونہی یہاں کے لوگوں کو بھکاریوں کے کپڑے پہنا کر کام چلا لیا جائے گا۔ پھر جیسے خود ہی اسے اپنی بات بے معنی معلوم ہوئی۔ اور پھر اسی رفتار سے سلائیاں گھومنے لگیں۔

راج رتنم کہہ رہا تھا: "انقلاب کا یہ مطلب بالکل نہیں، کلیانی، کہ قدیم ہندوستان کی روح کا خیال ہی نہ رکھا جائے۔ ہر تشکیل دراصل ایک تجدید ہی تو ہوتی ہے۔ تمہاری کہانی کا کلائمیکس ابھارتے ہوئے فلم والوں کو اس بات کا ضرور دھیان دینا چاہئے۔ تم اُن کی مدد کر سکتی ہو۔"

دلیسائی اور مسز دلیسائی تیار ہو کر آ گئے۔ اور اس بات پر زور دینے لگے کہ جہاز کا وقت قریب ہے۔

کار تیار تھی۔ مسز دلیسائی، رینو اور کلیانی پچھلی سیٹوں پر جا بیٹھیں اور راج رتنم کو سامنے کی سیٹ پر بٹھا کر دلیسائی نے کار باہر نکالی اور بندرگاہ کا رخ کیا۔

راج رتنم خاموش تھا۔ مسز دلیسائی نے کلیانی کے ہاتھ سے "ابدی جاوا" لیتے ہوئے گرد پوش پر جاوا کی دوشیزہ کو غور سے دیکھا۔ بولی: "میں بھی اب ہمیشہ اسی طرح جوڑا باندھا کروں گی۔ یہی قدیم ہندوستانی انداز ہے جو جاوا میں اب تک زندہ ہے۔"

راج رتنم نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور کہا: "اور بھی بہت سی باتیں ہوں گی جن کا مخزن یہی اپنا پیارا ہندوستان ہے۔"

کار چلی جا رہی تھی۔ مسز دلیسائی کہہ اٹھی: "جاوا میں ٹیگور میموریل بہت کام کر رہا ہے۔ ایسے میموریل دیس میں قائم کئے جانے چاہئیں تاکہ ہندوستان کا نام ہر کہیں روشن ہو جائے۔"

دلیسائی بولا: "سب سے پہلے ہندوستان کی آزادی کی ضرورت ہے۔"

کلیانی نے آخری فیصلے کے انداز میں کہا: "آزادی کے آنے سے پہلے ہندوستان مر چکا ہوگا۔"

رینو برابر سلائیاں چلائے جا رہی تھی۔ ان کی آواز راج رتنم کے دماغ میں گونجنے لگی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کلیانی چپ بیٹھی تھی۔ سر جھکائے چہرہ گھمائے وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ شاید اسے اپنی کہانی کی لڑکی نظر آ رہی تھی۔ راج رتنم نے اس کے کالے چمکیلے تکونے سے ڈھلکے ڈھلکے جوڑے پر گہرے سرخ ادھ کھلے گلاب کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔ اب کلیانی اسی طرح خاموش بیٹھی رہے گی۔

کار بھاگی چلی جا رہی تھی۔ رینو کی سلائیاں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں۔ ان کی آواز راج رتنم کے دماغ کو زیادہ سے زیادہ چوٹ پہنچا رہی تھی اور جیسے رینو کے آغوش میں پھیلا ہوا پیلا شال تیزی سے بھاگتی ہوئی کار کے سامنے تن گیا ہو اور اس کی سطح پر اُس کے مہیب خوابوں کے سائے تیرنے لگے ہوں — ٹیگور مر رہا تھا — اُس کے گیت رنگینی گنوا چکے تھے — شرت کے ناول سسک رہے تھے......

اور جونہی دلیسائی دائیں طرف کار موڑنے لگا، راج رتنم چیخ اٹھا: "دائیں طرف نہیں، بائیں طرف — جدھر وہ بنگال کی بیٹی کھڑی مجھے بلا رہی ہے۔"

دیوندر ستیارتھی

(حلقۂ ارباب ذوق میں پڑھا گیا)

حشرِ جذبات

چلے آتے ہیں یہ جو گردن جھکائے
نگاہوں سے اِن کی خدا ہی بچائے

نظر آئے تجھ کو محبّت کا جلوہ
متاعِ دل و جاں اگر تو لُٹائے

فضا دم بخود ہو گئی جن کو سُن کر
محبّت کے مَیں نے وہ نغمے سُنائے

وُہ چینِ جبیں اور وہ نشتر نظر کے
جنہیں دیکھ کر زخمِ دِل مُسکرائے

فراوانیِ غم سے تنگ آگیا ہوں
کہاں تک مری اب نظر مسکرائے

خُدا جانے پھر رات، کیونکر کٹے گی
وُہ آنے کا وعدہ اگر بھول جائے

ہر اِک ذرّہ اِس کا ہے تصویرِ عبرت
کہاں تم مری خلوتِ غم میں لائے

مری فکر ہے آج تک غرقِ حیرت
یہ کس طرح کے تُو نے جلوے دکھائے

سراپا اَلَم زندگانی ہو جس کی
کہاں تک فریبِ تمنّا وہ کھائے

وُہ آنکھوں میں ثاقب نہ آتے تھے پہلے
جو آئے تو خوابِ گراں بن کے آئے

ثاقب کانپوری

غزل

اُسی کُوچہ میں سحرؔ ایک حسیں دیکھ آیا
سوچتا ہوں۔ کہیں "اُس کو" تو نہیں دیکھ آیا

یہ جو دیکھ آئے ہیں پھُولوں میں، ستاروں میں اُسے
کوئی رُخسار، کوئی اُس کی جبیں دیکھ آیا

رائگاں کیوں؟ سفرِ دَیر و حرم اَے ساقی
دیکھنے سے اُسے مطلب تھا، کہیں دیکھ آیا

حُسنِ صُورت پہ نچھاور رہی نگاہِ محفل
مَیں غلط بینیٔ اربابِ یقیں دیکھ آیا

یہ صباحت پہ کوئی چوٹ نہیں ہے اے دوست
اتفاقات! کہ حُسنِ نمکیں دیکھ آیا

رہِ اُلفت میں تبسُّم ہے، فریبِ منزل
وُہی اچھا جو اُسے چیں بہ جبیں دیکھ آیا

رَونقِ صُبحِ مناظر" کا اشارہ پاکر
"حاصلِ صُبحِ مناظر" کو وہیں دیکھ آیا

بعض اَیسے بھی ہیں اندازِ عبادت اَے شادؔ
تُو جو میخانے میں اِک قبلۂ دیں دیکھ آیا

شادؔ عارفی

سحر رامپوری "میرا جگری دوست"

قدیم اُردو (دکنی) شاعری میں عورت کا تصوّر!

ہر ایک قوم کی ترقی اور اسکی تہذیب کا پتہ اُسکی زبان کے ادب سے ملتا ہے۔ نظم اور نثر ہی انسان کی زندگی کے مددگار ہیں۔ نظم اور نثر کے امتزاج سے ادب پیدا ہوتا ہے اور قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی بھی ترقی ہوتی ہے۔

اُردو شاعری کا آغاز امیر خسرو سے قرار دیا جاتا ہے۔ جن کا انتقال ۷۲۵ھ ہجری میں ہوا۔ اسطرح ہماری شاعری کی عمر اس وقت ساڑھے چھ سو سال سے زیادہ ہے۔ امیر خسرو کے بعد دو تین صدی سے زیادہ عرصہ تک ہمیں شمالی ہند میں نظم کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ مگر دکن میں امیر خسرو کے ایک صدی کے بعد سے نظم یا شاعری کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ نویں اور دسویں صدی ہجری میں تو دکن میں شاعری کا بول بالا رہا۔ اور اچھے اچھے شاعر میدان سخن گوئی میں داد سخن دی لیتے رہے۔ سلاطین گولکنڈہ اور بیجاپور کی سرپرستی اور دلچسپی کے باعث دکنی شاعری کو بڑا عروج ہوا۔ اس کے بعد دہلی اور لکھنؤ اسکول میں شاعری پھولی اور پھلی اور ایک صدی سے زیادہ خراج تحسین حاصل کرتی رہی۔ مگر دکنی شاعری اور شمالی ہند کی اُردو شاعری میں بہت کچھ فرق ہو گیا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کا رنگ بالکل بدل گیا تھا اور وہ حقیقت نگاری اور اصلیت سے ہٹکر دُور جا پڑی تھی۔ پچھلی صدی سے اردو شاعری کا رنگ بدل گیا۔ آزاد اور حالی کی وجہ سے اور مغربی شاعری کے اثر سے جدید شاعری ظہور میں آئی اور اب عصر حاضر میں پھر تعمیر ہونے لگا ہے ترقی پسند شعرا کی وجہ سے شاعری کا قالب ہی بدل رہا ہے۔

یہاں ہم کو یہ بتانا ہے کہ ہماری قدیم اردو شاعری میں عورت کس رنگ میں جلوہ دکھاتی ہے اور اس کا تصور کس طرح ہوا ہے۔ اور اس کا مقام کیا ہے۔

دکھنی شاعری زیادہ تر مثنویوں پر مشتمل ہے اور پھر غزل گوئی اور نظم نگاری بھی ہوتی رہی۔ ساتھ ساتھ قصائد اور مرثیے بھی عالم وجود میں آئے۔ چونکہ دکھنی مثنویوں کی ابتدا فارسی مثنویوں کو ماڈل قرار دے کر ہوئی تھی۔ اسلئے دکھنی مثنویوں میں فارسی مثنویوں کے ترجمے زیادہ دستیاب ہوتے ہیں لیکن اس کیساتھ دکھنی شعرا کی طبع زاد بھی مثنویاں بھی ہیں۔ انکے موضوع مختلف ہیں۔ جہاں ہمیں تصوف اور اخلاق کی مثنویاں ملتی ہیں تو وہاں تاریخ اور سوانح بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ عشقیہ مثنویاں مرتب ہوئی ہیں۔ تو رزمیہ مثنویاں بھی لکھی گئی ہیں۔ غرضیکہ دکھنی مثنویوں کے موضوع ہمہ گیر ہیں۔ دکھنی مثنویوں کے موضوع کے متعلق ہم نے ایک مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اس موقع پر ہم فارسی ترجمہ شدہ مثنویوں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ صرف ترجمہ کی حد تک دکھنی کہی جا سکتی ہیں۔ تخیل کے لحاظ سے ان کو دکھنی نہیں کہا جا سکتا۔

دکھنی شعرا کی اچھی مثنویوں میں جو عشقیہ مثنویاں ہیں۔ ان میں عورت ہیروئن یا معشوق اور محبوب کی حیثیت سے پیش ہوتی ہے۔ لیکن شعرائے دکن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے فرضی معشوق اور محبوب نہیں بنایا تھا۔ بلکہ ان کی مثنویوں کے محبوب اور معشوق اصلیت رکھتے تھے اور حقیقت میں موجود ہوتے تھے۔ اس کے ثبوت میں وجہی کی قطب مشتری۔ مقیمی کی چندر بدن و مہیار۔ والہ کی طالب و موہنی وغیرہ پیش کیجاتی ہیں۔ وجہی نے اپنے زمانہ کے ولیعہد اور پھر بادشاہ سلطان محمد قلی اور بھاگ متی کے اصلی واقعہ کو افسانہ کی صورت دی ہے۔ مقیمی نے جس افسانہ کو منظوم کیا ہے۔ وہ بھی تاریخ دکن کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ اسی طرح والہ نے بھی طالب

اور موہنی کے صحیح واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اسطرح دکھنی شعرا کی عشقیہ مثنویاں اصلیت پر مبنی اور حقیقت بردار ہیں اور اُن کے معشوق اور محبوب فرضی نہیں بلکہ اصلی ہیں۔

مثنویوں کے بعد غزلوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ واضح ہے کہ غزل دراصل معشوق اور محبوب سے گفتگو اور راز و نیاز کا دوسرا نام ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں وَلی کے بعد مِیر سے لیکر آزاد اور حالی تک جو غزل نگاری ہوتی رہی۔ وہ حقیقت سے دُور اور اصلیت سے خالی تھی وہ مبالغہ اور دروغ گوئی پر مبنی ہوتی تھیں۔ ہجر و وصال کے جھوٹے خیالات اور شاہد و ساقی اور بازاری معشوقوں کی بے وفائی کے گلے شکوے ہوتے تھے۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ دکھنی شعراء کی غزلیں حقیقت بردار ہیں اور انہوں نے غزلوں میں واقعہ کا اظہار کیا ہے کیونکہ جن شعرا نے غزلوں کا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ وہ سلطان محمد قلی۔ سلطان عبداللہ علی عادل شاہ اور غواصی و نصرتی وغیرہ ہیں۔ چونکہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے شاہی ایوانوں اور سلطانی محل سراؤں میں خوبی و رعنائی کے مجسم پیکروں کی کمی نہیں تھی زخ روں گل گونی اور کرشمہ و ادا کی سحر آفرینی سے آٹھوں پہر لطف اندوز ہونے کا پورا سامان مہیا تھا۔ اس لئے سلاطین گولکنڈہ و بیجاپور نے معشوق و محبوب کی تعریف و توصیف مدح اور ستائش کی ہے۔ تو گویا انہوں نے اصلیت کو بیان کیا ہے اور واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ دکھنی شاعری کا جو ذخیرہ ہمدست ہوا ہے۔ اسمیں مثنویاں زیادہ ہیں مثنویوں کے مقابل غزلوں کی تعداد کم ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ دکھنی شعرا کو یہ منظور نہیں تھا۔ کہ وہ اصلیت کے خلاف اور حقیقت نگاری سے دُور جا پڑیں۔ چونکہ غزلوں میں اسکا کم موقع تھا۔ اس لئے انہوں نے اسکی جانب زیادہ توجہ نہیں کی۔ اور جنہوں نے غزل سرائی کی ہے ان کو دراصل ایسے معشوق فراہم تھے جن کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے غزل کہی ہے۔

سلطان محمد قلی کی اکثر غزلیں تصوف سے لبریز ہیں اور اس نے خواجہ حافظ کے رنگ میں اپنی غزلیں موزوں کی ہیں۔ بلکہ کئی غزلیں تو حافظ صاحب کی غزلوں کے نہایت کامیاب ترجمے ہیں۔ سلطان اپنے کلام میں جگہ جگہ اس امر کا اعتراف کرتا ہے۔ کہ اس نے شعرگوئی میں جو کچھ ترقی کی یا شاعری میں کمال پیدا کیا وہ صرف اپنے معشوق کے حُسن و خوبی کی تعریف و توصیف کرنے کے سلسلہ میں حاصل کیا ہے۔ حسینوں نے شعرگوئی کیطرف راغب کیا۔ چونکہ بادشاہ ہونے کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ مہ جبینوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ اس لئے شعرگوئی کے نئے نئے اسباب پیدا ہوتے تھے۔

اسی طرح علی عادل شاہ کی غزلوں میں معشوق کی وہی زلف سیاہ، رخسار گلگوں اور چشم قتّال کی تعریف ہے۔ اس کی ترچھی نظر سے عاشق گھائل ہوتا اور تیر نظر سے اسکا دل مجروح ہو جاتا ہے۔ شراب ناب سے سیری نہیں ہوتی معشوق چاند سے زیادہ حسین، شمع سے زیادہ روشن ہے۔ اس کا حسن سمندر کیطرح بے پایاں گیسو شام کیطرح سیاہ کال سحری کیطرح سپید ہیں۔

مثنوی۔ غزل کے بعد ہم نظموں کی جانب توجہ کرتے ہیں۔ اس قسم کا ذخیرہ زیادہ تر سلطان محمد قلی کے کلیات میں ملتا ہے۔ سلطان نے اپنی نظموں میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ اسکی نظموں میں زیادہ تر نیچرل شاعری کا ذخیرہ ہمدست ہوتا ہے جس پر ہم ایک گذشتہ مضمون میں روشنی ڈال چکے ہیں۔

سلطان ان نظموں میں کبھی تو عورت کو معشوق اور محبوب کی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ اور کہیں وہ ہندی شاعری کے طرز پر مرد کو معشوق بنا کر عورت کی زبانی نغمہ سرائی کرتا ہے۔ عورت عاشق ہے اور مرد اس کا محبوب۔ سلطان نے اپنی ان نظموں میں حسن و عشق کی داستان رنگین سے رنگین تر اور دلچسپ سے دلچسپ تر انداز میں پیش کی ہے۔ چونکہ وہ خود رند مشرب و شوخ طبیعت اور رنگین مزاج تھا۔ اس لئے اسکا کلام از سرتا پا رنگین اور دلچسپ ہے۔

سلطان محمد قلی نے اپنی مذہبی نظموں یعنی حمد و نعت منقبت سے قطع نظر جو نظمیں عید مولود النبی عید غدیر۔ شب برات ۔ نوروز بسنت موسم باراں سالگرہ وغیرہ پر لکھی ہیں۔ ان میں وہ عورت کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہتا۔ اکثر ان نظموں کا خاتمہ محبوب کی یاد یا اسکی تعریف پر ہوتا ہے۔ اس نے کئی نظمیں خاص اپنی معشوقوں کی تعریف و توصیف میں لکھی ہیں۔ حیدر محل یا بھاگ متی کے علاوہ بارہ معشوقوں کے نام پر بارہ نظمیں ہیں۔ ان کے علاوہ افسانہ محبت، راز و نیاز وغیرہ عنوانوں پر بھی اسکی نظمیں ملتی ہیں۔

سلطان علی عادل شاہ نے اپنی ایک نظم میں ہندی طرز پر عورت کی زبانی مرد معشوق کی جدائی پر بہت مؤثر الفاظ میں جدائی و فراق پر آنسو بہائے ہیں۔ معشوق اپنے عاشق کے ساتھ جانے کیلئے بیقرار ہے۔ اس کو جدائی اور فراق کے زمانہ میں نیند نہیں آتی نہ دن کو چین ملتا ہے اور نہ رات کو آرام۔ پیا کے سوا کوئی ساتھی نہیں۔ دل لہو کے تیل میں تلتا اور موم کیطرح جلتا ہے اور وہ جدائی کے صدمہ سے گھل کر دبلی ہو جاتی ہے۔ کوئی اس کے حال کو سننے والا نہیں ہے اس کے آنسو موتی کیطرح ٹپکتے ہیں۔ جدائی میں ایک ایک پل سال معلوم ہوتا ہے۔ عاشق کے بغیر دکھ بھاری اور دنیا اندھیر ہے۔

یہ یاد رہے کہ سلطان محمد قلی اور سلطان علی عادل شاہ نے دولت کے دامن میں آنکھ کھولی ہوش آیا تو عیش و نشاط کا چرچا سنا اور جوان ہوئے تو ساغر و مینا جام و سبو کے دور دیکھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی معاشرت میں سادہ زندگی بلند مشربی اور عالی دماغی کا وجود نابود ہو رہا تھا۔ عالیشان قصروں۔ جنت نظیر باغوں۔ فردوس منظر گلزاروں کی زیبائش و آرائش اور چمن بندی میں سونے کو پانی کیطرح بہایا جا رہا تھا۔ ساقیان مہوش اور زاہد فریب رانیاں زینت محل ہوتی تھیں۔ موسیقی کی نغمہ سنجی اور رقص و سرود کے جلسے ہوا کرتے۔ اس لحاظ سے ان کا کلام رنگین خیالی اور عاشقانہ مضمون آفرینی سے مملو ہونا ناگزیر تھا۔ سلطان محمد قلی کا کلام تو عصر حاضر کیطرح بہت کچھ عریاں ہے۔

اس زمانہ کے دوسرے شعراء غواصی، نصرتی۔ وغیرہ کے کلام میں بھی عاشقانہ مضامین کی کمی نہیں ہے۔ لیکن دکھنی شاعری اور زمانہ مابعد کے دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری میں جو مایہ امتیاز فرق ہے وہ یہ ہے کہ دکھنی شعراء نے زیادہ تر حقیقت نگاری کی ہے وہ اصلیت کو پیش نظر رکھتے تھے اور اس کے برخلاف دہلی اور لکھنؤ کے شعراء کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ چونکہ پردہ کی وجہ سے شریف خواتین کا جلوہ نظر نہیں آسکتا تھا۔ بلکہ شریف عورت کا تذکرہ بھی معیوب ہو گیا تھا۔ اس لئے ان شعراء کے کلام سے بیسا اوقات ان کے محبوب کی جنس پر شبہ ہوتا ہے ان کا محبوب یا تو بالائے بام ہوتا تھا یا چلمن کی اوٹ میں روپوش۔ پہلے گھر کی بہو بیٹی کا وجود ان کی شاعری میں نابود تھا۔ صرف نواب مرزا شوق ایسے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی مثنوی، زہر عشق میں شریف زادی کے عشق کا حال لکھا ہے مگر اس کو اس وقت کی سماج نے ۔ مردود قرار دیا تھا۔

آخر میں ہم مرثیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ دکھنی مرثیوں کے دیکھنے سے پایا جاتا ہے کہ شعراء دکن نے اپنے مرثیوں میں ہندوستانی فطرت کا خاص لحاظ رکھا تھا۔ ہندوستانی ماحول اور معاشرت کا اثر ان کے مرثیوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی ماں، ہندوستانی بیوہ، ہندوستانی بہنیں اور ہندوستانی دلہن کی جھلک ان کے مرثیوں میں نظر آتی ہے۔

دکھنی شعراء اپنے مرثیے خاص خاص عنوانوں کے تحت لکھتے تھے۔ کسی میں حضرت شہر بانو کو اصغر کی ماں کی حیثیت سے پیش کیا اور ان کے زبانی اپنے فرزندوں پر آنسو بہائے ہیں۔ کسی میں ان کو ایک بیوہ کی صورت میں پیش کیا ہے ۔ کبھی ۔ زینب کو بھائی پہ ماتم کناں دکھاتے ہیں اور کبھی حضرت قاسم پر ان کی دلہن کی زبانی ماتم کیا گیا ہے۔

دکھنی مرثیوں کا اصل مقصد امام حسین اور اہل بیت کا غم کرنا اور آنسو بہانا تھا۔ کوئی مرثیہ اس حقیقت سے خالی نہیں ہے اور

وہ ان میں ہندی عورتوں کے جذبات اور محسوسات کا عموماً لحاظ رکھتے تھے۔

عصرِ حاضر میں جسطرح نظموں اور افسانوں میں شریف عورت کا جلوہ نظر آتا ہے اور جسطرح عورتیں بھی اظہار خیال کرتی ہیں۔ یہ آج سے ایک صدی پہلے کی شاعری میں نابود تھا۔ لیکن دکھنی شاعری اس سے خالی نہیں ہے۔ اس میں عورت پر اظہار خیال ہوتا تھا اور اس کو محبوب کیطرح پیش کرتے تھے۔

اس تفصیل سے واضح ہوسکتا ہے کہ دکھنی شاعری میں عورت کا مقام کیا تھا۔ اور وہ کس صورت میں نظر آتی ہے ؎

نصیر الدین ہاشمی

بچھڑے ہوئے ساتھی سے

تبسم سے درسِ وفا دینے والے میری روح کو جگمگا دینے والے
غمِ زیست میں آسرا دینے والے کہاں جا چکا میرے بچپن کے ساتھی!
نئی رسمِ الفت بنا کرنے والے زمانہ سے ناآشنا کرنے والے
مجھے غم کی دولت عطا کرنے والے کہاں جا چکا میرے بچپن کے ساتھی!
محبت کی تلخی کو شیریں بنا کر محبت کے آئین رنگین سکھا کر
نئے سوزِ پنہاں کی مشعل جلا کر کہاں جا چکا میرے بچپن کے ساتھی!
غمِ عشق میں مجھ پہ بیداد کیا ہے یہ سو سو طرح لب پہ فریاد کیا ہے
میں کیسے بتاؤں تری یاد کیا ہے کہاں جا چکا میرے بچپن کے ساتھی!
سویرے سویرے ہی اتنا اندھیرا نہ تیرا پتہ اور نہ منزل کا نقشا!
وہ خوابِ حقیقت، فسانہ تھا گویا کہاں جا چکا میرے بچپن کے ساتھی!
تجھے دل کے ٹوٹے کناروں میں ڈھونڈا تجھے تیرے غم کے اشاروں میں ڈھونڈا
کہ ان آنسوؤں کے ستاروں میں ڈھونڈا کہاں جا چکا میرے بچپن کے ساتھی!
تبسم کی رنگین لہروں میں ڈھونڈا نگاہوں کے خاموش نغموں میں دیکھا
مگر آہ تجھ کو کہیں بھی نہ پایا کہاں جا چکا میرے بچپن کے ساتھی!
نگاہِ تجسس بھی اب کھو گئی ہے تمنا میری تھک کے پھر سو گئی ہے!
میری زندگی کیا ہے کیا ہو گئی ہے
کہاں جا چکا میرے بچپن کے ساتھی

علی اشرف

غزل

جو حرفِ صدق زیرِ خنجرِ خونخوار کہتے ہیں
فسانہ مدتوں اُن کا در و دیوار کہتے ہیں

شرابِ زندگی میں کیف و راحت ڈھونڈنے والے
جہانِ رنگ و بُو کو عرصۂ پیکار کہتے ہیں

شہیدانِ وفا کے خون کا افسانۂ رنگیں
سرِ گردوں شفق کے لالہ گوں رخسار کہتے ہیں

ضمیرِ نوعِ انساں جاگتا ہے جن کے نغموں سے
ہم اُن کو قسمتِ اقوام کا معمار کہتے ہیں

وُہ ملت عزم مستحکم ہے جس کا اور خودی محکم
اُسے اہلِ بصیرت ملتِ بیدار کہتے ہیں

لکھا ہے ہم نے صدیوں اپنے خوں سے اپنا مستقبل
پڑھیں تاریخِ عالم جو ہمیں بیمار کہتے ہیں

تری اُلفت کا افسانہ ترے جانباز سودائی
علی الاعلان کہتے ہیں سرِ بازار کہتے ہیں

حیاتِ نو ہر اِک منظر میں پنہاں دیکھنے والے
گریبانِ سحر کو مطلعِ انوار کہتے ہیں

بتائیں گے وہ کیا دُنیا کو راہ و رسمِ آزادی
جو شمشیر و سناں کے شغل کو بیکار کہتے ہیں

نظر آتا ہے جن کو عشق میں زورِ خداوندی
وہ مومن کی نظر کو تیغِ بے زنہار کہتے ہیں

نہ ہو مایوس اُسے پروردۂ افلاس و ناداری
تجھے اہلِ نظر اللہ کی تلوار کہتے ہیں

جنونِ عشرت و خبطِ تن آسانی کو اہلِ دل
زوال و انحطاطِ قوم کے آثار کہتے ہیں

وُہ آنسو آنکھ سے اُن کی جو ٹپکا تھا مرے غم پر
زبانِ عشق میں اُس کو دُرِ شہوار کہتے ہیں

بہت ایسے بھی ہیں اہلِ نظر اِس دور میں واعظ
جو تیرے رشتۂ تسبیح کو زنار کہتے ہیں

نہائی اپنے خوں میں نوعِ انساں جس کے افسوں سے
ترقی کا اُسی تہذیب کو معیار کہتے ہیں

سروش اُٹھو! سحر ہے۔ زندگی آواز دیتی ہے
نئے جلوے نظر آنے کو ہیں، آثار کہتے ہیں

سروش بختیاری

ارتقاء

چاند خاں کے گال پر ایک بھرپور طمانچہ رسید کر کے بڑھیا نے محسوس کیا۔ کہ اُس کے اعصاب سلاخوں کی طرح اکڑ اکڑ کر اُس کی نسوں میں گھسے جا رہے ہیں، زبان جڑ تک خشک ہو چلی ہے، اور کانوں میں تالیاں بج رہی ہیں۔ حلق میں پھنسی ہوئی چیتھڑوں کی گیند کو اگلنے یا نگلنے کی کوشش میں اُس نے بھیسلے سر کو کاندھوں تک اُٹھتے ہوئے گھٹنوں میں چھپا لیا اور چلائی "چاند کے ابا!"

لیکن چاند کا ابا تو باہر گلی میں رام لال کے پتا پرشوتم داس سے خلافت کے زمانے کی باتیں کر رہا تھا، اور پھر چاند خاں جو تو دس برس کی عمر میں پہلی مرتبہ غصیلی ماں کے چانٹے سے لذت یاب ہوا تھا۔ کچھ دیر مبہوت رہنے کے بعد اس زور سے رونے لگا۔ کہ پڑوسن بھی ہنڈیا کو خلاف معمول اکیلا چھوڑ کر دیوار پر سے جھانکی "اے کیا ہوا اللہ رکھے چاند خاں کو؟" ——— اور پھر ہنڈیا کی طرف لپکی ——— "چاند کے ابا!" بڑھیا کے گلے میں خشک چیتھڑوں کی گیند ٹھنس کر رہ گئی تھی، اُدھر پرشوتم داس بڑا صابر سامع ثابت ہو رہا تھا۔ اور بڈھے کی لمبی تقریر سننے کے لئے دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا تھا ——— "ان آنکھوں سے دیکھا سب کچھ، پر اب کتنا عجیب سا لگتا ہے، ایک ہی میدان میں، ہندو اور مسلمان اور سکھ! کبھی مسلمان تقریر کرتا ہے، کبھی ہندو پنڈت اور کبھی سکھ گرنتھی، نعرے بلند ہوتے ہیں اللہ اکبر اور بندے ماترم اور ست سری اکال کے، گیت گائے جاتے ہیں گاندھی اور محمد علی کے، کہیں چاند تارا نظر آتا ہے۔ کہیں چرخہ اور کہیں کرپانیں! ——— اور پھر بھائی پرشو! جانے کیا بپتا پڑی کہ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ آپس میں جھگڑنے لگے اور انگریز نے اطمینان کی سانس لی۔ اور اب تک اس کا اطمینان قائم ہے، اب تک مسجد اور باجا اور گائے اور جھٹکا کی رٹ چلی جا رہی ہے، وہی دنگے فساد ہیں اور چیخم دھاڑ ہے اور لوٹ کھسوٹ ہے، اور حاکم خوش ہے، اور ہم وہی کنوئیں کے مینڈک! ہر پھر کر وہیں کے وہیں! کاش ان میں پھر سے ایکا ہو جاتا، اور پرشو بھیا یہ کوئی اتنی مشکل بات بھی تو نہیں، اب ہمارا یہ ننھا سا گاؤں ہے، ہندوؤں سکھوں کے یہی آٹھ دس گھر ہوں گے، پر خدا لگتی کہنا پرشو بھیا۔ کبھی تمہیں یا تمہارے بھائیوں کو ہم مسلمانوں نے چھیڑا؟ نہیں نا؟ کتنے میٹھے لگتے ہو تم، جب ہماری خوشیوں اور غمیوں میں شریک ہوتے ہو! تمہیں یاد ہے نا گئے برس تمہارا کوئی پنڈت آیا تھا۔ یہاں، مندر میں روشنی کی ضرورت پڑی تو ہم نے اپنی مسجد کا گیس بھجوا دیا، یاد ہے نا؟ یہ بھولنے کی باتیں ہی نہیں ——— اور اب تم یہ شکایت لے کر آئے ہو کہ چاند نے رام لال کے گھونسا مارا اور اس کی وجہ یہ بتاتے ہو کہ تم ہندو ہو اور ہم مسلمان ہیں، اور تم کم ہو اور ہم زیادہ ہیں! ارے بھیا پرشو! ایسی ہی بات تھی تو مسلمانوں کے ڈیڑھ دو سو گھروں کے مقابلہ میں تمہارے سات آٹھ گھر وندے کیا حقیقت رکھتے تھے، ٹھیک ہے نا؟ پھر میں حیران ہوں کہ تمہارے منہ سے ایسی بات کیوں نکلی!" ——— بڈھا مونچھوں اور داڑھی میں اٹکے ہوئے جھاگ کے قطروں کو پونچھنے کے لئے رکا۔

پرشوتم داس نے پہلو بدل کر کہا: "اخباروں میں پڑھا ہے کہ جہاں جہاں مسلمان زیادہ ہیں، وہاں ہندوؤں کو رہنے نہیں دیں گے اور ہوتے ہوتے چوری چھپے مسلمانوں نے یہ کام شروع بھی کر رکھا ہے!"

بڈھے کی سنجیدگی پر غصہ غالب آگیا "تو کیا میں گل مکی لاٹ ہوں کہ ہر مسلمان کا ذمہ اُٹھا لوں، ارے ایک بار نہیں،

دو بار نہیں سو بار کہا کہ دونوں بچے تھے، چاند نے غلطی کی جو رام لال کے گھونسا مارا، تم ساری بات کو یوں سمجھنے کی کوشش کرو، کہ ایک بچے نے دوسرے بچے کو پیٹا، مسلمان اور ہندو کا جھگڑا بیچ میں نہ گھسیٹو، قسم خدا کی، دوسرے مسلمانوں کی نیتوں کی تو وہی جانے، اپنے بارے میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں، کہ میرے دل میں تمہاری طرف سے کبھی میل نہیں آیا، تم میرے خدا کو اچھا کہتے ہو میں تمہارے پرماتما کی عزت کرتا ہوں، تم نے میرے محمدؐ پر انگلی نہیں اُٹھائی میں نے تمہارے رام میں کوئی نقص نہیں نکالا، اس حالت میں کیا میرا دماغ خراب ہوا ہے کہ اپنے معصوم بچے کے دل میں تمہارے خلاف نفرت کا بیج بو دوں، لعنت ہو ان اخباروں پہ"

پرشوتم داس نے اُٹھتے ہوئے کہا: "تم نہ کہتے تو بھی میں اُسے سمجھا دیتا۔"

"یہ تو میرا فرض ہے" بوڑھا بولا: "تم نہ کہتے تو بھی میں اُسے سمجھا دیتا۔"

پرشوتم داس جاتے ہوئے بولا: "ایک چانٹا لگ جائے اُس کے، تو بہتر رہے گا۔"

"نہیں بھئی، چانٹا نہیں لگنے کا" بوڑھے نے کہا: "خفا نہ ہونا چاند کے گال چانٹوں کے لئے گلابی نہیں بنائے۔ باتوں باتوں میں سمجھا دوں گا، سعادت مند بیٹا ہے، باپ کا کہا نہیں ٹالے گا۔"

"مرضی تمہاری" پرشوتم داس نے نکڑ پر سے مڑتے ہوئے کہا۔

"چانٹا لگ جائے" بوڑھا بڑبڑاتا ہوا گھر کو پلٹا "چاند کے چانٹا لگ جائے، اُن ہاتھوں میں کیڑے نہ پڑ جائیں جو چاند کے چانٹا لگائیں!"

"چاند کے ابا" چیتھڑوں کی گیند بڑھیا کے حلق میں پوری شدت سے پھنسی ہوئی تھی "چاند کے ابا"

بڑھیا کی پکار اور چاند کے رونے کی آواز سن کر بوڑھا لپکا، چاند کو گلے سے لگالیا اور پیار سے پوچھا "کیا ہوا؟ کیا ہوا میرے چاند؟"

"میں نے چاند کے چانٹا لگا دیا ـــــ غلطی سے" بڑھیا نے بوسیدہ سر کو سوکھے سڑے گھٹنوں کے شکنجے سے نکال کر کہا، "اور پھر چیتھڑوں کا گولا پھانک سے اُگل ڈالا" مجھ کالی کلموہی نے۔ مجھ نصیبوں جلی نے چانٹا لگا دیا چاند کے۔" وہ اُٹھی اور باہیں پھیلا کر چاند کی طرف بڑھی۔ اور اُسے چوم لینا چاہا۔ مگر بوڑھا بیچ میں آ گیا اور بولا "نہیں نہیں چومنے دوں گا، خود ہی چپت لگاتی ہے، خود ہی پیار رکھتی ہے اُس پر، دس برس کی قسم توڑ ڈالی ہم تم نہ کٹ گئے ستیرے جب تونے اِس گلاب کے پھول ـــــــــ"

مگر بڑھیا نے جھپٹ کر چاند کو چوم لیا۔

پڑوسن ایک مرتبہ پھر دیوار پر سے جھانکی "پہلی بار رویا ہے چاند ـــــ کیا ہوا؟"

"ہے بی ہونا کیا تھا، مجھ نواب زادی نے غصے میں آ کر ـــــ" بڑھیا رک گئی، کیونکہ پڑوسن ہنڈیا کی طرف لپک گئی تھی اور دیوار پر پڑوسن کے سر کی بجائے ایک کوا بیٹھا تھا۔

"چلی" بوڑھا بڑبڑایا، اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

چاند کے چانٹا لگ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی، بوڑھے بڑھیا کو اپنے اس اکلوتے وارث کی اہمیت کا ضرورت سے زیادہ

احساس تھا۔ ۱۹۱۴ء-۱۹۱۸ء کی جنگ میں یورپی قوموں کی بقا کے لئے وہ اپنے دو نوجوان بیٹے قربان کر چکے تھے، بیٹوں کی موت کی اطلاع کے دو روز بعد اُنہیں چھوٹے بیٹے کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک خط ملا تھا کہ اب وہ بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے، اور فرانس کی ایک لیڈی نے اُس کی مونچھوں کے سنہری تار دیکھ کر کمپنی کمانڈر سے کہا ہے کہ یہ سپاہی بالکل فرانسیسی لگتا ہے! ــــــ اُس روز وہ دونوں لگتا رو دئے تھے۔ اندھیرے کوٹھے کے کواڑوں کی زنجیر چڑھا کر اُنہوں نے لُٹے ہوئے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا، ایک ساتھ اُن کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے، ایک ساتھ وہ بلبلا اُٹھے تھے، اور پھر ایک ساتھ اُن کے لبوں سے ایک ہی لفظ نکلا تھا: قسمت!"

۱۹۱۸ء میں جب خاتمۂ جنگ کا اعلان ہوا، اور اُن کے ضلع کے صدر مقام پر کسی صاحب نے دربار لگایا، تو وہ بھی جا پہنچے، کہ فرانس کی خاک میں دبی ہوئی اُن سنہری مونچھوں کا واسطہ دے کر صاحب سے یہ التجا کریں، کہ وہ اُنہیں ہل۔ نلائی، دکھوالی اور کٹائی کے جھنجھٹوں سے چھٹکارا دلا دے، لیکن سنہری پیٹیوں اور سُرخ کوٹوں والے مغرور صورت اردلیوں نے اُنہیں دھتکار دیا، اور بڑھیا مدت تک بڈھے کو کوستی رہی کہ اُس نے اپنی پگڑی کو کلف کیوں نہ لگوائی، جبکہ دربار تک رسائی کا ذریعہ مرے ہوئے بیٹوں کی بجائے کلف لگا طرہ اور تیل لگی مونچھیں تھیں!

اُن کی گودیں اُجڑ چکی تھیں، مستقبل کی چمک کو گرہن لگ چکا تھا، اُمیدوں نے اپنے ہاتھوں اپنی چھاتیوں میں خنجر گھونپ لئے تھے۔ تحریکِ خلافت کے دنوں میں اچانک بڈھے کے دل میں اپنے بیٹوں کی یاد ایک عجیب زہریلی صورت اختیار کر گئی۔ گاؤں بھر میں بلند ترین جھنڈا اُس کا تھا۔ بلند ترین نعرہ اُس کا تھا، بلند ترین دعوے اُس کا تھا، ان پڑھ ہونے کے باوجود اُس نے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں، اور دہقانوں کا محبوب نمائندہ بن گیا۔ ایک مرتبہ تو اُس نے یہاں تک کہہ دیا "خاک پڑے اُس جینے پر جس جینے کے لئے ہمیں اپنے جیسے انسانوں سے کھُل کر سانس لینے کی بھیک مانگنا پڑے، میں پوچھتا ہوں یہ کہاں کا قانون ہے کہ ہمیں آنسو بہانے کے لئے بھی اسٹامپ پر ایک درخواست لکھ کر پیش کرنا پڑتی ہے، اور اُدھر سے جواب ملتا ہے، نہیں، تم آنسو نہیں بہا سکتے، تم آنسو بہاؤ گے تو تمہاری آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی ــــــ مگر آج میں ان عالی جنابوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم پہلے آنسوؤں کی اجازت نہیں دیتے تھے، اب دل کا غبار نکالنے کے لئے تمہارے سامنے تمہاری اجازت کے بغیر یہ آنکھیں شرارے اُگلیں گی، اور یہ شرارے تمہارے خس و خاشاک پر گریں گے، اور تمہارے خس و خاشاک پر گرتے ہوئے ان شراروں کو ہماری آہیں ہوائیں دیں گی، اور جب شعلے بھڑکیں گے، تو ہم ان شعلوں کے اردگرد ناچیں گے۔ اور گائیں گے کہ یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں!"

اُس روز بڈھے کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی، بڑھیا نے جب یہ خبر سُنی تو درد آمیز مسرت سے چیخ کر بولی: "اب میری باری ہے، میرا خدا مجھے بلا رہا ہے، میرا رسول مجھے بلا رہا ہے، میرا پیر دستگیر مجھے بلا رہا ہے، میرا محمد علی مجھے بلا رہا ہے، میرے بیٹے بلا رہے ہیں، مجھے میرا فرض بلا رہا ہے۔۔۔۔ ــــ مگر اُسی وقت ایک جہاندیدہ عورت نے اُسے الگ لے جا کر سمجھایا کہ عورت کا سب سے بڑا فرض اپنی امانت کی حفاظت ہے، خدا اور رسول بھی اسی طرح خوش رہ سکتے ہیں۔ کہ تو اپنی امانت کو گزند نہ پہنچنے دے، اور وہ امانت تیرے پیٹ میں ہے۔

بڈھے کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا ملی۔ اور اس کے جھنڈے کو ایک اور مجاہد نے تھام لیا۔ "کاش اس وقت میرے بیٹے زندہ ہوتے!" بڑھیا نے حسرت بھرے مسجد کے صحن میں بلند جھنڈے کو لہراتے دیکھ کر کہا تھا۔ اور جب بڈھے

رہائی میں صرف ایک مہینہ باقی رہ گیا، تو اُسے جیل ہی میں اطلاع ملی کہ جس وقت لوگ عید کا چاند دیکھ رہے تھے تو ٹھیک اسی وقت وہ ایک لڑکے کا باپ بنا۔ جیل میں مٹھائی تو خیر کیا ملتی، البتہ اُس نے مٹھائی سے بھی لذیذ جیرے قیدیوں کو محظوظ کیا۔ اُس نے اپنے ہم جنسوں کو ایک مولود شریف سُنایا :-

اللہ کی اس پیاری نگری میں دیر تو ہے اندھیر نہیں

"چاند خاں!" اس نے اندھیری کوٹھڑی کے سنگین سترٹے پر لیٹتے ہوئے کہا تھا "میں اپنے ننھے کو چاند خاں کے نام سے پکاروں گا، اور جب اس کی مسیں بھیگیں گی، جب اُس کے سنہری مونچھیں اگیں گی، تو میں اُسے محمد علی کی فوج میں بھرتی کرا دوں گا، پھر چاہے وہ دلی میں مارا جائے فرانس میں، اچھا ہے —— مگر نہیں، وہ نہیں مرے گا، چاند نہیں مرسکتا۔ چاند مرجائے تو دنیا رانڈ ہو جائے۔ چاند کیسے مرسکتا ہے :"

"چاند خاں؟ جیل سے باہر اُس کے رشتہ داروں نے اُسے ننھے کا نام بتایا، اور وہ اس زور سے ہنسا کہ جیل کے صدر دروازے کی کھڑکی میں سے ایک سرسال سنتری نکلا اور اُس کے قریب آکر بولا: "ذرا ہولے ہنسو بھیا، صاحب بہادر نے سُن لیا تو پھر ٹھونس دیں گے جیل میں"

بوڑھے نے مسکرا کر کہا "جو ساری عمر کے لئے خود ٹھنسے ہوئے ہیں، جیل میں وہ دوسروں کو کیا ٹھونسیں گے بے کلے خاں۔ اب ہم آزاد ہیں۔ ہم چاہیں تو ہنستے ہنستے اپنے پھیپھڑوں کی دھجیاں اُڑا دیں، ہم ہنس رہے ہیں، خلافت کے جلسے میں تقریر نہیں کر رہے سمجھے بے کلے خاں" اور اُس نے کلے خاں کی بڑی بڑی مونچھوں پر سے چٹکی سے ایک تنکا اُڑا دیا۔

گھر آکر اُس نے چاند خاں کو اتنا چوما کہ وہ بلکنے لگا، مگر وہ تو پاگلوں کی طرح اُسے چومے جا رہا تھا، اور کہہ رہا تھا "میں نے تیرے بڑے بھائیوں کو کئی بار پیٹا، آج جب مجھے وہ گوری گردنیں اور روشن آنکھیں اور بیضوی ٹھوڑیاں یاد آتی ہیں، تو سوچتا ہوں میں نے اُنہیں کیوں پیٹا، میں تمہاری گردن اور آنکھوں اور ٹھوڑی پر بوسوں کا پہرہ بٹھا رہا ہوں، تاکہ جب میرا یا تیری ماں کا یا کسی اور کا ہاتھ طمانچے کے لئے اُٹھے، تو یہ بوسے اُس ہاتھ کو ڈس لیں، تو مارے جانے کے لئے نہیں پیدا ہوا، تو صرف مارنے کے لئے پیدا ہوا ہے، تجھے محمد علی اور گاندھی کی فوج میں بھرتی ہونا ہے"

"اُن کی تو آپس میں چل گئی" چاند خاں کی ماں بولی "کل کی خبر ہے، اگر یا بیٹھے، محمد علی کہتے ہیں، گاندھی کٹر ہندو ہے، گاندھی کہتے ہیں "نہیں میں کٹر ہندوستانی ہوں —— اور انگریز خوش ہے، اور ——"

"اور ہم لُٹ گئے" بوڑھے نے چاند خاں کو کھاٹ پر ڈالتے ہوئے کہا "اگر یہ بات ٹھیک ہے تو ہم لٹ گئے، سارا ہندوستان لُٹ گیا۔ ساری دنیا کا مستقبل لُٹ گیا۔ مگر نہیں، وہ شعلہ کبھی نہیں بجھ سکتا؛ جو ان دونوں نے ہمارے دلوں میں بھڑکایا ہے، یہ شعلہ بجھ جائے تو آزادی رانڈ ہو جائے، یہ شعلہ کیسے بجھ سکتا ہے؟"

یہ شعلہ بوڑھے کے دل میں برسوں بھڑکتا رہا۔ جس روز چاند نے رام لال کے [illegible] تو اس شعلے نے دھوئیں کا ایک طوفان اچھالا، اور دھوئیں کا یہ طوفان اُس نے پرشوتم داس کے سامنے اگل ڈالا، اور جب اس واقعہ کے دو برس بعد اس نے سُنا کہ محمد علی [illegible] چل بسے تو اس بھوبل پر ایک بگولا جھپٹا، چنگاریوں کا ایک مینار بلند ہوا۔ یہ مینار اُس کے ذہن کی دھندوں میں رقصاں و جولاں رہا، اسی دوران اُسے کسی پہلو قرار نہیں ملتا تھا، چاند کو دیکھ کر کہتا تھا "میرے بچے، تیرا [illegible] سالار

مرگیا!" اپنے اداس خلافتی ساتھیوں کو دیکھ کر کہتا تھا "میرے رفیقو، تمہارا سرپرست چل بسا"۔ مسجد میں جاکر مولوی صاحب سے کہتے "میاں جی، ہماری ملت کا سہاگ لٹ گیا"۔

"کیا ہوا؟"۔ مولوی صاحب نے مسواک کی جنگی کو نتھنوں کے رستے دماغ کے بعید ترین گوشوں تک چڑھاکر پوچھا

"آپ کو کچھ معلوم نہیں؟" وہ تعجب سے بولا "محمد علی چل بسے!"

"وہی خلافت والے؟" مولوی صاحب نے مسواک کی نیابت کو کاندھے پر پڑے ہوئے نیلے رومال سے رگڑتے ہوئے پوچھا۔

"جی وہی خلافت والے، شوکت علی کے بھائی"

"جنہوں نے انگریز سے روپیہ لے لیا تھا؟" مولوی صاحب نے مسواک کو بالشت سے ناپتے ہوئے کہا،

اور بوڑھے پر دحشت سی سوار ہوگئی۔ "جی نہیں، جس نے کافروں سے آپ کی مسجدوں اور تسبیحوں کو آزاد کرانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ جسے آپ جیسے ملانوں نے ——" اس کی آواز بھرا گئی، اور وہ منہ میں کپڑا ٹھونستا آنکھیں پونچھتا پلٹ آیا۔

سرما کی طویل راتوں میں جب کڑوے تیل کے دیئے کی لو دھوئیں کی منحنی لہریں چھوڑتی، اور دیواروں پر ٹنگی ہوئی چنگیروں اور چھاجوں کے پیچھے ٹڈیاں سنگیت بجاتیں، تو وہ چاند کو اپنے پاس بٹھالیتا، اسے خلافت کے زمانے کے قصے سناتا، اور اس سے وعدہ لیتا۔ کہ جب ایک مرتبہ پھر یہ شعلہ بھڑکے گا۔ تو وہ اس میں بے خوف کود جائے گا۔ اور یہ نہیں سوچے گا۔ کہ ابھی اس کی عمر چھوٹی ہے۔ یا اس کے ماں باپ بوڑھے ہیں —— "اور میرے چاند، شعلے کا کام صرف جلانا ہی نہیں، وہ کندن کردینا بھی جانتا ہے"۔

۱۹۳۹ء میں جب ہمیشہ کی طرح یورپ ہی کی تہذیب گاہ اور مغرب ہی کے امن کدے سے جنگ کا غلغلہ بلند ہوا اور جب ہندوستان میں نئے سپاہیوں کی طوفانی بھرتی شروع ہوئی۔ تو چاند ایک بانکا سجیلا گبرو تھا، بوڑھے کو اس امر کا احساس تھا کہ دورانِ جنگ میں سپاہیوں کے والدین کو دنیادی لحاظ سے ہر قسم کی سہولت میسر ہوگی۔ اور پھر چاند کی ملازمت کے بغیر اس کی شادی کا سامان بھی جمع کرنا مشکل تھا۔ مگر تحریکِ خلافت کی آگ میں پکا ہوا دماغ ان مادی منفعتوں کے متعلق سوچ تک گوارا نہیں کرتا تھا، اس کے دل میں صرف ایک لگن تھی —— کاش وہ اپنے بیٹے کی تربیت کے خواب کی تعبیر دیکھ اور جیتے جی ایک مرتبہ پھر محسوس کرسکے، کہ ابھی غلاموں کے ذہنوں سے آزادی کا تصور محو نہیں ہوا۔ اس راکھ میں ابھی کئی سخت جان چنگاریاں چھپا رہی ہیں۔ جن کو ہوا دینے کے لئے ایک اور محمد علی کی ضرورت ہے!

اور وہ محمد علی: نئی اس کے ذہن کے افق پر طلوع ہوچکا تھا!

چند مہینوں میں گاؤں نوجوانوں سے بالکل خالی ہوگیا، چاند ویران گلیوں میں بے مقصد پھرتا، چوپال پہ جاتا بوڑھوں سے بلغم کی زیادتی اور معدے کی کمزوری کے قصے سنتے سنتے تھک جاتا۔ باہر کھیتوں میں گھومتا رہتا، گھر آ بوڑھی ماں سے بے معنی باتیں کرتا، مدرسے کے منشی جی سے اخباروں کی اطلاعات سننے چلا جاتا، مگر جب رات آتی تو وہ انتظار میں رہتا، کہ لسب کھانے سے فراغت پلے۔ اور وہ اپنے باپ کی پنڈلیاں دبائے اور اس سے پوچھے "اچھا، کیا ہوا؟ مولانا محمد علی نے پھر کیا حکم دیا؟"

ایک روز چاند نے منشی جی سے یہ خبر سُنی، کہ نئے محمد علی نے مسلمانوں کو جنگ میں پوری پوری امداد کی تلقین کی ہے اور کہا ہے کہ صرف جرمنی کی شکست ہی اسلامی ممالک کو آزاد رکھ سکے گی، بھاگا بھاگا گھر آیا، بوڑھا اس وقت مسجد جانے کی تیاریاں کر رہا تھا، یہ خبر سُن کر اچھل پڑا۔ "ہم ہندوستانی تو خیر یوں ہی قسمت کے ہیٹے، لیکن یہ ترکی اور مصر اور عراق اور ایران ـــــ ان سب پر جرمنی کی نظر ہے کیا؟ کیا وہ ہماری اجڑی محفل کے ان مدھم چراغوں کو بھی بجھا دیں گے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہمارا محمد علی ٹھیک کہتا ہے۔ اور میرے بیٹے اب میں چاہوں بھی تو تجھے نہیں روک سکتا ـــــ پر میری ایک بات یاد رکھیو، تو چند کوڑیوں کے لئے جنگ میں نہیں جا رہا، تو ساری دنیا میں آزادی اور امن کا جھنڈا بلند کرنے جا رہا ہے۔"

وہ صبح بہت روشن اور چلبلی سی تھی، جب چاند اپنے والدین سے رخصت ہو کر گاؤں سے باہر آیا۔ کچھ دور جا کر اُس نے پلٹ کر گاؤں پر ایک نگاہ ڈالی، اپنے مکان کی چھت پر اُسے دو گٹھڑیاں سی پڑی نظر آئیں، اور اُس نے پگڑی اتار کر ہوا میں اچھالی، اُدھر سے بھی ایک گٹھڑی کھل گئی، اور ایک کپڑا ہوا میں پھڑ پھڑانے لگا۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو پگڑی سے پونچھا وہ علاقہ کے صدر مقام پر آیا، جہاں اُس پر کئی شکاری جھپٹے، لیکن اُس نے یہ کہہ کر سب کو مایوس کر دیا، کہ وہ اسلام اور آزادی کے لئے اور اپنے محمد علی کی اجازت سے بھرتی ہو رہا ہے۔ "اگر آپ کو کسی سند کی ضرورت ہے تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے، کہ میرے معاملہ میں آپ کو مایوسی ہوگی۔"

جبل پور میں ابتدائی تربیت کے بعد اُسے محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا، اِدھر گاؤں میں ہر مہینے اُس کی تنخواہ بوڑھے کو ملنے لگی، اور بڑھیا نے کپڑوں اور زیوروں سے صندوقچے ٹھونسنے شروع کئے، ایک جگہ رشتہ کی بات بھی پکی کر لی۔ خیالوں نے محل پر محل تعمیر کئے، مستقبل کے ویرانے میں امیدوں کے سرسبز پیڑ ابھرے، اور ہر طرف آبادی ہی آبادی اور ہریاول ہی ہریاول نظر آنے لگی۔

ان دنوں بوڑھے کا محبوب ترین مشغلہ مدرسے کے منشی جی سے اخباروں کی اطلاعات سُننا تھا، دن بھر جو کچھ سنتا، وہ رات کو بڑھیا کے حوالے کر دیتا، دونوں دیر تک نئے واقعات پر خیال آرائیاں کرتے، چاند کے لئے دعائیں مانگتے، دیئے کی لو کانپتی، جھینگروں کے پیچھے ٹڈیاں طویل الاپ چھیڑتیں۔ باہر صحن میں نیم کی شاخوں پہ ہوا گاتی، چاند ابھرتا تو کواڑوں کی کھلی جھریاں نقرئی لکیریں بن جاتیں، اور وہ جو موضوع بھی چھیڑتے وہ ہر پھر کر چاند پر مرکوز ہو جاتا۔

"لاہور میں ہمارے محمد علی نے ایک بہت بڑا جلسہ کیا ہے۔" ایک روز بوڑھے نے کہا۔ "اور انگریز کو بتایا ہے کہ ہندو مسلمان کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ اُن کا مذہب، چال ڈھال، رہن سہن، لباس خوراک سب کچھ الگ ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ جہاں جہاں مسلمان زیادہ ہیں وہاں مسلمانوں کی حکومت ہو، اور جہاں جہاں ہندو زیادہ ہیں وہاں ہندوؤں کی حکومت ہو، اس طرح ہندوستان میں رہنے والے دو بھائی جو ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے ہیں، الگ الگ ہو کر چین کی زندگی بسر کر سکیں گے۔"

"معقول بات ہے۔" بڑھیا نے کہا اور اُس کی مسکراہٹ کا محیط وسیع ہو گیا۔ "جیتا رہے ہمارا محمد علی۔"

"جیتے رہیں وہ سب لوگ جو آزادی کے عاشق ہیں۔" بوڑھا بولا۔

"اور جیتا رہے میرا چاند جسے سمندر پار بھی اپنا چاند تارا نہیں بھولا۔" بڑھیا نے غرور سے کہا،

"ارے بھلی، چاند تارا زمین کی کسی نگری میں بھی نہیں [illegible]۔ چاند ساری دنیا پر چاندنی بچھا دیتا ہے، تارا ساری دنیا کے

مسافروں کو راہ دکھاتا ہے، اور آسمان پر صرف ایک چاند ہے اور اُس کے ہمیشہ ساتھ رہنے والا صرف ایک تارا ہے ــــ مگر تجھے کیسے معلوم ہوا کہ چاند سمندر پار بھی اپنا چاند تارا نہیں بھولا ؟"

بڑھیا مسکراہٹ کو روکنے کے باوجود مسکرائے جا رہی تھی - مجھ نگوڑی کی یہ بڑی غلطی ہے کہ من کی بات نہیں چھپا سکتی تمہارے سامنے، اب کہہ ہی دوں ساری بات، آج چاند کا خط آیا ہے، میں نے یونہی کھول لیا تو اوپر چاند تارے کا نشان بنا ہوا تھا، تب سے ہنسی رکتی ہی نہیں کمبخت ؛ وہ بھاگ کر سرہانے میں سے خط نکال لائی، دونوں کھٹولے پر بیٹھ گئے - سبز روشنائی سے بنے ہوئے چاند تارے کو پہلے بڈھے نے چوما اور پھر بڑھیا نے، اور اس کے بعد بڈھے نے خط پڑھنا شروع کیا۔

"بہت سی ایسی باتیں ہیں، جو میں لکھنا چاہتا ہوں، مگر لکھنے کی اجازت نہیں، صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ میں نے حضرت پیر دستگیر محبوب سبحانی کے روضہ مبارک کی زیارت کی ــــ"

"تو پھر میرا چاند بغداد میں ہے!" بڑھیا نے مارے خوشی کے اپنے دونوں ہاتھوں کو جکڑ کر ٹھوڑی پر رکھ لیا، مگر بڈھا خط پڑھتا گیا -

"وہاں میں نے دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے اپنے رسول پاک اور اپنے اس نیک بندے کی برکت سے اُس راہ پر قربان ہو جانے کی توفیق عطا فرما، جو مجھے میرے ابا بچپن سے دکھاتے چلے آئے، اور ابا جان! جب میں یہ دعا مانگ چکا، تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے روضہ شریف میں مرحوم محمد علی تشریف لے آئے ہیں، اور میری دعا میں شامل ہو گئے ہیں"

خط پڑھتے پڑھتے بڈھے کی آواز بھرا گئی، اور وہ آنسو پونچھنے کے لئے ایک طرف چلا، بڑھیا گنگھیا کر بولی: "روتے کیوں ہو؟"

بڈھا مسکرا کر بولا: "تم بھی تو رو رہی ہو، ہم دونوں اس لئے رو رہے ہیں کہ ہمارا چاند سچ مچ کا چاند نکلا - اب وہ بڑھ رہا ہے، ابھر رہا ہے، اُس کے نور سے ہمارے دلوں کی دنیا منور ہو رہی ہے، اب وہ پورا چاند بن جائے گا - اور جب وہ پورا چاند بن جائے، ــــ جب وہ پورا چاند بن جائے گا ــــ" بڈھا گھبرا کر اُٹھ بیٹھا، اور بڑھیا کے شکوک کو دور کرنے کے لئے ایک لمحہ میں فقرے مکمل کرنے کے کئی طریقے سوچ لئے - اور آخر بولا: "جب وہ پورا چاند بن جائے گا تو اپنے آپ کو سورج کے حوالے کر دے گا"

"سورج!" بڑھیا چونک پڑی،

"ہاں ہاں، ہمارا نیا محمد علی ہماری دنیا کا سورج ہی تو ہے" بڈھا کامیاب ہو گیا تھا، اور بڑھیا چونکے ہوئے اعصاب کے تناؤ کو مسکراہٹوں کی پھوار سے نرم کرنے لگی تھی،

چاند اب محاذ جنگ سے واپس آ کر کلکتے کی چھاونی میں مقیم تھا، اور دو تین مہینوں کے اندر رخصت پر آنے والا تھا، بڑھیا نے اس کی شادی کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں، مکان کی سفیدی کرا لی تھی، ابھرے ہوئے کنکروں کو ہتھوڑی سے نکال کر صحن کو آئینہ بنا لیا تھا، ہر ڈاک میں اُسے چاند کے خط کی توقع ہوتی، اور جب خط نہ ملنے سے مایوس ہوتی، تو رات کو بڈھے سے ملک کی نئی نئی خبریں سن کر دل کو ڈھارس بندھاتی -

مگر اب تو چند روز سے بڈھا عجیب عجیب خبریں سنانے لگا تھا،

"میں گاندھی جی کی اتنی ہی عزت کرتا ہوں جتنی محمد علی کی، مگر جانے کیا بات ہوئی کہ گاندھی جی نے مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر ایک فیصلہ کر لیا ہے، اور انگریزوں سے کہا ہے کہ تم ہندوستان سے نکل جاؤ ورنہ تمہارے لئے اچھا نہیں ہوگا،"

"آج انگریز نے کانگرس کے بہت سے سرداروں کو جیل میں بھیج دیا ہے"

"سارے ملک میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھی ہے، مگر مسلمان بالکل الگ ہیں، وہ کہتے ہیں جب ہندوؤں نے ہمارے ساتھ کوئی مشورہ ہی نہیں کیا، تو ہمیں کیا پڑی ہے کہ اس آگ میں بے مقصد کود پڑیں"

"ریل گاڑیاں پٹڑیوں سے اتر رہی ہیں، ڈاک خانے جلائے جا رہے ہیں، گولیاں چل رہی ہیں، کئی جگہ ہوائی جہازوں نے نیچے اتر کر مشین گنیں بھی چلائی ہیں۔ مگر ایک آگ ہے کہ پانی کا ہر چھینٹا اس پر تیل بن کر گرتا ہے"

"آج تین ریل گاڑیاں الٹ گئیں، سو سو مسافر مارے گئے، آج دو ریل گاڑیاں الٹ گئیں اور آٹھ ڈاک خانے جل گئے ایک اسٹیشن کی عمارت کو بھی نقصان پہنچا"

"آج ایک اور ریل گاڑی الٹ گئی"

"عجیب بغاوت ہے" بڑھیا نے ایک روز کہا "کہ اپنے ہی غریب بھائیوں کو بغیر کسی قصور کے موت کے گھاٹ اتار دو"

مگر بوڑھا ان ہراساں سوالوں کا کوئی جواب نہ دیتا، اسے سیاسی معلومات پر بڑا ناز تھا، مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آخر ایک جماعت نے دوسری جماعت سے مشورہ کر لینا کیوں ضروری نہ سمجھا، تو پھر کیا اس کی اور چاند کی تمام قربانیاں اکارت جائیں گی، اس کے ذہن کی بساط پر توقعات کے تمام مہرے پٹ جائیں گے، اور زندگی اسی طرح پابجولاں گھسٹتی کراہتی دم توڑ دے گی!

"گاندھی جی کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟" ایک روز بڑھیا نے پوچھا

"میں نہیں جانتا" بوڑھا اب اس موضوع کو چھیڑنے سے کتراتا تھا۔ "بس اتنا سنا ہے کہ کانگرس کے ایک بہت بڑے سردار انگریزی پڑھ رہے ہیں، ایک صاحب ہمارے محمد علی کی تجویز کے خلاف ایک کتاب لکھ رہے ہیں، اور ایک اور صاحب انسانی زندگی کے ارتقاء پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اور تھوڑا لکھنا باقی ہے"

"ارتقاء؟"

"ہاں۔ ارتقاء"

"یہ کیا ہوتا ہے"

"کوئی بڑی چیز ہوگی، بڑے آدمی بڑی چیزوں کے بارے ہی میں سوچتے ہیں"

اسی وقت کواڑ پر کسی نے دستک دی، بوڑھا بھاگ کر باہر آیا، قصبے سے ہرکارہ تار لے کر آیا تھا۔ "کب آئے گا میرا لال؟"

بڑھیا نے ہرکارے کے کندھے کو جکڑتے ہوئے پوچھا، بوڑھے نے لفافہ چاک کیا، بڑھیا لپک کر دیا اٹھا لائی، انگریزی تحریر کے نیچے لکھے ہوئے چند اردو حروف دیئے کی کانپتی ہوئی لو میں کانپے :-

"چاند خان چھٹی پر آ رہا تھا، بلوائیوں نے پٹڑی اکھیڑ لی تھی، اس لئے گاڑی الٹ گئی، اور چاند خان شدید زخموں کی وجہ سے مر گیا، حکومت آپ کے ساتھ ہمدردی کرتی ہے"

دیا دہلیز پر گر کر بجھ گیا۔ تار کے کاغذ کو تیز ہوا صحن کے ایک کونے میں اڑا لے گئی اور حیاتِ انسانی کا ارتقاء تکمیل کی آخری حدوں کو چھونے لگا!

احمد ندیم قاسمی

غزل

تاریخ میں جب تک مرا افسانہ رہے گا
فرزانہ جو ہوگا ترا دیوانہ رہے گا

آغوش میں تم ہاتھ میں پیمانہ رہے گا
آباد یونہی گوشۂ میخانہ رہے گا

جو حلقہ بگوشِ درِ مےخانہ رہے گا
وہ گردشِ ایام سے بیگانہ رہے گا

شغلِ دف و چنگ و مے و پیمانہ رہے گا
ہم ہیں تو یہی جلسۂ رندانہ رہے گا

یہ شہرِ محبت بھی عجب شعبدہ گہ ہے
آباد بھی ہو جائے تو ویرانہ رہے گا

تم آپ نہ آؤ گے، تو میں پہنچوں گا اُڑ کر
اِک رات بھی بے شمع نہ پروانہ رہے گا

وسعت مرے دل کی ہے دو عالم سے زیادہ
اب طور پہ کیوں جلوۂ جانانہ رہے گا

چلتے ہوئے دو جام ہیں ساقی تری آنکھیں
اب کس کو سرِ ساغر و پیمانہ رہے گا

گر سایۂ دیوار سے اِک بار اُٹھایا
سو حشر اُٹھا کر ترا دیوانہ رہے گا

اب صبح تلک شمع یونہی روتی رہے گی
قدموں میں غبارِ پرِ پروانہ رہے گا

کیا غم ہے جو اُٹھوایا ہے مجھ کو درِ مے آخر
اب اُس کی گلی میں میرا افسانہ رہے گا

گر ہیں یہی افکار نظیر اہلِ حرم کے
کعبہ میں بھی اندازِ صنم خانہ رہے گا

اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی

پنگل

ہندوستان کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کی ایجادات و اختراعات میں ساکنانِ خطۂ خاک کو کم اور مسند آرایانِ اورنگ چرخِ مینائی کو زیادہ دخل ہے۔ کسی علم کی ایجاد کے متعلق تحقیقات کی جائیں منتہائے تحقیق کوئی دیوی یا دیوتا ہوگا۔ اسی اصولِ موضوعہ کے مطابق پنگل کے جسے باصطلاحِ عربی عروض کہتے ہیں، امر مدبر مہا جی ہیں اور اس کے مدوّن پنگل۔ یا۔ پنگلا چاریہ ــ سنسکرت کا ہر لفظ کثیر المعنی ہے۔ یہی کیفیت لفظ پنگل کی ہے۔ اس کے بہت سے معانی میں سے ایک معنی ہیں "سانپ" ــ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ پنگلا چاریہ "شیش ناگ" کے اوتار ہیں جس کے پھن پر زمین قائم ہے اور جو تحت الثریٰ کا بادشاہ ہے۔ اسی مناسبت سے پنگلا چاریہ کو "اہی پھنی اور بھجنگ" بھی کہتے ہیں۔ ان سب لفظوں کے معانی ہیں "سانپ"۔

دنیا کی قدیم ترین کتاب رگ وید ہے۔ اسے صحیفۂ آسمانی کا مرتبہ حاصل ہے۔ ہماری نظم کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ طبعاً ہمارے عروض کی ابتدا بھی اسی سے ہوئی۔ نغماتِ وید کی تقطیع کرنے والے نے اصوات کی صرف دو قسمیں قرار دیں۔ مفرد جو ایک حرفِ متحرک ہے اور مرکب جو ایک حرف متحرک اور ایک حرف ساکن سے ظاہر کی جاتی ہے۔ جہاں کہیں وہ ایسے مجموعۂ اصوات سے دوچار ہو جو ایک متحرک اور دو ساکن حرفوں سے ظاہر کیا جاتا ہے، اس نے ساکن دوم کو بے تکلف نظر انداز کر دیا۔ سرود سرایانِ وید کے نغمات کی تقطیع کرنے والا آریہ ورت کا سب سے پہلا عروضی اس سے آگے نہ بڑھ سکا اور بڑھتا بھی کیسے جس مواد و مطالعہ سے وہ استخراج و استنباطِ اصول کا کام لے رہا تھا اس کی نوعیت دامن گیر تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ منتروں کا قافیہ ایک قسم کے ترنم کا حامل ہے مگر اجزائے منتر کے مصرعوں کے قافیہ سے مطابقت باہمی مفقود ہے۔ ان میں ایک ہی مصرع کے الفاظ کے اجزا میں اس قسم کا التزام موجود ہے جو ترنم پیدا کرتا ہے لیکن کسی منتر کے دو مصرعوں کے اجزا کے ترنم کا مدار ان کے قافیہ کی مطابقت پر نہیں یعنی اسے کوئی دو مصرع ایسے نہ ملے جن کی اصوات مفردہ و مرکبہ کی ترتیب میں مطابقت ہو۔ اس لئے اس نے اپنی تحقیق کا خاتمہ صرف اس کلیے پر کر دیا کہ وید کے منتروں میں تعدادِ اصول [اَکشَرَ अक्षर] معتبر ہے۔

ایرانِ قدیم کا عروض معدوم ہو چکا۔ ہخامنشیوں کا کیا ذکر شاید ساسانیوں کے عہد کی بھی نظم آج دستیاب نہیں۔ مگر ایرانیوں کے آبا و اجداد کی جو تصنیف رگوید سے پہلو مارتی ہے وہ ان کا صحیفۂ آسمانی "گاتھا" ہے۔ اس کے پانچ باب ہیں جو قطعات پر مشتمل ہیں۔ رگوید کی طرح ان کے قطعات کی تقطیع بھی جیسی کچھ ممکن ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عروضی اصولوں سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وہ ان اصولوں سے ارکان نہیں بنا سکتا۔

یورپ کے عروض کا دار و مدار بھی قریب قریب انہیں اصولوں پر ہے۔ وہ آواز کے زیر و بم (accented and unaccented syllables) سے اپنی نظم کی تقطیع کرتا ہے جس کی اگر تحلیل کی جائے تو وہ ہندوستانی اور ایرانی عروضیوں کا ہم نوا نکلے گا۔

یورپ، ایران اور ہندوستان کے عروضیوں کا ہم آہنگ ہونا کوئی امر حیرت انگیز نہیں۔ ان کے آبا و اجداد ایک ہی مقام سے خروج کر کے ممالکِ مختلفہ میں آباد ہوئے اور ایک روایت مشترکہ اپنے اپنے ساتھ لے گئے لیکن عرب کا عروض اس روایت میں شریک نہ تھا۔ ان سے اس کا اختلاف طبعی و فطری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیل ابن احمد بصری نے عروضِ عرب کو عروضِ یونان سے اڑایا ہے اور اس کے ثبوت میں چند لفظ پیش

گئے جاتے ہیں جو یونانی لفظوں کے مترادف ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ کہنا بے جا نہیں کہ ان کی ایجاد و اختراع اپنی اصل سے اس قدر دور جا پڑے جس قدر کہ بظاہر نظر آتی ہے۔ عروض عربی کے حقیقی سرمایہ سبب، وتد اور فاصلہ ہیں۔ اس میں سے سبب کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) خفیف یعنی ایک حرف متحرک مع حرف ساکن (۲) ثقیل یعنی دو حرف متحرک (۳) سبب متوسط یعنی ایک حرف متحرک مع دو حرف ساکن۔ وتد کی بھی تین قسمیں ہیں: (۱) مقرون یا مجموع یعنی دو حرف متحرک مع ایک حرف ساکن (۲) مفروق یعنی ایک حرف ساکن دو حرف متحرک کے درمیان (۳) وتد کثرت دو حرف متحرک مع دو حرف ساکن۔ اسی طرح فاصلہ منقسم ہے یعنی صغریٰ اور کبریٰ۔ اس میں سے صغریٰ میں تین حرف متحرک کے بعد ایک ساکن آتا ہے۔ اس میں سے سبب خفیف ایک جزو مؤکد (accented syllable) کے برابر ہے اور جزو غیر مؤکد (unaccented syllable) کسی کا بھی نہیں۔ سبب ثقیل دو اجزائے غیر مؤکد کا ہم پلہ ہے مگر عربی نے جزو غیر مؤکد کی انفرادی ہستی تو تسلیم ہی نہیں کیا۔ وتد مقرون یا مجموع ایک جزو غیر مؤکد اور ایک جزو مؤکد کا مجموعہ ہے، اسی طرح وتد مفروق بھی جس میں ترتیب مؤکد اور غیر مؤکد اُلٹ جاتی ہے۔ فاصلہ صغریٰ دو اجزائے غیر مؤکد اور ایک جزو مؤکد سے بنتا ہے۔ عروض عرب نے سبب، وتد اور فاصلہ فی نفسہٖ میں فرق و امتیاز پیدا کر دیا۔ اور اس کے لئے مجبور تھا کیونکہ وہ جزو غیر مؤکد کی انفرادی ہستی سے انکار کر چکا تھا۔ اصول کے بعد جب ارکان کی نوبت آئی تو ہند نے ان ہی تین تین اصول اور یورپ نے دو دو اصول رکھ کر انہیں بنا ڈالا مگر عروض عربی نے دو خماسی اور پانچ سباعی ارکان تسلیم کئے جن کے اجزا یا اصول یہ ہیں:-

ارکان خماسی:- (۱) فَعُولُنْ = وتد مجموع + سبب خفیف

(۲) فَاعِلُنْ = سبب خفیف + وتد مجموع یا مقرون

ارکان سباعی:- (۱) مَفَاعِیلُنْ = وتد مجموع + سبب خفیف + سبب خفیف

(۲) فَاعِلَاتُنْ = سبب خفیف + وتد مجموع + سبب خفیف

(۳) مُسْتَفْعِلُنْ = سبب خفیف + سبب خفیف + وتد مجموع

(۴) مُتَفَاعِلُنْ = سبب ثقیل + سبب خفیف (= فاصلہ صغریٰ) + وتد مجموع

(۵) مَفْعُولَاتُ = سبب خفیف + سبب خفیف + وتد مفروق

تطبیق کی مندرجہ بالا بنیادوں کے ماننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کہ ہند اپنے بحروں کو دو قسموں میں منقسم کر سکا یعنی مقداری، یا (ماترک - मात्रिक) اور اجزائی (ورنک - वर्णिक) یورپ اور عرب اپنے اپنے بحروں کی اس طرح کی تقسیم سے عاجز رہے اگرچہ یورپ کا یہ فعل تعجب خیز ضرور ہے کیونکہ وہ جزو غیر مؤکد کی انفرادی ہستی کو تسلیم کرتا ہے۔ ان کے ہاں صرف اجزائی بحریں ہیں۔ یورپ اور عرب کی بحروں میں صرف یہ فرق و امتیاز ہے کہ یورپ اجزائے مؤکد و غیر مؤکد سے ارکان بناتا ہے اور عرب چونکہ اجزائے غیر مؤکد کی انفرادی ہستی کا منکر ہے اس لئے ارکان ان اصول سے بنائے گئے ہیں جو اجزائے مؤکد اور غیر مؤکد کا مجموعہ ہیں۔ یعنی یورپ کے ارکان عرب کے اصول کا مرتبہ رکھتے ہیں۔

تصنیف وید کے عرصہ بعد اس پر نظر پڑی کہ بعض مصرعے جن میں اصول کی ایک خاص ترتیب ہے ترنم کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ارکان (گن: गण) وجود میں آگئے۔ وید بہت سے مقداری یا حروفی نظموں کا فقدان اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس نے ابتدا ہی سے ترنم کو پیش نظر رکھا اور رکن (فٹ - foot) بھی بنا ڈالے۔ عرب نے بھی یہی روش اختیار کی۔

ہندی اور اُردو نے سنسکرت اور عربی کے عروض اختیار کئے اس لئے تقطیع میں بھی وہی اصول رائج ہیں، جو

سنسکرت اور عربی ہیں ۔ یہ ایک حیرت انگیز امر ہے کہ جو قاعدے ان اصولوں کے اطلاق کے وقت برتے جاتے ہیں ۔ وہ بہت ہی تھوڑے سے فرق اور ترتیب کے ساتھ سب میں یکساں ہیں ۔ محض آواز پر دارومدار ہے، علامات آواز یعنی حروف خارج از بحث ہیں ۔ اگر وتا نظام [illegible] کی تعداد وقت تقطیع ہندی پہلے تعداد اصول دریافت کرتی ہے ۔ اس کے بعد ارکان کی طرف متوجہ ہوتی ہے ۔ اگر دو [illegible] کہ مصرعے ایک ہی تعدادِ مقدار یا حروف کے حامل ہیں مگر ان کے حرف مطابقتِ اصول سے عاری ہیں یعنی مصرعوں کے ارکانوں کی ترتیب میں مطابقت نہیں ، تو وہ انہیں مقداری یا حرفی قرار دیتی ہے اور اگر مصرع تعدادِ حروف اور مطابقتِ ارکان کے حامل ہیں تو اجزائی ۔ سب سے آخر میں حافظہ بروئے کار آتا اور بتاتا ہے کہ بحر کا نام کیا ہے ۔ اُردو میں یہ صورت ہے کہ بجائے اصول ارکان سے ابتدا کی جاتی ہے اور بحر کے نام کے لئے فوراً حافظہ پر تقاضا کر دیا جاتا ہے ۔ یہی طریقہ یعنی پہلی منزل کو نظر انداز کر کے دوسری منزل سے ابتدا کرنا تقطیع کے خلاف صدائے الامان بلند کرنے کا باعث ہوا ۔ اگر پہلے اصول دریافت کر کے ان سے ارکان بنائے جائیں ، اور ارکان سے بحر معین اور مشخص کی جائے تو شاید شدت کا سدِباب ہو جائے ۔ کیونکہ ارکانِ ہشتگانہ (فعولن ۔ فاعلن ۔ مفاعیلن ۔ فاعلاتن ۔ مستفعلن ۔ متفاعلن ۔ مفعولات) جو سالم بحروں کی اساس و بنیاد ہیں ، سبب اور وتد کی اُلٹ پلٹ سے بنے ہیں ۔ ارکان مزاحف اٹھارہ ہیں (فعِلُن ۔ فعِلن ۔ فعَل ۔ فاعِلیّان ۔ مَفعُو لُن ۔ مَفاعِلُن ۔ مَفعُو لُ ۔ مفعُو لُ ۔ مَفاعِیلُ ۔ مَفاعِیلُ ۔ فَعِلاتُن ۔ فَاعِلاتُ ۔ فَاعِلاتُ ۔ مُفتَعِلُن ۔ فَاعِ ۔ فَعْ ۔ فَعُو لُ ۔ فَعُو لُ) اور یہ سب بھی سبب اور وتد سے بنے ہیں ۔ فَاعِلیّان ۔ مَفعُو لُ ۔ مَفَاعِیلُ ۔ فَاعِلاتُ ۔ اور فَعُو لُ اس قسم کے ارکان مزاحف ہیں کہ جو اگر حشو میں واقع ہوں تو ان کا حرفِ آخر بوقت تقطیع متحرک ہو کر جزو سبب یا وتد ہو جائے گا لیکن اگر ضرب یا عروض میں واقع ہوں گے تو ان کا حرفِ آخر بحالِ خود قایم رہے گا ۔ اِس لئے بحر خواہ سالم ہو خواہ مزاحف ۔ جب ان اساسی و بنیادی اصول کے اطلاق سے دریافت کی جائے گی تو نہایت آسانی سے اس کا پتہ چل جائے گا ۔ دریافتِ اصول کے بعد دریافتِ ارکان دشوار نہیں ۔ تجربۃً دارومدار بہر صورت حافظہ پر ہے ۔ مگر جب ارکان معلوم ہو گئے تو مصرع کی بحر کی طرف بہت جلد خیال منتقل ہو سکتا ہے ۔ اگر عربی کے ارکان ماہر خاطر ہیں، تو پھر سنسکرت یا ہندی سے خوشہ چینی کرنی پڑے گی یعنی ہر مصرع کی تعداد اصول اور جس نام کی بحر اُس تعداد اصول کی حامل ہے ۔ اس کا نام ذہن میں محفوظ رکھنا پڑے گا ۔ مثلاً مفاعیلن ایک وتد اور دو سبب کا مجموعہ ہے سالم کہیں ایسے چار مجموعوں کی تکرار ہو تو بحر ہزج مثمن سالم کا ایک مصرع ہو گا اور کہیں ایسے تین مجموعے ملیں تو وہ بحر ہزج مسدس سالم کے وجود پر دال ہوں گے ۔ وقس علیٰ ہذا ۔ جس کا جی چاہے وہ ان اوتاد و اسباب دو اصل کی جا لفظ مقرر کرنے اور یوں اپنی جدت کا جھنڈا بلند کرے ۔ مثلاً زمانۂ قدیم میں سید انشا نے پری خانم سے بحر ہزج مثمن سالم کو سمجھانا چاہا ۔ زمانہ حال کے ایک عروضی نے سبب خفیف ۔ وتد مجموع اور فاصلہ کی جگہ بالترتیب "گل ۔ صبا ۔ چمنی" مقرر کئے اور اپنے نزدیک تقطیع کی وادیٔ پُرخار کو وادیٔ گل بنا دیا ۔ اور اس کے ایک مداح نے دعویٰ کیا کہ اس طریقے سے تمام سالم و مزاحف بحروں کی تقطیع بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گئی ۔ مگر ان بزرگوار نے غور نہیں فرمایا کہ وتد مفروق کے لئے اس اسکیم میں کوئی لفظ نہیں اور جہاں وہ واقع ہو گا ۔ اس کا حل کیا ہو گا ۔ مثلاً بحر ہزج مثمن مسبغ ہی کو لیجئے ۔ مفاعیلن کے بالمقابل تو "صبا گل گل" رکھ دیئے جائیں گے مگر رکن آخر مفاعیلان کی تقطیع کیونکر ہو گی ۔ "مناحی" تک تو "صبا گل" کام دے دیں گے ۔ مگر "لان" کے لئے ان تینوں میں سے کون سا لفظ رکھا جائے گا ۔ اگر چمن ہی کا تلازمہ منظور تھا تو "خار" کو نہ بھولنا چاہئے تھا جو گل سے بہتر مقام لیتا ہے ۔ یہاں وہ اگر گل سے اپنی برتری نہیں تو ہمسری کا ثبوت ضرور دیتا ۔

اب تین مصرعوں کی تقطیع کر کے طریقِ جدید کو سمجھایا جاتا ہے ۔

(۱) مرے خونِ ناحق کی دے گی گواہی ۔ فعولن چار بار +

	مے	خو	ن نا	حق	کی دے	گی	گوا	ہی
اصول	وتم	شیخ	وم	سخ	وم	سخ	وم	سخ
تقطیع غیر حقیقی	مفا	عی	مفا	عی	مفا	عی	مفا	عی
تقطیع حقیقی	فعو	لن	فعو	لن	فعو	لن	فعو	لن

ایسے ہی طرح کے مجموعہ ہائے اصول کی تکرار سے رُکن فوراً ہی معلوم ہو جاتا ہے۔

ایسا رُکن جو ایک وتد مجموع اور ایک سبب خفیف سے مرکب ہے وہ صرف فعولن ہے۔ اس لئے مصرع کی بحر چار بار فعولن ہے۔

(۲) دکھا دو ہم کو جمال اپنا میں جاں بلب ہوں یہ ٹال کیا ہے۔ فعولُ فعلُن چار بار

	دکھا	دو ہم	کو	جما	ل اپ	نا	میں جا	ن لب	ہوں	یہ ٹا	ل کیا	ہے
اصول =	وم	وم	سخ	وم	وم	سخ	وم	وم	سخ	وم	وم	سخ
غیر حقیقی =	مفا	مفا	فع	مفا	مفا	فع	معا	مفا	فع	مفا	مفا	فع
	فعو	فعو	لُن	فعو	فعو	لُن	فعو	فعو	لُن	فعو	فعو	لُن
حقیقی =	فعو	لُن فع	لن	فعو	لُ فع	لُن	فعو	لُ فع	لُن	فعو	لُ فع	لُن

اس مصرع میں دو وتد مجموع اور ایک سبب خفیف کی تکرار چار بار ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ایسے رُکن جن کی ابتدا وتد مجموع سے ہوتی ہے وہ فعولن۔ فعولُ۔ مفاعیلن۔ مفاعلن۔ اور مفاعیل ہیں۔ اور کوئی رُکن ایسا نہیں جو دو وتد مجموع اور ایک سبب خفیف سے بنا ہو۔ اور اس مصرع میں اسی مجموعۂ اصول کی تکرار ہے اس لئے اس مجموعۂ اصول کے ایسے ٹکڑے کرنے پڑیں گے کہ جن سے ارکان بن سکیں۔ چونکہ پہلے وتد مجموع کے بعد دوسرا وتد مجموع آیا ہے۔ اور اگر پہلے وتد مجموع میں دوسرے وتد مجموع کا پہلا حرف ملا دیا جائے تو فعولُ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے وتد مجموع کا جو حصہ باقی رہتا ہے وہ ایک سبب خفیف کے برابر ہے جس کے بعد ہی سبب خفیف آیا ہے۔ دو سبب خفیف سے فعلُن بنتا ہے۔ اس طرح اس مجموعۂ سبب اور وتد سے جس کی اس بحر میں تکرار ہے رُکن معلوم ہو گئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہ اس مصرع کی بحر فعولُ فعلُن چار بار ہے۔

(۳) تعزیر کی آنکھ عاصیوں سے۔ مفعولُ مفاعلُن فعولُن۔

	تع	زیر	کی آں	کھ عا	صیوں	سے
	سخ	وق	وم	وم	وم	سخ
غیر حقیقی	فا	علن	مفا	مفا	مفا	لُن
	مف	عولُ	علُن	علُن	علُن	مف
حقیقی	مف	عولُ	مفا	علن	فعو	لُن

اس مصرع میں تکرارِ مجموعاتِ اصول نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ ایک سبب خفیف اور ایک وتد مفروق سے مل کر رکن مفعولُ بنتا ہے۔ دو وتد مجموع سے مفاعلُن اور ایک وتد مجموع اور ایک سبب خفیف سے فعولُن۔

بادی النظر میں یہ طریق تقطیع پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن احساسِ پیچیدگی کا باعث جدت نہیں ہے بلکہ اس طرح سے تقطیع کرنے

۱؎ وم، وتد مجموع۔ ۲؎ سخ، وتد خفیف۔ ۳؎ وتد مفروق۔

کا عادی نہ ہونا۔ اگر رکن مع تجزیۂ اصول پیشِ نظر ہوں گے تو قطعی دقت محسوس نہ ہو گی۔

اسمائے بحور اُردو بے شک حافظہ پر بہت بار ڈالنے والے ہیں۔ لیکن مطالعہ اسمائے اشیاء اس امر کو منکشف کرتا ہے کہ تسمیۂ اشیا کسی اصول قاعدہ کا پابند نہیں۔ اس اقلیم میں ایک اور صرف ایک قانون رائج ہے۔ من مانی گھڑ جانی ۔۔۔ بشرطیکہ کسی شے کا نام رکھنے والے کی خودسری اور ضد قبولِ عام حاصل کرلے۔ مثلاً مچھلی جو سنسکرت کے لفظ मत्स्य سے نکلا ہے اس کا یہ نام اس واسطے نہیں رکھا گیا ہے کہ وہ تیرتی ہے اور تیرنے کی صلاحیت رکھتی ہے بلکہ اس کے لغوی معنی ہیں "مستانی" سے ملتے جلتے ۔۔۔ اسی طرح عربی میں انسان کے معنی محبت کرنے والا بتائے جاتے ہیں۔ اور گو اس میں تیرنے کی صلاحیت ہے مگر وجہ تسمیہ یہ صلاحیت نہیں۔ اس صورت میں اشتراکِ صلاحیت کے باعث یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ دونوں تیراک ہیں یعنی تیرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مچھلی اور انسان دونوں ایک ہی چیز ہیں یا اُن کو ہم نام ہونا چاہئے۔ کیونکہ بوقتِ تسمیہ صفاتِ مشترکہ خارج از بحث تھیں۔ محض ایتلاف[1] (association) پر اعتماد کرکے جس چیز کا نام رکھنا تھا، اسے ایک من مانے نام سے آراستہ و پیراستہ کردیا۔

تسمیۂ اشیاء کی یہ حالت ہونے کی وجہ سے سنسکرت یا ہندی نے تسمیۂ بحور کے متعدد طریقے اختیار کئے۔ اس نے بحروں کے نام کے لئے جانوروں کی آواز، رفتار اور اثرِ ترنم وغیرہ سے استفادہ کیا۔ عربی نے اپنے سالم بحروں کے نام کے لئے کبھی ترنم اور کبھی طریقِ ایجاد اختراعِ بحر کی طرف رجوع کیا۔ لیکن ہر بحرِ سالم میں جو تنوع پیدا کیا اس تنوع کے لئے اس نے کوئی ایسا لفظ مفرد وضع نہیں کیا جس سے اُس اصول کی پابندی نظر آتی جو اس نے بحورِ سالم کے تسمیہ کے وقت اختیار کیا تھا۔ بلکہ اس کے دماغ پر یہ خیال مسلط ہو گیا کہ وہ ایسا نام تراشے جو تنوعات کی توضیح ظاہر کرے اور اصل کا پتہ دیتا رہے۔ تنوع کا نام اس نے زحاف رکھا اور رکنِ سالم کے جس حصے پر اس نے عمل کیا اسے نظرانداز نہ ہونے دینے کے لئے اس نے الفاظ کے معنی لغوی یا وضعی میں توسیع کی یعنی ان کو نئے مطالب ادا کرنے کے لئے کام میں لاکر معنی مجازی سے آراستہ کردیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر زبان میں بے انتہا لفظ موجود ہیں جو وضعی اور مجازی دونوں طرح کے معنی رکھتے ہیں۔ عربی کے اس طریق تسمیہ نے جہاں یہ سہولت پیدا کردی کہ وہ اصل یعنی سالم بحر کے رکن کے جس حصے کی قطع و برید کی گئی ہے فوراً بتادے، وہاں نام کو اتنا طویل کردیا کہ حافظہ پر بار ہو گیا۔ اور وجہ شکایت پیدا ہو گئی اس لئے عصرِ حاضر کی جودت اگر بے تاب جلوہ ہے تو وہ انہیں نئے خلوت سے آراستہ و پیراستہ کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ان کے لئے ایک ہی لفظ مقرر کردے۔

علمِ عروض کی اساس و بنیاد کو سمجھ لینے کے بعد تقطیع وغیرہ میں دھوکا نہ کھانا چاہئے لیکن کہتے ہیں کہ اس میں بعض مستند عروضی بھی دھوکا کھا گئے۔ اس کی وجہ محض سرشتِ انسانی ہے جس کی خطا و نسیان سے تخمیر ہوئی ہے اسے اشکالِ عروض کی طرف منسوب کرنا اس کو بدنام کرنے کی ایک سعیِ نامحمود ہے۔ اسی طرح عروضیوں کا اختلاف بھی اُن مسائل میں سے ایک مسئلہ سمجھنا چاہئے جو مختلف فیہ ہیں۔ مثلاً قدیم آریوں کا وطن جنہوں نے اس پر توجہ دی ہے وہ جانتے ہیں کہ علمائے مشرق و مغرب میں کیسی کیسی کشاکش ہے ۔۔۔ رضی استرآبادی کا یہ مسلک معلوم ہوتا ہے کہ وہ آواز کو اصل مانتے اور چاہتے ہیں کہ بصورتِ تکرار ایک ہی قسم کے ترنم کا مدار ایک ہی قسم کے اجزائے اصوات پر ہو۔ اسی لئے اُنہوں نے کہا کہ اوزان حروف و الفاظ میں یعنی لفظوں سے وزن ظاہر کئے جاتے ہیں۔ علامہ جرجانی کی اس رائے سے کہ تعدادِ حروف کا اعتبار دونوں مصرعوں میں بالمقابل ضروری نہیں معقول ہے کیونکہ اکثر اصوات کے بتانے کے لئے ایک کی بجائے دو یا تین حرفوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً بالضرور۔ لیکن ان کا یہ قول کہ تعدادِ حرکات و سکنات کا اعتبار دونوں مصرعوں میں بالمقابل ضروری نہیں واجب الاذعان

---

1 اسم اور مسمّیٰ کا باہمی ربط یعنی نام زبان پر آتے ہی حافظے کا موسوم کی شکل کو چشمِ تصور کے سامنے پیش کردینا۔

ہیں۔ اس سے اگر کچھ معنی ہو سکتے ہیں تو اتنے کہ مختلف بحروں کے مصرعے ملا دیئے جائیں۔ یہ نہ کیا جائے گا تو عربی کی بحریں جو اس وقت سنسکرت
اعوانی بحروں کا جواب ہیں وہ متقدمی یا مردنی سے جا ملیں گی۔ اور عروض عربی نے سبب، وتد وغیرہ پر جو عمارت قائم کی ہے وہ منہدم ہو جائے گی
صورت میں علامہ کو بتانا چاہیے تھا کہ ہر مصرع میں وہ تند و اصوات کیا پسند فرماتے ہیں۔

عربی اور سنسکرت کے عروضوں میں جو اساسی و بنیادی فرق ہے وہ دکھایا جا چکا۔ وہ خیال کر اس نظریہ کی طرف مائل نہیں ہونے دیتا
عروض عربی نے چھندس سے گدائی کی ہو۔ کہیں کہیں جو مطابقت نظر آتی ہے وہ محض اتفاقی ہے۔ تاریخ بھی شاید اس نظریہ کی تائید
کرے گی ہاں۔ خوش اعتقادی ضرور اس کے آستانہ پر جبہ سائی کرتی رہے گی اور بےخبری باچشم نم یہ صدا بلند کرتی رہے گی کہ اگر نظم اردو
پنگل کی پابند ہوتی تو شاعر اس کے تمام اوزان و بحور میں شعر کہتے۔ ہائے۔ کیا کیا جائے۔ وہ تو عروض عربی کے دام بلا میں گرفتار ہے۔ کوئی
ب بحروں میں شعر کہے تو کیوں کر کہے۔ گویا ہر شاعر کا فرض ہے کہ جملہ بحور میں سمند فکر کی جولانیاں دکھائے مگر عروض عربی عناں گیر ہے۔

آثر بُدیش

غزل

دل کو کچھ اس ڈھب سے تم تڑپا گئے
میرے ماتھے پر پسینے آ گئے

بات کرنے کا ارادہ تھا ابھی
اور ابھی آنکھوں میں آنسو آ گئے

اپنی گستاخی پہ شرمندہ ہوں میں
تم یہ آخر کس لئے شرما گئے

مجھکو لائی تھی پریشانی مری
میکدے میں آہ تم کیوں آ گئے

خیر سے ہونے لگیں رسوائیاں
پھر جوانی کے زمانے آ گئے

مجید لاہوری

غزل

ترے تصور نے گُل کھلائے ہیں کیا کیا
ہجومِ غم میں بھی ہم مُسکرائے ہیں کیا کیا

نظر کو اُن کی طلب، دِل کو آرزُو اُن کی
فضائے دیدہ و دل پر وہ چھائے ہیں کیا کیا

بلا نہ محرمِ رازِ سکوتِ غم، ورنہ
نظر کے ساز پہ نغمے سُنائے ہیں کیا کیا

خیالِ ترکِ وفا بن سکا نہ ترکِ وفا
کسی کے لُطف و کرم یاد آئے ہیں کیا کیا

کبھی جو کوشش پیہم پہ بھی نہ یاد آئے
وُہ یاد آئے ہیں تو یاد آئے ہیں کیا کیا

گمانِ ترکِ محبّت ہُوا زمانے کو
رہِ وفا میں قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

سِکھا کے مہر و وفا ایک دشمنِ جاں کو
خود اپنی راہ میں کانٹے بچھائے ہیں کیا کیا

سکوتِ صبحِ ازل ہو کہ شورِ محشر ہو
تری نمُود نے فتنے اُٹھائے ہیں کیا کیا

کسے خبر کہ ستارے سے میری آنکھوں میں
زشام تا بہ سحر جھلملائے ہیں کیا کیا

نظر میں جچتا نہیں اب کوئی بھی اپنے سوا
کسی کے جلوے مرے کام آئے ہیں کیا کیا

کِسی کے طرزِ تغافل کو بھی حیا سمجھے
فریب ہم نے محبّت میں کھائے ہیں کیا کیا

حفیظ اُن کے تبسّم کے اِک اشارے نے
رُخِ بہار سے پردے اُٹھائے ہیں کیا کیا

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

وُہ مجھ سے، مَیں اُن سے ہوں گریزاں
تنہا تنہا، اُداس حیراں

انجامِ وفا پہ ناپشیماں
اپنی اپنی خطا پہ نازاں

دو سینوں میں ایک داغ روشن
داغِ جَور و جفائے دَوراں

چہرے پہ ملُول سا تبسّم
شبنم کا نزول زیرِ مژگاں

ہونٹوں پہ رُکے ہُوئے سے نغمے
آنکھوں میں تھمے ہُوئے سے طوُفاں

پیمانِ وفا کی اَور تھی بات
تکمیلِ وفا نہ تھی کچھ آساں

دامانِ شبِ سیاہ سے ہو
اے کاش طلوعِ صبحِ خنداں

وُہ میرے لئے ہو پھر نوا سنج
مَیں اُس کے لئے ہوں پھر غزلخواں

حفیظ ہوشیارپوری

دیہاتی

"اور اگر تمہیں نہ لیا گیا تو؟"

"میں نہیں جانتا میں کیا کروں گا؟"

"اچھا تم باہر ٹھہرو۔"

وہ سر نیہوڑائے ہوئے بھرتی کے دفتر سے باہر نکل آیا۔ ایک وردی پہنے ہوئے کلرک نے اس کی ازخود رفتگی بھانپ کر اُسے ایک بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس کے ہاتھوں میں ابھی تک اُس کی ڈگری، سندات اور سرٹیفکیٹ ایک پریشان پلندے کی صورت میں پکڑے ہوئے تھے۔ یہ سرٹیفکیٹ اُس نے سکول اور کالج کے مختلف درجوں میں بڑے شوق سے جمع کئے تھے۔ لیکن بھرتی کرنے والے افسروں کے سامنے جب اُس نے یہ پلندہ کھول کر میز پر بڑھایا تو ایک افسر نے نہایت بے اعتنائی سے یہ سرٹیفکیٹ اُس کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا تھا۔

"مسٹر عشرت یہاں تین افسر آپ سے ملاقات کرنے کے لئے جمع ہیں اور وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آپ فوج کے کس کام آسکتے ہیں؟ ہمیں ان کاغذوں سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہمارے نزدیک ان کی کوئی وقعت ہے۔"

عشرت سوچنے لگا:۔ میں فوج کے کس کام آسکتا ہوں؟ اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا ہے؟ میرا باپ سپاہی نہیں تھا۔ اور میرے دادا نے فوج کا نام تک نہ سنا تھا۔ لہٰذا میرا یہاں آنا خاندانی روایات کو قائم رکھنے کے لئے نہ تھا۔ میں فوج کے کسی کام آنے کے لئے تو بھرتی ہونے نہیں آیا۔ میں تو محض اپنی فاقہ مستی کو دور کرنے کے لئے بھرتی ہونا چاہتا ہوں۔ میں تو بھوکا ہوں۔ سرکاری راشن سے اپنا پیٹ بھرنا چاہتا ہوں۔ میرے کپڑے پھٹ رہے ہیں۔ میں وردی سے تن ڈھانپنا چاہتا ہوں۔ لیکن کیا انٹرویو کرنے والے افسر یہ جواب پسند کریں گے؟ کیا وہ اُس کے بیان کو حقیقت سمجھتے ہوئے اُسے ملازم رکھ لیں گے؟ اُس کی زندگی کا تجربہ تھا۔ کہ سچ بولنے سے ملازمت حاصل کرنے میں اُسے آج تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بڑے بڑے دفتروں کے اسے گرد چکر لگاتے لگاتے اب ذہنی اور جسمانی طور پر نڈھال ہو رہا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ صرف سچ بولنے کی بجائے کوئی دفعدارانہ جواب دے دے۔ بالآخر اُسے جواب سوجھ گیا۔ اور اُس نے کہہ دیا:۔

"میں حکومت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

ملاقات کرنے والے تینوں افسر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں مسکرائے اور پھر صدر نے اپنی آنکھیں عشرت کے چہرہ پر گاڑتے ہوئے کہا:۔

"آج جنگ شروع ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ تمہیں اس سے پہلے حکومت کی خدمت کرنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟ اور پھر تمہیں ڈگری لئے ہوئے بھی دو سال ہو چکے ہیں!"

عشرت کے دماغ میں ایک ہلچل مچ گئی۔ یہ اُس نے کیا کہہ دیا تھا؟ وہ کس حکومت کی خدمت کرنا چاہتا تھا؟ اُس کے ذہن میں حکومت

سے لفظ کا ایک دھندلا سا خاکہ بھی موجود نہ تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ ایک ایسے نظام میں جکڑا ہوا تھا جس میں ہوش سنبھالنے کے دن سے لے کر اب تک اس کے لئے مصیبتیں ہی مصیبتیں تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے عوام کی ان مصیبتوں کے لئے حکومت ذمہ دار تھی۔ اس نے حکومت کا ذکر صرف اخباروں میں ہی پڑھا تھا۔ کبھی بادشاہ کی طرف سے کوئی اعلان ہوتا تو اس میں یہ درج ہوتا کہ ہماری حکومت یہ کریگی اور وہ کرے گی۔ کبھی وزیر اعظم کی طرف سے حکومت کا ذکر اسی انداز میں ہوتا۔ لیکن حکومت کے متعلق یہ سب اخباری بیان اس کے کسی کام کے نہ ہوتے۔ اس کی زندگی کا صرف ایک ہی مسئلہ تھا۔ اور وہ تلاش معاش تھا۔ جس کا حل وہ آج تک نہ پا سکا تھا۔ کئی دفعہ کئی قومی رہنما اخباروں میں بیکاری کا سبب حکومت کی غفلت کو قرار دیتے لیکن حکومت کی طرف سے ان الزامات کا جواب کبھی نہیں دیا گیا تھا۔ اس لئے اسے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ حکومت کیا چیز ہے زیادہ سے زیادہ یہ متعین کر سکا تھا کہ حکومت ایک اندھا، بہرا، اور گونگا پتھر یا اسی قسم کی کوئی جامد چیز ہے جو کبھی کسی کے قبضے میں ہوتی ہے اور کبھی کسی کے لیکن یہ حکومت خود نہ دیکھ سکتی ہے نہ سن سکتی ہے اور نہ بول سکتی ہے۔ اور اخبارات اور اشتراکیوں کے بیانات کے باوجود حکومت کو اس کی بیکاری یا تلاش معاش سے کوئی سروکار نہ تھا۔ پھر وہ ایسی حکومت کی خدمت کیوں کرنا چاہتا تھا؟ صرف اس لئے کہ اس نے یہ جواب کئی ایسے آدمیوں سے سنا ہوا تھا جن کو اس جواب کی بدولت ملازمت مل چکی تھی۔ لیکن اب وہ یہ کیسے بیان کر سکتا تھا۔ کہ وہ تو ایک عرصہ سے بھوکوں مر رہا تھا۔ اور فاقوں سے نجات پانے کے لئے وہ کئی سالوں سے حکومت کی خدمت کرنے کے لئے تیار تھا۔ لیکن بدقسمتی سے آج تک اسے بھرتی کے دفتر کا راستہ دکھانے والا کوئی آدمی نہیں ملا تھا۔ اور آج جب پہلی مرتبہ سڑک پر چلتے ہوئے اسے ایک آدمی نے کہا "مسٹر جاسے ہاں گزیٹڑوں کی ضرورت ہے۔ سوا سو روپیہ تنخواہ وردی راشن مفت۔ فوج کی نوکری میں تین باتیں بہت اچھی ہیں۔ اچھی تنخواہ۔ اچھی خوراک۔ جلدی ترقی" تو وہ فوراً اس کے ساتھ ہو لیا۔

عشرت کا ذہنی ہیجان یہاں آکر رک گیا۔ اس نے زیر لب ایک دو دفعہ "اچھی تنخواہ، اچھی خوراک، جلدی ترقی" دہرانے کی کوشش کی۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ شاید یہ جواب بھی موزوں نہیں، اور اس نے ذہنی کرب ابتلا سے نجات پانے کے لئے شکست خوردہ انداز میں کہہ دیا:-

"میں آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا"

"تو پھر تمہیں ملازمت بھی نہیں دی جا سکتی"

عشرت نے ایک دفعہ اپنی جرأت کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پوچھ ہی لیا:-

"کیوں؟"

"تم فوجی کام کے لائق نہیں۔ ہمیں تم میں یہ صلاحیت نظر نہیں آتی۔ تم نے قومی کالج میں پسماندہ لوگوں کی طرح تعلیم پائی ہے اس کے بعد تم نے دو سال گاؤں میں رہ کر اپنی عقل کو زنگ لگا دیا ہے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد تمہیں اپنی عقل کو جلا دینے کے لئے اور اپنے آپ کو مفید شہری بنانے کے لئے شہر میں رہنا چاہئے تھا۔ اور شہر میں رہ کر دونوں آنکھوں اور دونوں کانوں سے کام لینا چاہئے تھا۔ تاکہ تم ہر اس مفید کام کو دیکھ سکتے جو شہر کے رہنے والے کرتے ہیں اور ہر مفید بات کو سن سکتے جس سے شہری اپنی زندگی کو چار چاند لگاتے ہیں۔ اس وقت ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہاری معاشی وضع قطع فوجی سانچے میں نہیں ڈھالی گئی۔ تم دیہات میں رہ کر ضرورت سے زیادہ دیہاتی بن چکے ہو۔ تم کچھ دنوں کے بعد پھر یہاں قسمت آزمائی کرنے آؤ۔ اگر تم گاؤں واپس جانا چاہو تو کلرک تمہیں تمہارے قریبی ریلوے اسٹیشن کا واپسی ٹکٹ دے دے گا۔ اچھا خدا حافظ"

فوجی افسر نے عشرت سے مصافحہ کیا۔ اور دروازہ کھول کر دفتر سے باہر نکال دیا۔ باہر کلرک نے واپسی ٹکٹ تیار رکھا ہوا تھا۔ جو عشرت کے دستخط لے کر اُس کے حوالہ کر دیا گیا۔ عشرت اس ٹکٹ کو ہاتھوں میں مسلتا ہوا دفتر کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ اُس کے پاؤں غیر ارادی طور پر حرکت کر رہے تھے اور وہ ریلوے سٹیشن پر جانے کی بجائے شہر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اب اُس کے ذہن میں ایک نئی طرح کا تلاطم بپا تھا۔ جتنی تیزی سے وہ ٹکٹ کو انگوٹھے اور درمیانی اُنگلی سے مسلتا اُتنی ہی سُرعت سے ملاقات کرنے والے فوجی افسروں کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجنے لگتے۔ "تم دیہات میں رہ کر ضرورت سے زیادہ دیہاتی بن گئے ہو۔ .... تم فوجی کام کے لائق نہیں۔ .... تم نے گاؤں میں رہ کر اپنی عقل کو زنگ لگا لیا ہے۔ .... تمہاری معاشی وضع قطع فوجی سانچے میں نہیں ڈھالی گئی .... " کیا یہ سب کچھ سچ تھا؟ عشرت سوچ رہا تھا۔ کیا ان فوجیوں کا میرے متعلق اندازہ بالکل صحیح تھا؟ کیا اُن کا مشورہ درست تھا۔ "تمہیں اپنی عقل کو جلا دینے کے لئے اور اپنے آپ کو مفید شہری بنانے کے لئے شہر میں رہنا چاہئے تھا"؟

عشرت دفعتہً رُک گیا۔ شہر کی بہترین عشرت گاہ اُس کے سامنے تھی کمخواب کے زرنگار گراں بار پردوں کے سامنے لگی ہوئی جالی سے مغربی موسیقی کی دھیمی دھیمی سُریں چھن چھن کر سڑک پر پہنچ رہی تھیں۔ عشرت نے ایک مرتبہ گردوپیش پر نظر ڈالی۔ شہر کی اونچی اُونچی عمارتیں خاموش مگر ہیبتناک وقار کے ساتھ سڑک کے دورویہ کھڑی تھیں۔ سڑک پر تانگوں، موٹروں، بسوں اور پیدل چلنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ شہر کی خاک ابھی ابھی سو کر اُٹھی تھی اور اس خاک کے بگولے نرالی موٹروں کے پیچھے دوڑتے تھے اور راہگیروں کے نتھنوں میں گھُستے تھے۔ مرد، عورتیں، عام شہری اور فوجی کھانا کھانے، شراب پینے اور گانا سُننے کے لئے سامنے کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔ عشرت ایک مرتبہ اس عمارت کے سامنے اس طرف سے اُس طرف گیا اور ایک مرتبہ اُس طرف سے اس طرف۔ جیسے یہ ساتھ سے اُس کی لمبائی اپنے قدموں سے ناپ رہا تھا۔ پھر ایک دروازے کے سامنے آ کر رُک گیا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے ملازم نے اُسے رُکتے ہوئے دیکھ کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔ عشرت نے ریلوے کے ٹکٹ کی طرف دیکھا۔ اس وقت تک وہ چُر مُر ہو کر کئی جگہوں سے پھٹ چکا تھا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر ٹکٹ ایک طرف پھینک دیا۔ اور زقند لگا کر دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک ملازم نے لپک کر اُس کے ہاتھ سے ٹوپی تھام لی۔ اور ساتھ لگی ہوئی ایک کھونٹی پر اُسے لٹکا دیا۔ ٹکٹ کو پھینکنے سے عشرت کو ایسے محسوس ہوا جیسے اُس کے دماغ پر پڑا ہوا فکر کا ایک بھاری پتھر ہٹا دیا گیا ہے۔ کھانا کھانے کے ہال کی دھندلی روشنی میں اُس نے عجیب قسم کا سکون محسوس کیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دیکھ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اب اُس کے ذہن میں تلاطم اور ہیجان کی جگہ ایک نامعلوم سا خوف طاری ہو رہا تھا۔ لیکن گداز اور لچکدار نشست پر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد دفعتہً اُس کا جسم اور دماغ آسودگی اور فراغت کے نشے سے محظوظ ہونے لگا۔ ہال کی تمام نشستیں کم و بیش لگی ہوئی تھیں۔ اور لوگ اکل و شرب میں مصروف تھے۔ اُس کے عین سامنے ایک پوری دیوار پر ایک دلکش تصویر بنی ہوئی تھی۔ جس میں سر بفلک پہاڑیوں کی بلندی کو چیرتی ہوئی سبز رنگ کی ایک ندی پہاڑیوں کے دامن میں سے گزر رہی تھی۔ جہاں مغلئی لباس پہنے ہوئے ایک حسینہ اپنا ورک بڑھا کر اس ندی کے تاریک دھارے سے اپنی پیاس بجھا رہی تھی۔ اسی تصویر کے ساتھ ہی ایک لمبی میز پر کئی قسموں کی شراب اور پینے کے رکھے ہوئے ایک سفید پوش ملازم کھڑا ہوا تھا۔ جو ہر قریب سے گزرنے والے آدمی کو آنکھوں ہی آنکھوں سے [illegible]

زاں پیش کہ بر سرت شبخوں آرند — فرمائی کہ تا بادۂ گلگوں آرند

تو زر نہ ای غافل نادان کہ ترا — در خاک نہند و باز بیروں آرند

عشرت کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے اس جدید میکدہ کے نئی طرز کے ساقی سے دوچار ہوئیں۔ وہ خاموشی سے ہر پینے والے کی فرمائش پر مطلوبہ شراب اور اُس کی مقدار اُنڈیل کر گلاس کو سوڈے سے بھر دیتا اور گاہک مسکراتا ہوا ایک یا دو گلاس اُٹھا کر قریب کے میز پر بیٹھ جاتا۔ تہلیت والے کم تھے۔ بیشتر کے ساتھ پینے والیاں تھیں۔ اُن کے بھڑکیلے اور شوخ لباسوں کو دیکھ کر عشرت کو وہ رنگا رنگ تیتریاں یاد آتیں جو مارچ اور اپریل کے زمانے میں اُس کے گاؤں کے کھیتوں میں کثرت سے اُڑا کرتی تھیں۔ ان لباسوں کی تنگ دامنی سے کئی بھرے بھرے جسم اسی طرح باہر نکلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ جیسے بہار کے آغاز میں یہ تیتریاں اپنے خول سے پیدا ہونے کے وقت نکلا کرتی تھیں۔ عشرت کی نظر ایک دفعہ پھر اُن بوتلوں پر پڑی جن کے مختلف رنگ اپنی دلآویزی سے اُفق کے اُن رنگوں کو مات کر رہے تھے جو سورج غروب ہونے کے وقت آسمان پر نظر آنے لگتے ہیں۔ اُسے ایک دفعہ پھر فوجی افسر کی طنزیہ تنقید یاد آگئی ”تم نے گاؤں میں رہ کر اپنی عقل کو زنگ لگا لیا ہے“ وہ سوچ رہا تھا ان بوتلوں کا ارغوانی پانی عقل کو جلا دینے کے لئے کتنا مفید تھا۔ جو تین سے تین آدمی سفید پوش، ملازم سے گلاس لے کر پرے ہٹتا تھا وہ چند ہی گھونٹ پینے کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ کس شوخی اور بیباکی سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ اور بعض تو اس قدر زور سے ہنستے تھے جیسے اپنے جیب پھیپھڑوں کو ہوا دینے کے لئے سب سے موزوں یہی جگہ تھی۔ لیکن اُسے اپنے گاؤں کے گھر میں تو آج تک یہی بتایا گیا تھا۔ کہ شراب پینا گناہ ہے۔ اُسے صحیح طور پر یہ تو معلوم نہیں تھا۔ کہ گناہ کیا ہوتا ہے لیکن اُس کے گاؤں اور اُس کے قومی کالج میں شراب“ اور گناہ“ کے لفظ کو اس کثرت اور تواتر سے اس انداز میں اکٹھا استعمال کیا گیا تھا کہ اُسے شراب سے ڈر آنے لگا تھا۔ حالانکہ یہاں بیشتر لوگ اسے بڑے شوق اور بے خوفی سے استعمال کر رہے تھے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر ذہنی طور پر پھر پریشان ہونے لگا۔

”صاحب آپ کیا کھائیں گے؟“ ایک ملازم نے یکبہ کر اُسے چونکا دیا اور ساتھ ہی کھانوں کی ایک لمبی فہرست اُس کے سامنے رکھ دی۔ کچھ چیزوں کے نام وہ سمجھ سکتا تھا۔ باقی کے نام شاید فرانسیسی یا لاطینی میں لکھے ہوئے تھے۔ کم از کم وہ ان کا مفہوم معین کرنے سے قاصر تھا۔ اُس نے مضطرب ہو کر ایک دو سادہ کھانوں پر اُنگلی رکھ دی۔ ملازم نے مسکرا کر اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ اور پوچھا ”کیا پئیں گے؟“

”کیا ہو گا؟“ عشرت نے دبی آواز میں کہا۔ گھر پر تو کھانے کے ساتھ پانی ہی پیتے ہیں۔ شہر کے لوگ کیا پیتے ہیں؟ اُس کی آنکھوں کے سامنے گاؤں کے تنور کی دو موٹی موٹی اور بھدی روٹیاں گھومنے لگیں۔ جن کے وسط میں سرسوں کا ساگ بے قاعدگی سے رکھا ہوا ہوتا تھا۔ ساگ کے ساتھ ہی اُسے لسی یاد آگئی۔ چھاچھ کا ایک مٹی کا کٹورا۔ لیکن یہ ہر روز میسر نہ آتا تھا۔ عام طور پر کنوئیں کا تازہ پانی ہی پینا پڑتا تھا۔ لیکن یہاں کنواں کہاں؟ وہ گھبرا سا گیا۔ معاً ملازم نے کہہ دیا:-

”حضور بیئر پسند کرتے ہیں یا وسکی؟ لائم اینڈ لیمن بھی حاضر ہے۔ ہیگ آج ہی کائی ہے۔ برسوں کے بعد۔ جنگ کی وجہ سے نایاب تھی“

عشرت کو ایسے محسوس ہوا جیسے غالب اپنی صراحی اور سبو کو ساتھ لے کر اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے اور [illegible]

؎ زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ذوق نے بھی تو کچھ ایسی ہی بات کہی تھی۔ لیکن ابھی ایسی جلدی ہی کیا ہے۔ اُس نے اپنے ذہنی انتشار پر قابو پاتے ہوئے

"صرف سادہ پانی"

"بہت اچھا حضور" ملازم مایوس انداز میں مسکراتا ہوا چلا گیا۔

عشرت نے اپنے حواس کو جمع کرتے ہوئے اب ذرا فراغت سے پھر ادھر ادھر نظر ڈالی۔ طرح طرح کے دیسی اور انگریزی
انوں سے لے کر سؤر کے کبابوں تک سبھی کچھ یہاں موجود تھا۔ اور ہر مذہب و ملت کے آدمی شانے سے شانہ لگائے بڑی
ت سے کھانوں کی فراوانی سے متمتع ہو رہے تھے۔ یوں تو سب لوگ کھانے کے فرنگی ظروف و آلات استعمال کر رہے تھے۔ لیکن
ی تک کالوں نے گوروں کے انداز پوری طرح نہیں سیکھے تھے۔ مثلاً گورے نہایت خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے یا کبھی کبھی دھیمی
از میں باتیں کرتے تھے لیکن آقا کے نقال غلام اس قدر بلند آواز سے باتیں کرتے تھے کہ ہال گونج اٹھتا اور کھاتے وقت چپڑ چپڑ
آواز نکالنا اور باتیں کرتے ہوئے ان سے رنگے ہوئے دانتوں کے درمیان لقمے کو دکھانا تو گویا یہ ایک فن سمجھتے تھے۔ بعض اصحاب
ی پر آلتی پالتی مار کر بھی بیٹھے ہوئے تھے اور موقعہ پا کر میز کے نیچے جھک کر تھوک بھی لیتے تھے۔

ملازم کھانا لے آیا۔ عشرت کی بھوک چمک رہی تھی لیکن یہاں کس چیز کی کمی تھی۔ ملازم نے ایک خالی پلیٹ عشرت کے
امنے رکھ دی۔ اور ساتھ ہی گوشت سے بھری ہوئی ایک طشتری آگے بڑھا دی تاکہ گاہک اپنی ضرورت کی مقدار اپنی خواہش
مطابق لے لے۔ بعد میں سبزی کی طشتریاں بھی اسی طرح اس کے سامنے پیش کی گئیں۔ کام و دہن کی تواضع کے دلفریب سامان
یہ فراوانی دیکھ کر عشرت کو ایک انگریزی اخبار کی وہ تصویریں یاد آگئیں جن کی اشاعت ہندوستان میں تو ممنوع قرار دی گئی
لیکن لندنی اخبار کے ایک نامہ نگار نے بنگال کے قحط کے زمانے میں یہ تصویریں اپنے اخبار کے لئے حاصل کر لی تھیں۔ اور
اخبار کی اشاعت یا درآمد پر ہندوستان والوں کا کوئی بس نہیں چلتا تھا۔ اس اخبار نے ان تصویروں کے نیچے لکھا تھا
ہم یہ تصویریں شائع نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔ کیونکہ ہمیں ان کو دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔ ان کو دیکھ کر ہر ایک کو تکلیف ہوتی ہے
لیکن ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔" ان تصویروں میں پہلی تصویر ایک ماں اور بچے کی تھی جس
نیچے لکھا ہوا تھا "کیا یہ ننھی سی جان بچہ ہے جس کے سر کی ہڈیوں کے سوا جسم کی ہر ایک چیز سکڑ کر رہ گئی ہے؟ کیا یہ بچہ بھی ہمارے
بچوں کی طرح ہے؟" ایک دوسری تصویر میں ایک سڑک کے کنارے ایک مردہ پڑا ہوا تھا جس کی تمام پسلیاں دور سے
ی جا سکتی تھیں۔ اور اس کے نیچے لکھا ہوا تھا "اس ہندی فقیر کو اب بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ غم زندگی سے
ت پا چکا ہے۔ اب وہ گلیوں میں بھیک نہیں مانگتا۔ اسے تو اس کی بھی پروا نہیں کہ کوئی اس کے پنجر کو سڑک سے ہٹاتا ہے یا نہیں۔"
عشرت کے جسم میں ایک جھرجھری سی آگئی۔ وہ جب چھری کانٹے سے سامنے رکھے ہوئے گوشت کو کاٹتا تو اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے
س کی چھری بنگال کے قحط میں مرے ہوئے فقیر کی بے گوشت پسلیوں سے ٹکرا رہی ہے۔

چھن! چھن!! چھن!!!

عشرت نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ہال کے وسط میں خالی پڑی ہوئی جگہ پر ایک رقاصہ پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگھروں کی
جھنکار سے حاضرین سے کہہ رہی تھی کہ "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" کی جستجو ہو تو میری طرف دیکھو۔ سب حاضرین کی نگاہیں
اس پرکالۂ آتش پر مرکوز ہو گئیں جو بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح اور چلتے ہوئے سیمابے کی تیزی کے ساتھ سازوں سے ہم آہنگ
ناچ رہی تھی۔ لہرائے ہوئے سیاہ بالوں میں گلاب و یاسمن کے پھول اپنی تازگی سے پہننے والی کے حسن کی شادابی سے
مقابلہ میں مصروف تھے۔ شانوں سے ذرا نیچے سے لے کر پیٹ کے وسط تک اور کمر سے لے کر گھٹنوں تک ... ست کپڑائی

رنگ کے ریشم سے جسم کی خوبصورتی کو نمایاں کیا گیا تھا اور باقی جسم پر کچھ اس قسم کا چمکدار پاؤڈر ملا گیا تھا کہ دیکھنے والے کی نگاہ مستی کے بغیر ہی بکھر بکھر جاتی تھی۔ سازوں کی دھن کے ساتھ ایک سازندہ ساون کی آمد آمد کے مضمون کی حامل ایک نظم گا رہا تھا جو بادل دیکھ کر کی بدولت سارے ہال میں سنائی دے رہی تھی اور رقاصہ ناچتی ہوئی اپنی حرکات سے ساون کی منظر کشی کی سعی کر رہی تھی۔ کالے کالے بادلوں کے اُمڈ اُمڈ کر آنے سے لے کر موسلا دھار بارش کے برسنے تک سبھی مناظر کی تصویر رقاصہ نے اپنے ہاتھوں اور سر کی جنبش سے کھینچ دی۔ گھنگھور گھٹاؤں کے چھا جانے کے بعد سیاہ بدلیوں میں بجلی کوندنے کا سماں جب اُس نے دہشت افزا آنکھوں اور سہمے اور پیاسی اُٹھی ہوئی مگر تھرتھراتی ہوئی اُنگلیوں سے باندھا تو عشرت کو ایسے محسوس ہوا جیسے ہال میں سچ مچ بجلی کوند رہی تھی۔ عشرت نے کھانا ختم کر کے کرسی اُس سمت میں سرکالی جہاں سے ناچنے والی کی ہر حرکت واضح طور پر دکھائی دیتی تھی۔ ساون کی موسلا دھار بارش کو دیکھ کر اس وقت ایک دوشیزہ باغ میں اپنی جوانی کی سرمستیوں سے مدہوش ہو کر ناچ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ بار بار اُس کے سینے تک اُٹھ رہے تھے۔ اور وہ بلند آواز سے گا رہی تھی۔

میرے جوبنا کا دیکھو اُبھار

اس اُبھار کا ناز ایک تند شراب کی طرح دوشیزہ کے سر میں خمار پیدا کر رہا تھا۔ اور وہ لوگوں کو نادر سے نادر تشبیہ کے ساتھ اس حقیقت کو تسلیم کرانے میں مصروف تھی "جیسے۔ بالک اُدھم! جیسے سینگے سے بم!!" دوشیزہ نے گایا عشرت لطف اندوز ہونے لگا۔ بھکتے ہوئے بچے کی کتنی نادر تشبیہ تھی لیکن بم کا نام سن کر اُس کے دماغ میں پھر محاذ کی یاد تازہ ہو گئی۔ بم! بم تو میدانِ جنگ میں کام آتے ہیں۔ یہ دوشیزہ ان بموں کو سُٹا کر کس سے لڑنا چاہتی تھی؟ اس عالمگیر جنگ کا اثر کہاں کہاں تک جا پہنچا تھا!

"حضور اور کچھ لیں گے؟" ملازم نے ایک دفعہ پھر عشرت کو چونکا دیا۔ رقاصہ تھکتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ساز خاموش ہو گئے اور عشرت سب لوگوں کے ساتھ مل کر تالیاں بجا رہا تھا۔ عشرت نے پھر کر ملازم کی طرف دیکھا۔ اور ایک لمحہ کے تامل کے بعد بولا:۔

"نہیں اور کچھ نہیں لیں گے۔ بل لاؤ۔"

ملازم نے نقرئی طشتری میں رکھا ہوا بل پیش کر دیا۔ پنسل سے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "ساڑھے پانچ روپے"۔ عشرت کا دماغ چکرا گیا۔ چلتے وقت ماں نے کہا تھا "بیٹا شہر میں کوئی سفارش نہ ہو تو رشوت سے کام چلتا ہے۔ تمہارے مرحوم باپ بھی کہا کرتے تھے۔ شہر والوں میں سیدھی انگلیوں سے کبھی گھی نہیں نکلتا۔ تم ہر بار تلاشِ معاش میں شہر جاتے ہو اور مایوس ہو کر لوٹ آتے ہو اس دفعہ یہ سو روپیہ ساتھ لے جاؤ۔ اس فصل میں سے صرف یہی بچت ہوئی ہے۔ اگر یہ تمہارے کام آ جائے تو میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کا باعث اور کیا ہو سکتا ہے۔ موقعہ ہو تو کسی شہری کو یہ رقم چٹا دینا۔ شاید تمہارا کام بن جائے اور تم دربدری سے بچ جاؤ۔"

عشرت نے ڈرتے ڈرتے ماں کے دیئے ہوئے نوٹوں کو ٹٹولا اور جیب کے اندر ہی اندر ساڑھے پانچ روپے گن کر طشتری میں رکھ دیئے۔ ملازم طنزیہ انداز میں مسکرایا جیسے کہہ رہا تھا "تم شہر کے نئے شکار ہو" اور پھر اُس سے رہا نہ گیا۔ اور اُس نے کہہ ہی دیا "حضور ہمارا انعام؟" عشرت پوچھتے پوچھتے رک گیا "وہ کیا ہوتا ہے؟" اور پھر اُس نے خاموشی سے ایک دونی نکال کر طشتری پر پھینک دی۔ ملازم نے اس انداز سے طشتری سامنے سے ہٹا لی جیسے وہ کہہ رہا تھا "اگر انعام دینے کے لئے تمہارے پاس پیسے نہ تھے۔ تو تم نے کھانا کیوں کھایا تھا؟ کھانے کی قیمت ادا کرنے سے انعام دینا زیادہ ضروری تھا۔"

عشرت ٹوپی سنبھالتا ہوا ریسٹوران سے باہر نکل آیا۔ اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی۔ وہ چلچلاتی دھوپ میں کچھ دور

سڑک پر ایسے ہی چلتا رہا۔ گاؤں میں وہ دوپہر کے کھانے کے بعد گھر سے چارپائی اُٹھا کر کنوئیں پر لے جایا کرتا تھا۔ اور کھیتوں کو سیراب کرنے والی نالی کے آر پار اور نیم کے درختوں کی چھاؤں کے نیچے یہ چارپائی ڈال کر سو جایا کرتا تھا۔ لیکن یہاں زندگی کے یہ لوازمات کہاں میسر آ سکتے تھے۔ یہاں کی کول تار کی اُبلتی ہوئی سڑک اپنی بدبو کو فضا میں منتشر کرکے راہروں سے کہہ رہی تھی کہ اگر تمہیں مجھ پر چلنے سے کوفت ہوتی ہے تو میں تم سے بیزار ہوں۔ عشرت یکایک رُک گیا۔ ایک دکان کے بڑے بڑے شیشوں میں سے اُسے کتابیں نظر آئیں۔ یہ کتابوں کی دکان تھی۔ وہ بڑھ کر دکان میں داخل ہو گیا۔ اُسے یاد آیا فوجی افسر نے کہا تھا "تمہیں دو تو آنکھیں اور دو تو کانوں سے کام لینا چاہیئے۔" اس نصیحت پر عمل کرنے کے لئے یہ کتنا اچھا موقعہ تھا۔ اُس نے عمر بھر میں اتنی کتابیں ایک جگہ کہیں نہیں دیکھی تھیں۔ اُس کے دیہاتی طرز کے کالج کے کتب خانے میں بھی اتنی کتابیں نہیں تھی۔ اور نہ اس خوبصورت انداز میں رکھی ہوئی تھیں۔ کالج کے کتب خانے کی کتابوں میں سے اُسے ایک قسم کی بو آیا کرتی تھی۔ لیکن اس دکان میں ایک خوشگوار قسم کی خوشبو آ رہی تھی جیسے نئے بھیگے ہوئے کاغذ سے آیا کرتی ہے۔ پھر کالج کی کتابوں کی طرح یہاں کتابیں الماریوں میں مقفل نہ تھیں ہر ایک کتاب اس طرح کھلی پڑی تھی کہ گاہک کا دل خود بخود اُس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ عشرت نے دکان میں گھوم پھر کر کتابوں کا ایک سرسری جائزہ لیا۔ اور پھر اُس کی نگاہیں ایک سرورق پر جم کر رہ گئیں "کامیاب زندگی۔ دنیا کے سب سے کامیاب آدمی کی تصنیف"۔ کیسی اچھی کتاب تھی۔ اس کتاب کو دیکھ کر عشرت کو پہلی مرتبہ اپنی تعلیم کے ناقص ہونے کا احساس ہوا۔ اُس کے اساتذہ نے اُس پر کتنا ظلم کیا تھا۔ کہ اور تو اُسے سب کچھ پڑھا ڈالا تھا لیکن اس کتاب کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر زندگی کو کامیاب بنانے کا نسخہ اس کتاب میں محفوظ تھا۔ تو یہ نسخہ اُسے کیوں نہیں بتایا گیا تھا؟ اگر یہ نسخہ اُس کے پاس ہوتا تو وہ آج دربدر ہو کر ٹھوکریں کیوں کھاتا پھرتا؟ عشرت نے الماری سے کتاب اُٹھائی اور اُس کے ورق اُلٹنے لگا۔ دکاندار نے ایک کرسی آگے بڑھا دی "تشریف رکھیئے۔ کتاب کو اطمینان سے دیکھیئے" عشرت کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ ایک باب کا عنوان بہت دلکش تھا "دنیاوی تگ و دو کے حقیقی وجوہ" اور نیچے لکھا تھا۔

> زمانۂ حال کے ماہرین نفسیات کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہر تگ و دو کی خواہش کے نیچے ایک جنسی جذبہ کی تسکین چھپی ہوئی ہوتی ہے اگر جنسی جذبہ انسان کی سرشت میں شامل نہ ہوتا تو دنیا کا اتنا بڑا کارخانہ کبھی نہ چلتا۔ ہر ایک آدمی کی ہر کوشش کسی نہ کسی طرح کے جنسی جذبہ کی پیداوار ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے ایسے کام جو انسان محض نیکی کے خیال سے کرتا ہے یا دُنیا جنہیں نیکی کے کام کا نام دیتی ہے وہ بھی محض جنسی یا شہوانی جذبہ کی تسکین کے لئے کئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماں اور بچہ کا تعلق ہے آج تک ہم یہی سنتے آئے ہیں کہ ماں کے دل میں بچے کی پرورش کے لئے قدرت نے ایک فطری محبت پیدا کی ہے اور یہی محبت ماں کو بچے کی پرورش پر مجبور کرتی ہے اور اسی محبت کی وجہ سے ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے لیکن اب نفسیات کے ماہرین گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بچے کو دودھ پلانے میں ماں کو جسمانی لذت میسر آتی ہے۔ وہی اس محبت کی کفیل ہے اگر دودھ پلانے میں استلذاذ کا عنصر نہ ہو اور جنسی جذبہ کی تسکین میسر نہ آ سکے تو ماں بچے کو کبھی دودھ نہ پلائے۔ اسی طرح اگر ہم بہن اور بھائی کی باہمی محبت پر غور کریں۔ تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کی تہ میں ....

عشرت نے کتاب بند کر دی۔ اُسے اپنی ماں یاد آ گئی جس نے گذشتہ چودہ سال کی بیوگی میں اپنی جوانی کی تمام راحتوں کو صرف اُس کے شکم پر قربان کر دیا تھا۔ گاؤں کے محدود وسائل معیشت میں سے ایسا شاید ہی کوئی کام ہو جو اُس نے اس غرض سے نہ کیا ہو کہ اس کام کی اجرت سے وہ عشرت کی کوئی ضرورت پوری کر سکے گی۔ اُپلے تھاپنا، مکانوں کو لیپنا، آٹا پیسنا، کپاس چننا، دودھ دوہنا، چرخہ چلانا، سوت کاتنا

اور کبھی کبھی زچہ کے لئے دایہ کا کام کرنا بھی اُس نے اس لئے گوارا کیا کہ عشرت کی تعلیم مکمل ہو جائے۔ اُس کا خاوند زمین کا ایک ٹکڑا چھوڑ مرا تھا۔ اُس سے جو اناج پیدا ہوتا وہ کھانے کے لئے کافی ہو رہتا۔ لیکن تعلیم کے اخراجات کے لئے مزید مشقت کی ضرورت تھی اور عشرت کی ماں خوشی سے یہ کام کرتی رہی۔ ۔ ۔ اور آج "دنیا کے نفسیات کے ماہر" عشرت سے کہہ رہے تھے۔ کہ یہ سب کچھ "جنسی جذبہ کی تسکین" کے لئے تھا۔ یہ شہر والے لوگ کیا ایسی کتابیں پڑھ کر ہی زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں؟ کیا ماں اور بیٹے کا میل جول بھی جنسی جذبہ کی وجہ سے ہوتا ہے؟ اُسے اس خیال سے گھن آنے لگی۔ اُس نے کتاب بند کر کے اپنی جگہ پر رکھ دی اور دکان سے باہر نکل آیا۔

سہ پہر ہو چکی تھی۔ عشرت کچھ دیر تک پھر سڑکوں پر گھومتا رہا۔ دوپہر کی تپتی ہوئی زمین سے بھاگنے والے لوگ پھر ہجوم کی شکل میں سڑکوں پر بڑھتے آ رہے تھے۔ مکانوں کے سائے لمبے ہو کر اب سڑک کے کناروں کو ٹھنڈا کر رہے تھے۔ گو عشرت سارا دن گھومتے گھومتے کچھ تھکان سی محسوس کرنے لگا تھا لیکن شہر اور شہر والوں سے متمتع اندوز ہونے کے لئے وہ پوری کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اور اس کوشش میں وہ ایک ہی دن میں کامیاب ہو جانا چاہتا تھا۔ سہ پہر کی چائے پینے والے اب پیدل اور موٹروں میں قہوہ خانوں کا رُخ کئے ہوئے تھے۔ عشرت بھی اس ہجوم کا تعاقب کرتا ہوا ایک قہوہ خانے میں داخل ہو گیا۔ قہوہ خانہ ایک بڑے کمرے پر مشتمل تھا جس کے سقف و دیوار سے لے کر ملازموں کے لباس اور کرسیوں تک کے رنگ میں ہم آہنگی تھی۔

"چائے پئیں گے یا کافی؟" ملازم نے پوچھا۔

کافی کا نام عشرت نے پہلی مرتبہ سُنا۔ چائے کبھی کبھار پی بھی تھی لیکن کافی کا ذکر صرف جغرافیہ کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے! عشرت کے ذہن میں تجسس کی خواہش چٹکیاں لینے لگی۔

"کافی" بالآخر اُس نے فیصلہ کر لیا۔

"ساتھ کیا کھائیں گے؟"

عشرت نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑا کر دیکھی۔ روٹی کے ٹکڑوں کے سوا قریب کے میزوں پر جو کچھ کھایا جا رہا تھا اُسے اُن میں سے کسی چیز کا نام بھی نہیں آتا تھا۔ ویسے بھی اُسے کچھ بھوک نہیں لگ رہی تھی۔

"ساتھ کچھ نہیں چاہئے" اُس نے کہا۔

ملازم نے شکر، کافی اور دودھ میز پر لا کر رکھ دیا۔ عشرت نے ساتھ کے میز والوں کی نقل کرتے ہوئے کافی پیالہ میں انڈیلی۔ ایک عجیب قسم کے بُودار سیال سے پیالہ بھر گیا۔ دودھ اور شکر ڈالنے کے باوجود اس کے گہرے خاکستری رنگ میں کوئی فرق نہ آیا۔ عشرت نے ڈرتے ڈرتے پیالہ مُنہ سے لگایا۔ اور ایک گھونٹ پی کر نیچے رکھ دیا۔ یہ کتنی کڑوی شے تھی۔ عشرت کو ایسے محسوس ہوا جیسے کافی کی تلخی زبان اور حلق سے گذر کر اُس کے معدے تک چلی گئی ہے۔ اُس نے زبان کو دو تین دفعہ تالو سے لگایا۔ لیکن یہ تلخی کسی طرح کم ہونے میں ہی نہ آتی تھی۔ پھر اُسے خیال آیا کہ شاید اُس نے شکر کم ڈالی تھی۔ اُس نے سامنے پڑی ہوئی سب شکر پیالہ میں انڈیل دی۔ اب کے شکر کا ذائقہ زیادہ ہو گیا تھا۔ لیکن کافی کی تلخی ابھی تک موجود تھی۔ اُس نے مایوس ہو کر پیالے کو سامنے رکھ دیا۔

ساتھ کے ایک میز پر چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بڑی گرمجوشی سے کسی بحث میں مشغول تھے۔ لڑکیاں کم بولتی تھیں اور لڑکے زیادہ۔ لیکن ہر ایک لڑکا اپنے بیان کی تائید حاصل کرنے کے لئے ہر بار لڑکیوں سے مخاطب ہوتا اور وہ "ہاں۔ ہاں" یا "یہ نہیں ہو سکتا" کہہ کر بحث کرنے والے کی ہمت افزائی یا دل شکنی کرتیں۔ ایک لمبے لمبے بالوں والا نوجوان مذہبی درویشوں کی طرح لبادہ اوڑھے اس بحث میں پیش پیش تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جدید ادب اور جدید فن کار زیر بحث تھے۔ عشرت کو اس لبادہ دھاری نوجوان

کی شخصیت بہت دلچسپ معلوم ہوئی ہے۔ لیکن ایک بات اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اعلٰے قسم کے سوٹ پہنے ہوئے نوجوانوں اور ریشمیں ساریوں والی لڑکیوں کی محفل میں اس درویش کو جگہ کیسے مِل گئی تھی ؟ اور شاید اس نوجوان کو نہیں ملا تھا لیکن اس کا لبادہ گلے کے قریب میل سے اس قدر کیوں چکنا ہوا تھا ؟ شاید کافی کے رنگ کی مناسبت سے اُسے اپنے گلے کا یہ رنگ بہت مرغوب تھا۔ جونہی یہ مجذوب اپنے بالوں کو چہرے سے ہٹانے کے لئے باتیں کرتا ہوا رُکا سامنے بیٹھا ہوا ایک خوش پوش نوجوان بول اُٹھا:-

"مہربکا رتی جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان کے جدید اُدبا اور جدید فن کاروں نے اپنے فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے اور یہ معراج فن کی وہ منزل ہے جو مغرب والوں کو ابھی صدیوں تک نصیب نہیں ہوسکتی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ مبالغہ سے کام لے رہے ہیں یا آپ کو جدید مغربی ادبا کی تازہ تصنیفات سے پُوری طرح واقفیت نہیں۔ آپ نے گلاکن سپیل (GLOCKENSPIEL) کا نام تو سُنا ہوگا ؟

بھکارتی جی بولے" سُنا کیوں نہیں صاحب۔ مَیں نے اُس کی تمام تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا ہے "

نوجوان بولا" لیکن آپ کی نظر سے اُس کی تازہ تصنیف ریفیہ (RAPHIA) نہیں گذری۔ ریفیہ دراصل اِس ناول میں ایک نوجوان لڑکی کا نام ہے جو اس قصے کا اہم ترین کردار ہے۔ مصنف نے اس طویل قصے کو لکھ کر وضعی اعتبار سے ایک نئی تکنیک کی طرح ڈالی ہے اور نفس مضمون کے لحاظ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمیں عام چلتے پھرتے انسانوں میں زندگی کے وہ ارفع پہلو نظر آتے ہیں جو اونچے طبقے کے لوگوں میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ حقیقت یہ ہے کہ . . . . "

بھکارتی جی بات کاٹ کر بولے " میں تو آپ سے کہنے ہی والا تھا۔ کہ گلاکن سپیل عہدِ حاضر کا سب سے بڑا سوشلسٹ فسانہ نگار ہے "

نوجوان بولا" نہیں صاحب یہ بات نہیں۔ گلاکن سپیل کو ہم فنی نقطۂ نگاہ سے سوشلسٹ ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ کیوں مس کپلا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں ؟"

مس کپلا بولیں" بالکل ٹھیک۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ گلاکن سپیل سوشلسٹ ہرگز نہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ اُسے HUMANITARIAN (یعنی نوعِ انسان کا ہمدرد) کہہ سکتے ہیں "

نوجوان نے کہا" بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسا ماہر نفسیات ہے۔ جو انسانی زندگی کے ساز کے ہر ایک تار سے پُوری طرح واقف ہے۔ اور اپنا قصہ لکھتے وقت وہ اِن تاروں کو اِس طرح ہلاتا ہے کہ اُس کی تصنیف کبھی تو ایک مسلسل نغمہ بن کر رہ جاتی ہے اور کبھی اُس کے الفاظ نوحہ بن کر چیخنے لگتے ہیں۔ اس ناول کے کردار ریفیہ کو ہی لے لیجئے۔ یوں تو وہ ایک سیدھی سادی بھولی بھالی سی لڑکی ہے جس کو اپنے گرد و پیش کے حوادث نے بچپن سے ہی اُن تمام آسائشوں سے محروم کر دیا ہے جن سے عام بچے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن آگے چل کر اپنی زندگی میں جب یہ لڑکی ساز گار فضا میں کامیابی کی منزلیں طے کرتی ہے تو دیکھنے والے عش عش کر اُٹھتے ہیں۔ مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ گلاکن سپیل کو دل کی دھڑکنوں سے لے کر زندگی کے شور و غوغا کو قلمبند کرنے پر جو قدرت حاصل ہے وُہ شاید ہی کسی مشرقی مصنف کے حصے میں آئی ہو۔ ریفیہ ایک ایسی تہ دبہ ہے جو . . . . "

بھکارتی جی پھر بات کاٹ کر بولے" معاف کیجئے یہ گلاکن سپیل وہی مصنف ہے نا جس کے آباد اجداد پندرھویں صدی عیسوی میں جرمن شہنشاہ فریڈرک سوم کے وقتوں میں جرمنی پر ترکوں کے حملے کے بعد انگلستان میں ہجرت کر کے آ گئے تھے ؟

نوجوان بولا۔ "آپ نے درست فرمایا۔ بالکل وہی"

مہکارتی نے پوچھا: "تو یہ کہئیے ریفیہ اب شہر میں دستیاب ہو سکتی ہے نا؟"

نوجوان نے جواب دیا "کیوں نہیں صاحب۔ ریفیہ اب شہر کے ہر ایک کتاب خانے سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ اور بدھورام کے ہاں تو کل ہی بہت سی جلدیں ولایت سے آئی ہیں"

عشرت ٹوپی سنبھالتے ہوئے "اٹھ بیٹھا"۔ "ریفیہ۔ گلاکن سپیل۔ دنیا کے شہرۂ آفاق مصنف گلاکن سپیل کی معرکۃ الآرا تصنیف ریفیہ" یہ الفاظ بار بار اس کے ذہن میں چکر لگا رہے تھے وہ ابھی بدھورام کے ہاں سے یہ تصنیف خریدے گا۔ آخر کار اسے شہر میں رہنے کا فائدہ پہنچ ہی گیا تھا۔ وہ چلتا ہوا بدھورام کی دکان میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے وہ تھوڑی دیر ہی پہلے مایوس ہو کر لوٹا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر تازہ کتابوں کی الماری کا جائزہ لیا۔ ریفیہ از گلاکن سپیل۔ پھر اسے خیال آیا۔ بھلا ایسی کتاب کو دکاندار ہر کسی کو کیوں بیچے گا۔ کتابوں کی تجارت میں بھی بلیک مارکٹ شروع ہو گئی تھی۔ اچھی کتابیں کم تھیں اور خریدنے والے بہت تھے۔ ہو نہ ہو دکاندار نے یہ کتابیں چھپا کر رکھی ہیں۔ لہٰذا ان کی بازیافت کسی ڈھب سے ہو گی۔ وہ دکاندار کے قریب جا کر بولا:-

"لالہ جی کچھ کتابیں کل بھی تو آپ کے ہاں ولایت سے آئی ہیں"

دکاندار اپنی کتابوں کی رسید کی شہرت سن کر خوشی سے مسکرایا اور بولا "ہاں صاحب کل ایک پارسل آیا تھا۔ کہیئے آپ کو کون سی کتاب چاہیئے۔ ہر ایک کتاب کا نمونہ نئی کتابوں کی الماری میں لگا دیا گیا ہے۔ آپ وہیں سے دیکھ لیجئے"

عشرت نے رازدارانہ لہجہ میں کہا "سب کتابیں تو آپ نے وہاں نہیں لگائیں" پھر منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر "دیکھئے ہم سے آپ کا کوئی پردہ تو ہے نہیں"

دکاندار کچھ گھبرا سا گیا۔ اسے عشرت ڈیفینس آف انڈیا رولز کا جیتا جاگتا مجسمہ نظر آنے لگا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام کتابیں پھر گئیں جو اس نے مقررہ قیمت سے دگنے اور تگنے داموں پر خفیہ طور پر بیچ دی تھیں اس نے لجاجت آمیز لہجہ میں کہا "صاحب آپ درست کہتے ہیں۔ آپ سے ہمیں کیا پردہ ہے۔ آپ لوگوں کے سہارے پر تو ہم جی رہے ہیں۔ اگر سرکاری افسروں کی مدد ہمارے ساتھ نہ ہو تو شہر کے لوگ تو دن دہاڑے ہماری دکان لوٹ لیں۔ آپ حکم دیں۔ جونسی کتاب آپ کو چاہیئے ابھی حاضر کر دی جائے گی۔ یا مکان پر پہنچا دی جائے گی"

عشرت نے سوچا کام بن گیا ہے کہنے لگا "تو پھر گلاکن سپیل کی ریفیہ دلوایئے"

دکاندار گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا "صاحب آپ مذاق نہ کیجئے۔ آپ کو اگر کتاب لینا ہے تو فرمایئے۔ دکانداری کرتے کرتے عمر گذر گئی ہے۔ لیکن ہم نے نہ گلاکن سپیل[1] نام کا کوئی مصنف سنا ہے اور نہ ریفیہ[2] نام کی کوئی تصنیف۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو کچھ دھوکا ہوا ہے"

عشرت اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ وہ بغیر کچھ کہے دکان سے باہر نکل آیا۔ قہوہ خانے میں وہ لونڈے کیا بک رہے تھے۔ وہ کس سرگرمی سے گلاکن سپیل کی تعریف میں مصروف تھے۔ اور اس نے کس انہماک سے وہ ساری باتیں سنی تھیں وہ درویش نما لنگور تو گلاکن سپیل کا شجرۂ نسب پندرھویں صدی عیسوی تک بیان کر رہا تھا کیا وہ سب کچھ فریب

---

[1] ایک یونانی سانپ کا نام۔ [2] کھجور کی قسم کا ایک درخت۔

تھا کیا شہری اس قسم کی دماغی عیاشی بھی کرتے ہیں؟ وہ اپنے ذہن کی اُلجھنوں کو سلجھاتا ہوا پھر سڑک پر چلنے لگا۔

شام ہو چکی تھی۔ اب اُس کی بھوک پھر چمک رہی تھی۔ اور اُس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک چکا تھا۔ ....

وہ اپنی نگاہوں میں اب خود مظلوم تھا۔ اُسے اپنے آپ پر ترس آ رہا تھا۔ اس وقت تک وہ جسمانی اور ذہنی طور پر نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ کھانا کھانے کے لئے ایک دفعہ پھر ایک ریستوران میں گھس گیا۔ ایک کُرسی پر بیٹھ کر اُس نے اپنی ٹانگیں میز کے نیچے پھیلا دیں اور آنکھیں مُوند کر تصورات کی دنیا میں کھو گیا۔ جسمانی آسائش کے ساتھ ساتھ اُس کے دماغ کو بھی کچھ سکون میسر آیا۔ اس کمرے میں کھانا کھانے والوں کے دھیمے سے شور کے باوجود ایک قسم کا سکون تھا۔ شاید اس کی ذمہ دار وہ تاریکی تھی جس کو جان بوجھ کر صرف ایک حد تک ہلکی سی روشنی سے دُور کیا گیا تھا۔ چند گز کے فاصلے سے دوسرے واضح طور پر نظر نہیں آتا تھا کہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔

عشرت کی میز کے قریب چند نوجوان دیگر مہمانوں کی طرح ابھی تک پینے پلانے میں مصروف تھے۔ لعل فام گلاسوں میں چُسکیاں بھرتے ہوئے اور سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بناتے ہوئے لطیفے کہے جا رہے تھے۔ باری باری ہر ایک نوجوان اپنا اپنا لطیفہ بیان کر رہا تھا جس کے ختم ہونے پر بڑے زور سے قہقہے بلند کئے جاتے۔ دفعتہً ایک نوجوان کی نگاہ عشرت پر پڑی وہ آنکھیں بند کئے اپنے حواس جمع کر رہا تھا۔ نوجوان نے اپنے دوستوں سے کہا۔ "آدمی شریف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کچھ دماغی عارضہ لاحق ہے۔ کہیں تو دعوت دوں۔ شام اچھی کٹ جائے گی۔"

سب دوستوں نے تجویز پر صاد کیا۔ اور یہ صاحب باصرار عشرت کو اپنے میز پر بُلا لائے۔ اور سب دوستوں سے تعارف کرا دیا۔

"بیرا ایک گلاس ان صاحب کے لئے بھی" ایک دوست نے کہا اور چشم زدن میں عشرت کے سامنے شراب سے بھرا ہوا ایک گلاس رکھا تھا۔ عشرت نے معذرت کرتے ہوئے کہا:۔

"نہیں صاحب میں نہیں پیوں گا۔"

"کیوں؟ آپ تو تکلف فرما رہے ہیں۔"

"نہیں میں نے کبھی پی نہیں۔"

"تو آپ نے اس سے بڑھ کر اور کوئی غلطی نہیں کی۔ اور آج اپنی اصلاح کر لیں۔"

"نہیں صاحب میں مسلمان ہوں۔"

"تو کیا ہم سب کافر ہیں۔ یہ ارشد، ناظر، حفیظ اور عابد کیا کافروں کے نام ہوتے ہیں اور ذرا سامنے نظر اُٹھا کر دیکھئے کیا یہ سب پینے والے کافر ہیں؟"

"نہیں صاحب نہیں۔"

"اجی چھوڑیئے تکلف۔ آپ اس قدر کیوں بنتے ہیں۔ لیجئے اب بسم اللہ کیجئے۔"

ارشد نے گلاس اُٹھا کر عشرت کے جھجکتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ سب دوستوں نے اپنے اپنے گلاس اُٹھائے اور عشرت نے بھی ڈرتے ڈرتے سب کے ساتھ ایک چُسکی بھری۔ الٰہی توبہ کس قدر کڑوی چیز تھی۔ کانی سے بھی کڑوی۔ اور بو بھی اس سے خراب۔ عشرت کو ایسے محسوس ہوا جیسے اُس کے حلق اور کھانا کھانے کی نالی میں کسی نے آگ لگا دی ہے۔ وہ منہ بسورتا ہوا دوسری طرف دیکھنے لگا۔

عابد نے کہا "دیکھئے عشرت! آپ کو رام کرہی لیا۔ اب فرمائیے آپ کے مزاج کیسے ہیں اور یہاں تنہا اگر آپ کیوں بیٹھے ہوئے تھے اور کیا سوچ رہے تھے؟"

ایک دفعہ عشرت کے جی میں آئی کہ ان کے سامنے رو دے اور کہے کہ خدارا مجھے شہر سے بچا کر گاؤں میں بھیج دو۔ لیکن چند منٹوں کے بعد اُس کی دماغی کیفیت کی قلب ماہیت ہوگئی۔ تلخ پانی نے اُس کی آنکھیں کان بلکہ زبان تک کھول دی۔ وہ اپنے میزبانوں سے اس طرح گھل مل گیا جیسے وہ انہیں برسوں سے جانتا تھا۔ کھانے پینے میں بے تکلفی کے علاوہ رات کے بھیگنے کے ساتھ وہ شراب پینے میں بھی اُن پر سبقت لے جا رہا تھا۔ جُوں جُوں اُس کے ہاتھوں کی طاقت شراب کے نشے سے سلب ہوتی جا رہی تھی تُوں تُوں اُس کی زبان تیزی سے چل رہی تھی۔ وہ آج پہلی مرتبہ اپنی زندگی میں حقیقی بے فکری سے ہمکنار ہُوا تھا۔ اور گاؤں کی زندگی کے لطیفے بڑے مزے لے لے کر اپنے میزبانوں کو سُنا رہا تھا:۔

"تمہیں گدھی اور کمہار کا لطیفہ سناؤں! شاید تم نے پہلے بھی سُنا ہو۔"

سب دوست بیک وقت بولے "ہاں ہاں ضرور سناؤ۔ ہم نے پہلے کبھی نہیں سنا۔" اور پھر چند لمحوں کے بعد عشرت سمیت سب دوست لطیفہ سُن کر اس قدر بلند قہقہے لگا رہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

عشرت کے میزبان کھانے سے فراغت پا کر نشہ میں چور ہو کر اُٹھے اور عشرت کو الوداع کہہ کر گھر کو سدھارے۔ لیکن عشرت نے آج اپنی زندگی میں وہ وقت دیکھا تھا جس کا تصور بھی اُس کے لئے محال تھا۔ اُس کے دل میں صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ شراب کا ایک اور گلاس پیئے اور جب یہ گلاس ختم ہو جائے تو پھر ایک اور گلاس پیئے۔ اُسے اب صرف ایک ہی بات کا ہوش تھا کہ گلاس کو ہونٹوں تک لے جا کر غٹ غٹ کس طرح چڑھایا جا سکتا ہے۔ وہ ہر چند منٹوں کے بعد کہتا "بیرا ایک اور" اور بیرا ایک اور گلاس اُس کے سامنے لا کر رکھ دیتا۔ لیکن اس دفعہ جب اُس نے سُرخ سُرخ ڈوروں والی آنکھوں سے بیرے کو گھورتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا "بیرا ایک اور" تو بیرے نے کہا "حضور بار بند ہو چکا ہے۔"

"وہ کیوں؟ ہم نے تو حکم نہیں دیا۔"

"حضور وہ سرکار کے حکم سے اس وقت بند کر دیا جاتا ہے۔"

"کون سی سرکار کس کے حکم سے۔ جاؤ ایک اور لاؤ۔"

"حضور اب نہیں مل سکتی۔"

"بیرا دیکھو تم ہمارے میزبان ہو۔ ہم تمہارے مہمان ہیں۔ جاؤ ایک اور لاؤ۔ اور تم کبھی ہمارے گاؤں آؤ تو ہم تمہیں اس قدر چاہیں گے کہ تمہیں ہم سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

"لیکن جناب اس وقت حکم بند ہے۔"

"ٹھیک ہے حکم بند ہے لیکن تم ہمارے بھائی تو ہو ہی ہو۔ ہو نا تم ہمارے بھائی؟"

"ہاں حضور۔"

"تو پھر اور لاؤ۔" عشرت کی آواز ہچکیوں سے رُکتی ہوئی وقفوں پر سنائی دے رہی تھی "ہم شہر میں اپنی زندگی کو چار چاند لگانے آئے ہیں .... چار چاند .... دیکھے ہیں کبھی تم نے اکٹھے؟ .... ہم اپنی معاشی وضع قطع نوجی سانچے میں ڈھال رہے ہیں .... اس کے لئے شراب پینا ضروری ہے۔ سمجھے؟ ......

..... ہم اپنی عقل کو جلا دینے کے لیے اور پینا چاہتے ہیں۔ پھر تم ہمیں اور کیوں نہیں پلاتے؟ ..... ہم مانتے ہیں کہ ہم ضرورت سے زیادہ دیہاتی ہیں۔ لیکن تم ہماری مدد کیوں نہیں کرتے؟ ..... جاؤ مالک سے کہو ہم ابھی تک دونوں آنکھوں اور دونوں کانوں سے کام لے رہے ہیں ..... وہ ہمیں اور شراب کیوں نہیں دیتا ..... ہی ہی ہی ہی ..... ارے میرے یار تم گھور گھور کر میری طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟

ملازم نے شراب کا بل پیش کیا۔ اور عشرت نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رقم ادا کر دی۔ مالک کے اشارے پر عشرت کے انکار کے باوجود ملازم نے عشرت کو ہوٹل سے باہر نکال کر ایک تانگہ میں بٹھا دیا۔ عشرت آڑا ہو کر نشست پر بیٹھ گیا کیونکہ اب وہ صحیح طور پر سیدھا بیٹھ نہ سکتا تھا۔

کوچوان نے پوچھا "بابو جی کہاں جائیں گے؟"

"کون؟ ہم؟ ہم کہاں جائیں گے؟ جہاں تمہارا جی چاہے لے چلو ..... (کچھ دیر سوچ کر) اچھا ریلوے سٹیشن پر لے چلو"

کوچوان نے گھوڑے کو چابک کھلایا اور رات کی خاموشی میں تانگہ گڑ گڑ اور گھوڑے کے سموں کی ٹاپ کی آواز پیدا کرتا ہوا سٹیشن کو چل پڑا۔ سٹیشن پر پہنچ کر کوچوان نے سہارا دے کر بڑی مشکل سے عشرت کو تانگے سے نیچے اُتارا اور مسافر خانے میں چھوڑ کر اپنے دام وصول کر کے چلا گیا۔ عشرت کچھ دیر تک ایک بنچ پر اُونگھتا ہوا بیٹھا رہا۔ پھر لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور ٹکٹوں والی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کہاں کا ٹکٹ چاہیئے؟" ایک زرد رنگ بابو نے عشرت کے منہ سے نکلنے والی بدبو کی لپٹوں سے نفرت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں جائیں گے؟" عشرت نے کہا "ہم اپنے گھر جائیں گے۔ گاؤں کو"

"لیکن تمہارا گاؤں کون سا ہے؟" بابو نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"ہی ہی ہی۔ واہ دوست ہمیں پہچانتا ہی نہیں۔ ارے یار سنتو اب بابو سنت رام ہو کے ہمیں بھول ہی گئے۔ ارے ایک ہی گاؤں کے ایک ہی سکول میں اتنے سال اکٹھے پڑھنے کے بعد آج پوچھتے ہو تمہارا گاؤں کون سا ہے معلوم ہوتا ہے تم شہر میں رہ کر شہری بن گئے ہو ہی ہی ہی"

ہچکیوں کی کثرت سے عشرت کے لیے بولنا دشوار ہو گیا۔ نیند کی ماتی آنکھوں والا زرد رو بابو عشرت کو غور سے دیکھنے لگا۔ اکٹھے میٹرک پاس کرنے کے بعد آج کئی سال کے بعد سنت رام نے عشرت کو دیکھا تھا سکول کا معصوم اور ذہین لڑکا عشرت آج دھاوت شرابی اور احمق بنا ہوا اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ دوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ اور عشرت کے گلے ملنے لگا۔ لیکن عشرت نے اُسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا:۔

"سنتو تم آج بہت شراب پی گئے ہو۔ مجھے تمہارے منہ سے شراب کی بو آ رہی ہے۔ اسی لیے تم مجھے پہچان نہیں سکتے۔ اچھا مجھے ٹکٹ دو"

بابو مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اُس نے عشرت کو ٹکٹ دیا اور ایک قلی کو بلا کر ہدایت کی کہ عشرت کو احتیاط سے گاڑی میں بٹھا دے قلی عشرت کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھا آیا۔

گاڑی میں کچھ لوگ سو چکے تھے۔ کچھ اُونگھ رہے تھے۔ کچھ سونے کی فکر میں تھے۔ عشرت سر نہوڑائے ہوئے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ آدھی رات سے ذرا اُدھر گاڑی نے وسل دیا اور گاڑی شہر سے چل دی۔ کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے خنک ہوا کے تیز جھونکوں سے عشرت کے تھکے ہوئے جسم اور دماغ کو کچھ سکون میسر آیا۔ تو وہ یہ سوچتا ہوا سونے لگا کہ مفید شہری بننے کے لیے اُسے ابھی اور کیا کچھ کرنا تھا۔

(محمد باقر)

دو گیت

جگ سپنوں کا ڈیرا
اُٹھیں اُمنگیں خوشیاں جھومیں
دھرتی چھوڑ آکاش کو چومیں
سانجھ نہ دیکھیں سویرا
جگ سپنوں کا ڈیرا

سبزہ، جنگل، پربت، تارے
من کے کھیل کھلونے سارے
کہاں نہ اس کا بسیرا
جگ سپنوں کا ڈیرا

دھیان کے دھن نے لی ہے پھریری
ختم ہوئی سب ہیرا پھیری
تیرا کوئی نہ میرا
جگ سپنوں کا ڈیرا

مَیں کیسے کہوں
تم جیسے چاہو رہوں
مَیں کیسے کہوں

پل پل بڑھتے وہم کی گھاتیں
بھیگی رات کی پھیلتی باتیں
چُپ چاپ سہوں
تُم جیسے چاہو رہوں
مَیں کیسے کہوں

چاند کے دھیان میں گُم تاروں میں
نیلے ساگر کے ماروں میں
مَیں آپ بہوں
تُم جیسے چاہو رہوں
مَیں کیسے کہوں

(قیوم نظر)

شکست

پھر دِل جلی شام آگئی
چمگادڑوں کے سائے میں
بے چارگی گھنا گئی

کیا کیا نہ باتیں ہوگئیں
شیشم کی شاخوں میں حسیں
چڑیاں چہک کر کھوگئیں

مَیں ناشناسائے سکوں
اور ہر طرف پھیلا ہُوا
پُر ہول صحرائے سکوں

وحشت سی ہوتی ہے مجھے
ہر سرسراہٹ اک نیا
نشتر چبھوتی ہے مجھے

یُوں بڑھ رہی ہے تیرگی
جیسے جبینِ صبح سے
کرنیں نہ پھُوٹیں گی کبھی

دُوری کا افسوں ہٹ چکا
حدِ نگہ کے اُس طرف
شاید مِرا کچھ بھی نہ تھا

تکتا ہوں اب جانے کہاں
اپنے خیال و خواب کو
لے جاؤں بہلانے کہاں

قیوم نظر

آدم

(تصوریہ)

یہ تصور پارہ ایک طویل نظم کا حصہ ہے جس میں تاریخ کو تصور کے پردے پر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک شخص رات کے وقت تنہائی کے عالم میں ماضی کی تصویریں اپنے ذہن پر نقش پاتا ہے اور انسان اُبھرتا ہوا جاتا ہے۔ حال سے ماضی کی سرحدوں کو چھوڑ کر وہ آگے بڑھتا ہے۔ تیرگی سے اُبھرتا ہوا ماضی رفتہ رفتہ اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور وہ بالترتیب کوہ پانڈو، دُنیا کے پہلے شاعر، دُنیا کے سب سے پہلے معبد، وادیٔ نیل کی تہذیب، ابوالہول، الوت، تیج محل، گوتم بدھ، سب سے پہلے سنگتراش سکندر اور پھر یاس کی موت سے متعارف ہو کر اُن پر اپنے انوارِ لطف نثار کر جاتا ہے ـــــ بالآخر وقت کا احساس اُس کے ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کے تصورات کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ اس نظم میں وقت کا تصور وہی ہے جو حال کا ہے سماجی وقت سے بے نیاز ہے۔

رات پھر آئی ہے تاریکی بیدار لئے
نیند کے بارسے بوجھل سی ہوئی جاتی ہیں
میری پلکیں جو جھپکتی رہیں دن بھر ـــ دن بھر
مجھے اِن پلکوں کی سستی کا احساس نہ تھا

آج کا دن بھی لرزتا ہوا اک آنسو تھا
وقت کی آنکھوں سے بہتا ہوا بہتا ہوا اشک
شب کی بے نور چٹانوں کے اُدھر گرتا ہوا

آج کی رات مرے دل پہ کوئی بار نہیں
آج کی رات کسی درد کا احساس نہیں
میں ہوں یہ مملکتِ شب ہے یہ تاریکی ہے
یہ سیہ رات کی خاموش سیہ تنہائی
یہ سیہ رات کے پربت، یہ چٹانیں، یہ پہاڑ ـــ

چٹانوں پرستاروں کی شامی نرم ہستیاں

نگاہ کے لرزتے قدموں کی طویل داستاں
برستی بوندیوں کے واقعات ہیں رقم یہاں
سُلگتی بجلیوں کی تیرتی ہوئی تجلیاں
لپٹ کے تیرگی سے سوگئی ہیں ان کے دھیاں
یہ زندگی کے آئنے، یہ آئینوں کی جھلکیاں
نگاہیں ظلمتوں سے ہی اُلجھ کے رہ گئیں کہاں
پھسل رہا ہے ذہن رفتہ رفتہ اس چٹان سے

میں کہاں پہنچا ہوں اے فکرِ حزیں
لے! یہاں میرے سوا کوئی نہیں

"ہم صدیوں کے سائے
جیون کا افسانہ ہیں ہم
کون ہمیں دُہرائے
ہم صدیوں کے سائے
ہم پانڈو ہیں، کورو ہیں ہم
ہم گنتی کے جانے
ہم دو پربت، اونچے پربت
آپس میں ٹکرائے
ہم صدیوں کے سائے
ہم صدیوں کے سائے

ڈھل گئے سائے بھی تاریک، سیہ غاروں میں
اب یہاں گونج ہے، اک گونج ہے، اک سرد سی گونج —

دُور گلزاروں سے دُور   چاند سے تاروں سے دُور
ایک دُنیا ہے عجیب
شب کی بستی کے قریب
ندیوں کی   راگنی   راگنی   میں   نی

ہر طرف بکھری ہوئی
خامشی حیراں سی تیرگی بے جان سی
نور کچھ حیرت زدہ
کشمکش کا شعبدہ
منظر راحت کدہ
نغمے لہراتے ہوئے پاؤں پھیلاتے ہوئے
اور لمحے جاوداں
اس فضا کے درمیاں
ایک لالہ زار ہے
لالہ زار ہے ــــ مگر

گلشنوں کے پتوں پہ لکھنے والے کوی تجھے ہو سلام میرا
ترے ہی چرنوں میں اپنے دل کی عقیدتیں لے کے آ رہا ہوں
ترے تخیل کو، ترے نغموں کو زندگی نے بھلا دیا ہے
مگر مری دوربین نظر دیکھ! میں تری نے میں گا رہا ہوں
ترا کلام اوّلیں تقاضائے حسنِ فطرت ــــ سرودِ باقی
کہ تیرے شہ پارے وہ مناظر ہیں جن پہ آنکھیں بچھا رہا ہوں

کس نے چھیڑا ہے وہ اِک تارے پہ اپنا نغمہ
یہ مغنی ہے، یہ ساحر ہے، یہ جادوگر ہے
"ترمم تارم، ترمم تارم
جیون کیا ہے پیتم کا غم
ترمم تارم، ترمم تارم
بادل برسیں، اکھیاں ترسیں
تارم، تارم
دم دے جائے دم
ترمم تارم، ترمم تارم

بس بے بس دکھیارا من
تارم تارم

دُوری پر مجبور ہیں ہم

ترمم تارم، ترمم تارم —

تارم — تارم"

تُو نے کمالِ پاس میں ساز کو لب عطا کئے
تیری لطیف اُنگلیاں وجہِ سرودِ ناصبُور
فاتحِ ماہ و سال ہے تیری صدائے جانگداز
تُو یونہی گائے گا تو پھر کون رہے گا تجھ سے دُور

مجھے شہپر پہ بٹھائے ہوئے لے آیا کہاں
یہ مرا فکرِ جہانگیر، مرا ذہنِ رسا! —

میری نگاہوں میں تُو
نیل — ہے اِک سنگِ میل

اِس جگہ بے آبرُو
حسن کے نقشِ جمیل
کوئی نہیں ماہرُو
دہر میں جن کا مثیل
صورتِ جام و سبُو
اِن کی جوانی ذلیل
بک رہی ہیں کُو بکُو
مثلِ بتانِ خلیل —

صحرائے بیکراں میں ابوالہول کی نظر
پتھرا گئی ہے تکتے ہوئے ریگِ بے نشاں
فرصت اگر ملے، تو کھول اسے طریقِ ریگ
آنکھیں ہیں تیری محرمِ اسرارِ این و آں
ڈھانپا ہے ریت نے ترا عیبِ برہنگی
تُو واقفِ حدیثِ زماں کا شیخِ مکاں
پایانِ دہر بھی ترے پاؤں سے مَس ہوا

یا بہرا پن سے سنگ بھی پانے مگن ہوا! —
"میں ہوں — میں ہوں دہر کا مالک — دہر کا والی ان داتا"
تو رتھ آہن کی سواری آ پہنچی بازاروں میں
کون ہے جو منکر ہے مجھ سے — کون ہے جو انکار کرے
کوئی گر آیا ہے تو جینے دو اسے پوچھے دیواروں میں
تو رتھ آہن — تو اور تیرا دھن
ریت کا اک مدفن —

بے چون و چرا آتے رہے جاتے رہے لوگ
وہ جن کی نگاہوں میں تھا افسانۂ آغاز
جو جیتا ہے مرتا ہے وہی زیر سماوات
کب صید یہاں ہوتا ہے بے لذتِ پرواز
اس کارگہ انجم و مہتاب میں اکثر
لب بند رہے محرمِ اسرارِ نے و ساز

اور دنیا کے خاموش گلستانوں میں
اک نظر رفتہ تپاں بن کے نظر آتی ہے
یہ تجسس کی نظر ہے، یہ تحیر کی نگاہ
کون اس رہ سے گزرا ہے ابھی کہتا ہوا
کہ میں آؤں گا بتانے تمہیں رازِ ہستی
کہ میں ناچیز سا اک ذرہ ہوں بے مہر ہوں میں
ہاں مگر پھر مہ و سال مجھے آنا ہے یہاں
میں بتاؤں گا — بتاؤں گا تمہیں رازِ حیات
گو ابھی خود بھی میں اس راز سے آگاہ نہیں

یہ بڑ کا بوڑھا پیڑ یہاں سایوں میں لئے بیٹھا ہے جسے
جو مایا جال کو توڑ چکا — مایا کا جایا — مایا کا لال
وہ جس کی آنکھیں بند ہیں لب خاموش ہیں، گوتم دیو ہے یہ
یہ گوتم دیو ہے — تاج کا وارث — پیٹ سے بھوکا اور پیاسا
یہ بحر و بر، یہ خشک و تر مری طلب میں سرگراں

مرا خیال جاوداں ، مری نگاہ بے کراں
ازل ابد ہیں مجھ میں — مَیں اسیرِ جستجو نہیں
مرے لئے یہ سنگ سنگ نقشِ پائے رہرواں
تُو کہ آفاق تری ایک نظر میں گُم تھے
تجھے اِس کارگہِ شیشہ گراں سے کیا کام
موت نے چُوس لیا رس ترے افسانے کا
ترے بھکشو تری تعلیم سے بے بہرہ ہیں
آج بھی ہے یہاں مقتلِ انسانیت
اے پیمبر — وہ ترا لطف کہیں عام نہیں

گُونج پربت سے جو لہراتی ہوئی آئی ہے
یہ کسی چھینی ہتھوڑی کی ہے فریادِ بکا
دُور وہ سامنے اِک تودۂ سنگیں کے قریب
کون ہر ضرب پہ یوں شکر ادا کرتا ہے —
" اے خالق و صناع ترے ہاتھوں کی سوگند
اِس بُت کی رگ و پے میں لہو کرتا ہوں محسوس
تُو خالق و مسجُود سمجھتا ہے اسے — ہائے
مَیں تیرے تخیل سے، تصور سے ہوں مایوس
اے کاش تجھے حسنِ نظر ہی یہ بتائے
تیری ہی عقیدت ترے اس بُت کا ہی ملبوس
اب صدیوں تک اس سنگ کو پُوجیں گے پجاری
یہ فال ہے آزادیِ افکار کو منحوس "—

مقدونیہ سے اُٹھا ہے ایک سیلِ بے اماں
موجیں لہو میں جس کی نہائی ہوئی تمام
ہر ہر قدم پہ ایک طلوعِ سحر کا خُون
ہر ہر زمیں کے سینے پہ بہتی ہے جُوئے شام
جو آیا راہ میں صفتِ ماہ زرد ہے
جو دیکھا اِس کی تیغِ شقاوت کا ہے غلام

مقدونیہ! —— یہ تیرا سکندر، یہ تاجدار
کچھ اِس جری سے پُوچھ، کہ پورس کا انتقام
اِس کی انا کے منہ پہ طمانچہ نہیں ہے کیا
جس کا جواب دے گی کہاں تیغِ بے نیام
یہ بیاس ہے —— جس کی بہتی لہروں سے لاکھوں رُوحیں اُبھر رہی ہیں
یہ بیاس ہے —— لہر لہر میں آئینے ہیں یونان کے لہُو کے
یہاں کی ہر موج ایک تلوار ہے —سکندر کو ڈھونڈتی ہے
وُہ بُلبلہ ہے کہ خود ہے ڈوبتے سپاہی کے سر کا ضامن
مری نگاہوں میں بیاس کی موج موج ستر سکندری ہے۔

مَیں اِسی فکر میں غلطاں رہا اور چاند کا گیند
سُوکھے پتّے کی طرح کٹ کے گرا دُور کہیں
پھیکی کرنیں ہی اُفق پر کی کسی بدلی پر
جاتی جاتی ہوئی اِک لفظ لکھے جاتی ہیں
'مَوت' یہ لفظ اچھوتا ہے نہ فرسودہ ہے ——

یوسف ظفر

ٹیکسلا

یہ اس ہندوستان کے قدیمی شہر کا نام ہے۔ جو دریائے اباسین (اٹک) کے جنوبی کنارے چند میل کے فاصلہ پر ایک خوشنما قطعۂ زمین کے کنارے شمالی حصۂ ملک میں آباد تھا۔ اب اس کے منہدم آثار اور کھنڈرات ہی باقی ہیں۔ دراصل یہ شہر مختلف زمانہ میں تین مرتبہ آباد ہو کر اُجڑا۔ اور اب تو اسکا نام ہی نام باقی ہے اور چھوٹے سے قصبہ کی شکل میں آباد ہے۔ یہ مقام شہر راولپنڈی سے قریباً بیس میل کے فاصلہ پر شمال مغرب میں ریلوے سٹیشن این ڈبلیو آر کا چھوٹا سا جنکشن ہے۔ جہاں سے ایبٹ آباد ضلع ہزارہ کیلئے حویلیاں تک ریل جاتی ہے۔ سب سے پہلے میں نے اس مقام کو ۱۹۲۵ء کے آغاز میں دیکھا تھا۔ اُس زمانہ میں سر جان مارشل کی زیر نگرانی بہت سا حصہ قدیم عمارات کی کھدائی کا ختم ہو چکا تھا مگر پھر بھی کام جاری تھا۔ تاکہ اسے ایک معقول حد تک جلد تکمیل کو پہنچایا جائے۔ ان کھنڈرات کے مشاہدہ سے اس شہر کی زمانہ سلف میں عظمت و اہمیت کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ہر چہار طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑوں اور اُنکی وادیوں میں مختلف عمارات و سنگین دیواریں و عبادت گاہیں اس امر کی پوری دلیل ہیں کہ اس قطعۂ زمین کے گرد و پیش ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں نے اپنے معبود کے تصور میں سالہا سال تک جبین فرسائی کی ہوگی۔ اس کے علاوہ وہاں کے صنعت و حرفت آرام و آسائش پرانی تہذیب و تمدن کا پورا پورا ثبوت ان دفینوں سے ملتا ہے۔ جو ان کھنڈرات سے برآمد ہوئے۔ اور مختلف شکل و صورت سے ایک خوشنما عجائب خانہ میں محفوظ ہیں۔

میرا یہ مضمون کسی ذاتی تحقیق کی بناء پر ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا۔ بلکہ اسے اُن تین باب کا خلاصہ سمجھنا چاہیئے جو خانصاحب چودھری محمد حمید خاں قریشی بی اے سابق سپرنٹنڈنٹ محکمہ آثار قدیمہ گورنمنٹ ہند نے اپنے ترجمۂ اردو میں "گائیڈ ٹو ٹیکسلا" سے کیا ہے۔ جسکے مصنف سر جان مارشل صاحب سابق ڈائریکٹر محکمہ آثار قدیمہ گورنمنٹ ہند تھے۔ اور جنکی متواتر کئی سالوں کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ ٹیکسلا کے قدیمی کھنڈرات اب ایسی حالت میں نمودار ہوئے ہیں۔ کہ ان سے تاریخی معلومات کے علاوہ فن تعمیر اور دیگر متعدد امور کے بارے میں کوئی سبق حاصل ہو سکے۔ اس جد و جہد کے سلسلہ میں صاحب موصوف کو بلا تکان مختلف سرگرمیوں میں مصروف رہنا پڑا۔ اوّل تو ایسی دُور افتادہ اور سنگلاخ جگہ میں کئی سال کا قیام ہی ایک صاحب ذوق و فن شخص کیلئے کم اہم شئے نہیں۔ اس کے علاوہ ایسے کام میں مشغولیت اور لگاتار محنت و مشقت کے بعد کسی معنی خیز نتیجہ پر پہنچنا نہایت استقلال و صبر سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جو قابل قدر و ستائش کے ہیں۔ مگر اس سلسلہ میں حکومت ہند کی امداد و تائید بھی قابل ذکر ہے۔ تاہم بادیٔ النظر میں ایسی کوششیں سود مند ثابت ہوں۔ مگر وہ رائیگاں نہیں جاتیں مثلاً علاوہ سیاحوں کی دلچسپی کے طلبا و ماہرین اور تاریخ دان حضرات کیلئے ٹیکسلا کو دیکھنا محض ایک سیر ہی نہیں بلکہ ان چیزوں کا انکشاف بھی ہے جنکی قدر و قیمت اہل علم و فضل ہی جانتے اور پہچانتے ہیں ؎

قدر زر زرگر بداند قدر جوہر جوہری

سر جان مارشل سے قبل انکی کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ جنرل کننگھم نے بھی اس قدیمی شہر کی کھدائی میں حصہ لیا اور تحقیقاتی نظر سے اس کام کو جاری رکھا۔ مگر ان کی سرگرمی سر جان مارشل کی کوششوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ غالباً ان کی رپورٹ اس بارے میں کسی کتاب کی صورت میں طبع نہ ہوئی (جو شائع عام کیلئے مفید ثابت ہوتی) اس قدیمی شہر کے مفصل حالات جاننے اور سمجھنے کیلئے سر جان مارشل کی

تصنیف "گائیڈ ٹو ٹیکسلا" کا مطالعہ نہایت مفید و دلچسپ ہے۔ جسکا اردو ترجمہ ان کے ماتحت افسر خانصاحب چودھری حمید خاں نے
کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ طباعت و کتابت کے لحاظ سے یہ کتاب نہایت اچھی ہے اور زبان بھی ستھری ہے۔ یہ مجلد بھی ہے
اور قیمت صرف چودہ آنہ۔ اسی طرح انگریزی میں تصنیف بھی اچھی اور سستے داموں میں ملتی ہے۔ غالباً اس کی قیمت ۱۲؍ ہوگی۔ یہ ہر
دو کیوریٹر ٹیکسلا میوزیم سے خریدی جا سکتی ہیں۔ ٹیکسلا کا جائے وقوع لکھا جا چکا ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی ترشے
ہوئے پتھروں والا شہر ہیں۔ اس کو تکھشیلا بھی کہا گیا ہے۔ اور جو زبان سنسکرت میں تکھشلا تھا۔ مگر یونانی و رومی مصنفین نے اُسے
ٹیکسلا کر دیا۔ غالباً مروجہ لفظ "ٹکسال" سکہ جات کا خزانہ بھی اسی سے اخذ ہوا۔ مگر چینی سیاح فاہیان اس شہر کو چوشاشیلو
(یعنی کٹا ہوا سر) کہتا ہے۔ اور اسکی توضیح اس طرح کرتا ہے۔ کہ گوتم بدھ نے اسی مقام پر اپنا سر بطور خیرات نذر کر دیا تھا۔ یہ روایت کہاں تک
سچائی رکھتی ہے۔ اسکا علم ہمیں نہیں ہے (دراصل یہ ان تین شہروں کا نام بیان ہوتا ہے۔ جو ایک دوسرے کے قریب قریب یکے بعد دیگرے
چند صدیوں میں آباد ہوتے رہے۔ جنکے نام بھڑ (مونڈ) سرکپ و سرسکھ ہیں۔ کتابی نقشہ میں ان سب کا صحیح طور پر جائے وقوع دکھایا گیا
ہے۔ ان سب کا باہمی فاصلہ تقریباً ½ ۳ میل سے زائد نہیں۔ یہ سب شہر وادی کے درمیان آباد ہوئے۔ جسکی شمال مشرق میں ہزارہ کے
برفانی پہاڑ اور کوہ مری۔ مارگلہ کی پست و سرسبز پہاڑیاں جنوب مغرب میں اس مقام کو خوشنما و دلکش ضرور بنا دیتی ہیں۔ اور باوجودیکہ
دریائے ہرو اور اس کے معاون نالے اسے سیراب بھی کرتے ہیں۔ مگر اس مقام کو دلفریب و ہوشربا نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یونانی مورخین
اسٹرابو اور پلوٹارک نے ٹیکسلا کے گرد و نواح کے علاقہ کو نہایت آباد و زرخیز لکھا ہے۔ چینی سیاح ہیوان چونگ نے بھی اس کی
شادابی اور فصلوں کی عمدگی و آب رواں کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر یہ امر تعجب و حیرت سے خالی نہیں۔ کہ ابن بطوطہ جیسے مشہور و معروف
سیاح و مورخ نے جو مشرق و مغرب کے اکثر ممالک میں پھرا اور ہندوستان میں کئی سال تک برسر عہدہ رہا۔ اس شہر کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔
جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسکی شہرت و عظمت اس زمانہ تک بالکل خاک میں مل چکی تھی۔ ٹیکسلا کا سب سے بڑا شہر بھڑ تھا۔ ترانالہ
کے کنارے پر واقع ہے۔ یہ شہر یونانیوں کی آمد سے کئی سو برس پہلے آباد تھا۔ اور ممکن ہے۔ یہ وہی ہو جسکا تذکرہ مہابھارت میں درجہ
جنمے جے کی فتح کے سلسلہ میں آتا ہے۔ اور سکندر اعظم کو بھی اس کی فتح بلا جنگ و جدال کے ۳۲۶ سنہ قبل مسیح حاصل ہوئی۔ جو بعدۂ
اسی سال موسم بہار پنجاب کی جانب بڑھا۔ اور جس نے جہلم کے کنارے راجہ پورس کو شکست دی۔ اس فتح کے ایک سو سال بعد یونانی
حکمرانوں نے ایک اور شہر سرکپ ہتھیال پہاڑی کی مغربی شاخوں پر آباد کیا۔ جسکے حدود ایک میدان مرتفع تک جاتے تھے۔ بلکہ اسے
بعد میں بابر خانہ یا کچا کوٹ بھی کہا گیا۔ جو آج تک مشہور ہے۔ کچے کوٹ کی وجہ تسمیہ تو یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ایک فصیل خام بھی اس
رقبہ کے گرد پہلوی شاہ غالباً عزیز اول کے دوران سلطنت میں بنائی گئی تھی۔ اس کی دیواروں کی اندرونی و بیرونی چنائی رذیل ہونے
کی ہے۔ اور یہ طرز تعمیر دیگر یونانی شاکا پہلوی عمارات کی طرز تعمیر سے ملتی جلتی ہے۔ ان کی طرح ناپائیدار بھی تھی۔ ظاہری سبب یہ کہ معمولی و
کمزور چھوٹے موٹے پتھروں کی چنائی سے دیواروں کی ضخامت ہوتی تھی۔ جس پہاڑی کا ذکر آیا ہے۔ شہر کا روک یعنی قلعہ اس پر واقع تھا۔ مگر
اب اسکا نام و نشان تک باقی نہیں۔ ٹیکسلا کا تیسرا شہر سرسکھ لنڈی نالے کے پار واقع ہے۔ جسے غالباً شاہان کشان کے راجہ کنشک
نامی نے آباد کیا تھا۔ ہیوان چونگ سیاح نے اس شہر کا حال واضح طور پر لکھا ہے۔ اس کی فصیل کی دیواریں موٹی اور مضبوط تھیں۔ اور
دوپارہ نمونہ کی تھیں۔ گویا موٹے پتھروں کی چنائی کے درمیان چھوٹے چھوٹے کنکریں دی جاتی تھیں تاکہ اُسے استوار بنائیں۔ یہ طرز عمارت
دراصل اواخر عہد پہلوی میں یعنی اواخر صدی عیسوی میں رائج تھا۔ دیواروں کے مزید استحکامات کیلئے بیرونی حصوں میں پشتوں کے
علاوہ مناسب فاصلہ پر برج بھی بنائے گئے تھے۔ جو نہایت بلند و مدور و خاصے وسیع تھے۔

مندرجہ بالا شہروں کے علاوہ ٹیکسلا کے گرد و نواح میں بہت سے کھنڈرات لاتعداد عمارتوں اور خانقاہوں کے ہیں۔ جن میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں ۱۔ استوپہ و خانقاہ کنال جو ہتھیال کی شاخ پر شہر سرکپ قدیم فصیل کے ایک حصہ پر واقع ہے۔

۲۔ موہڑا مرادو۔ پیپلا اور جولیاں کے استوپے۔ آخرالذکر سب سے بہترین جگہ موجودہ کھنڈرات میں پائی جاتی ہے۔ اور اس عمارت کا نقشہ بود و باش اور آرام و رہائش کے لحاظ سے میرے ذاتی خیال میں ایک خاص دلچسپی رکھتا ہے۔ یہ ... سٹیشن سے کچھ دور ہے۔ مگر قابلِ دید ضرور ہے۔

۳۔ کچے کوٹ کے شمال میں موضع جنڈیال کے ایک ٹیلہ پر ایک وسیع مندر بنا ہوا ہے۔ جو کسی زمانہ میں آتش پرستی کیلئے مخصوص تھا اس کے قریب ہی چند ستوپے ایسے پائے جاتے ہیں۔ جنکا تعلق غالب ہے کہ جین مذہب سے تھا۔

۴۔ ٹیکسلا کی شمالی حد پر جو پہاڑیاں ہیں وہاں ایک بڑا استوپا بھلڑ ٹوپ کے نام سے مشہور ہے۔ اور چونکہ یہ ایک بلند مقام پر واقع ہے۔ اس لئے دور دور سے نظر آتا ہے۔

سب سے نمایاں عمارتیں دھرمراجیکا ستوپہ اور چیر ٹوپ بھی ہیں۔ جسکے بیچ میں بڑا چیر یا شگاف موجود ہے۔

یہ واضح رہے۔ کہ بھڑ مونڈ قدیمی اور سب سے بڑا شہر غالباً اس جگہ آباد تھا۔ جہاں اب ریلوے سٹیشن اور عجائب خانہ موجود ہیں۔ موجودہ عجائب خانہ کی عمارت ایک مختصر مگر پختہ و خوشنما ہے۔ اسکی سیر کیلئے اوقات مقررہ پر کسی اجازت کی ضرورت نہیں البتہ صرف ۲ آنہ کا ٹکٹ ضرور خریدنا ہوتا ہے۔ وہاں بڑے بڑے ہال کمروں میں وہ مورتیاں کندہ۔ ہتھیار۔ اوزار۔ برتن و سکہ جات نہایت خوبصورتی و سلیقہ سے سجائے گئے ہیں کہ ان کے دیکھنے اور واقفیت حاصل کرنے کیلئے کافی وقت درکار ہے۔ بعض زیورات بھی کھنڈرات سے دستیاب ہوئے ہیں۔ جو محفوظ ہیں۔ ان اشیاء پر تبصرہ کرنے کیلئے پوری کتاب کی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ جس کیلئے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ مگر جو باتیں تعجب خیز و حیرت انگیز ہیں ان میں سے چند ایک پیش کرتا ہوں۔ گلی برتن مثلاً پیالہ۔ مٹکے اور گھڑے ان پر وہی رنگ و روغن ہے جو آجتک اس ملک میں پایا جاتا ہے۔ بلکہ نقش و نگار بھی وہی موجود ہیں۔ مثلاً مور کی تصویریں وغیرہ۔ یہ تو سمجھ میں آتا ہے۔ مگر جو نقوش مربع یا چار خانوں کی طرح لکیروں میں بنے ہوئے ہیں انکا مفہوم جاننے اور سمجھنے سے عقل قاصر ہے۔ اور میرا قیاس ہے کہ آج بھی اس کی خاطر خواہ تشریح نہ ہو سکے گی سوائے اس کے کہ اگلے زمانہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ گویا ہم لکیر پر فقیر اس عادت میں اب بھی گرفتار چلے جا رہے ہیں۔

لاتعداد مورتیوں اور تراشیدہ پتھروں کے مشاہدہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بدھ مذہب جب عروج پر تھا۔ اس وقت اس شہر کو بڑا فروغ ہوا۔ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ملک ہند کا پہلا شہر شاہراہ پر یہی واقع تھا۔ خیر بدھ مذہب کے زیر اثر تمام ستوپہ اور خانقاہوں میں گوتم بدھ کی تصاویر پائی جاتی ہیں اور حیرت ہوتی ہے کہ جو ہستی دنیاوی شرک و مصائب سے دور بھاگ کر نروانہ حاصل کرنے کیلئے وحدانیت کا سرچشمہ بنا اس کے حواریین و پیروکاران نے اس کی تعلیم سے نئے اصول قائم کرنے اور طرز عبادت کے طریقے تبدیل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ جس سے شاید اصل راہ بھٹک کر اپنے ہادی کی ہی پرستش میں مبتلا ہو گئے۔ مگر اس میں انکا قصور چنداں نہ تھا۔ بلکہ گرد و پیش کے اثرات شاید اس پر انہیں مجبور کرتے ہوں۔ تاہم وہ ایسے پکے اصول کے پابند ضرور رہے۔ کہ کرۂ ارض میں آجتک اس مذہب کے نام لیوا و پیروکار کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ بدھ مذہب کا نظریہ اگر بت پرستی نہ تھا۔ تو بت شکنی بھی نہ ہو۔ کفر کو مٹانے اور شرک کو مستقلاً دور کرنے کی خدمت کو رسول عربی صلعم کو ہی مخصوص کیا گیا تھا۔ جو کلمتہ اللہ یعنی الحمد لکم دینکم کا امین اور اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے جان و دل سے مہیا آمادہ ہوا۔ جو اس کے امتی مدت العمر تک بھی اس کے تعلیم و سبق کو نہیں بھول سکتے۔ تاریخی اہمیت کے لحاظ سے بھی ٹیکسلا کے سلسلہ میں ان خاندانوں اور سلاطین خاندان کے نام و کام جانتے جاتے ہیں۔ جن کا تذکرہ تاریخ ہند کے اور

حصوں میں نہیں پایا جاتا۔ گو تاریخی حالات یونانیوں کی بہ نسبت بہت کم اور چند ہی ہیں۔ مگر چینی مصنفین کی تحریریں اور پرانے سکے جات یا چند نایاب اشیاء سے اس معاملہ میں بہت مدد ملتی ہے۔

اس وقت اس جگہ کے لحاظ سے نہایت ہی ضروری اور چند امور پر مختصر طور سے اس مضمون پر روشنی ڈالوں گا۔ بدھ مذہب کی کتاب "جاتکا" سے پتہ چلتا ہے جو زبان پالی میں لکھی ہوئی ہے کہ ٹیکسلا میں ایک یونیورسٹی بھی تھی جو علوم و فنون مروجہ کی تعلیم میں چند صدیوں تک شہرۂ آفاق بنی رہی۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ راجہ چندر گپت موریا خاندان کے حکمران کا مشہور وزیر چانکیا یہیں پیدا ہوا۔ جو برہمن خاندان سے تھا۔ چانکیا کی رو سے یہ شہر صوبہ گندھارا کا دار الخلافہ بھی رہا ہے۔ سکندر اعظم کی فتح کے وقت راجہ آمبھی ولی یہاں حکمران تھا۔ دراصل اس نے راجہ پورس کی فتوحات سے خائف ہو کر اپنا وفد کے ذریعہ سکندر اعظم کو ہندوستان پر لشکر کشی کی دعوت دی اور اس کی آمد پر بلا مواخذہ اپنی حکومت کو اس شہنشاہ کے رحم و کرم پر چھوڑا۔ اس دور میں یہ شہر فلسفے عروج پر تھا۔ تعدد ازدواج و رسم ستی کا عام رواج تھا۔ بلکہ نادار لڑکیاں برسر بازار بیچی جاتی تھیں۔ مردوں کی لاشیں گدھوں کیلئے میدان میں پھینک دی جاتی تھیں۔ سکندر اعظم کے لشکر کے ساتھ پانچ ہزار فوج اس راجہ کی بھی پورس کے خلاف لڑائی میں شریک تھی۔ جسکے عوض علاوہ اس کی حکومت کچھ اور بھی مفتوحہ علاقہ راجہ کو شہنشاہ نے مرحمت فرمایا تھا۔ بلکہ راجہ پورس سے بھی اس کی صلح و صفائی کرا دی۔ جس سے آمبھی ولی کی حکومت کو مزید تقویت حاصل ہوئی تھوڑے عرصے بعد ہی ایرانی شہنشاہ سلوق کو جو یونانی مفتوحات پر دانت رکھتا تھا۔ لڑائی کے بعد چندر گپت سے ایک ذلت آمیز صلح کرنی پڑی۔ جسکی رو سے محض پانسو ہاتھی کے عوض یونانی مفتوحات چندر گپت موریہ کے حوالے کر دیئے گئے۔ جسکی فولادی حکومت ہند میں مشہور ہے۔ مگر اس کے بیٹے بندوسار کے تخت نشین ہوتے ہی ٹیکسلا کے حکمران نے بغاوت کا بیڑا اٹھایا۔ اور اگر شہزادہ اشوک پھر کر تسخیر کرتا تو اسکی حکومت ہاتھ سے جاتی رہی تھی۔ اس نامور شہزادہ نے جب عنان حکومت سنبھالی تو موریہ سلطنت کی حکومت و سطوت کو اس قابلیت سے قائم رکھا کہ تاریخ میں اسکی حکومت شہرۂ آفاق بنی۔ ثروت و اقتدار کے علاوہ انصاف و رحم نے اس شہنشاہ گیتی پناہ کو دنیا میں ممتاز و نامور بنایا۔ اس کا علم دوست و ادیب ہونے کا ثبوت بھی کافی اسناد سے ملتا ہے۔ ملک ختن کا بھی حکومت ٹیکسلا کا ایک حصہ رہنا اس دور کا کارنامہ ہے۔ راجہ اشوک کے مرتے ہی اسکی سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا۔ اور پھر باختری یونانی حملے شروع ہوگئے۔ جنکی حکومت ٹیکسلا میں ایک صدی سے کچھ زیادہ رہی۔ لیکن حملہ آوروں کے ریلے نے انہیں صاف کر دیا۔ یہ وحشی شاکا کے نام سے مشہور ہوئے۔ جو سلطنت پہلوی کے صوبہ سیستان میں آباد تھے۔ اور پہلوی آبادیوں میں بود و باش کے علاوہ عقد و پیوند بھی کرتے تھے۔ اس گروہ کا سردار جو ملک ہند کی جانب بڑھا تھا۔ موگا اور کوسیا سے ٹیکسلا پہنچتے پندرہ سال کا عرصہ لگا۔ ۵۸ قبل مسیح قام عزیز اول معز کا جانشین ہوا۔ اسکا قریبی تعلق ارکوشیا کے پہلوی حاکم کے خاندان سے تھا۔ اسلئے خود نیم شاکا اور نیم پہلوی یعنی دوغلہ ہونیکی حیثیت رکھتا تھا مگر اس کی طولانی حکومت میں رعایا خوشحال رہی۔ اور دریائے جہلم تک اسکی حکومت کی وسعت ہوئی تھی۔ عزیز نے اصول حکمرانی ایرانی طرز پر رکھے اور مرزبان یا صوبہ دار جگہ جگہ مقرر کئے تھے۔ اسکا جانشین بھی اس کے نقش قدم پر چلا۔ مگر بعد میں سنہ عیسوی کے تیرھویں سال کے قریب پہلوی بادشاہ گندوفر نے ٹیکسلا کو متحد کر کے زیر نگیں کر لیا۔ یہ بادشاہ نہایت زبردست و باوقعت تھا جسکی سلطنت کا سلسلہ یورپ تک پہنچا تھا۔ انہیں حکمرانوں کے سکے ہندوستان میں پہلی مرتبہ ٹیکسلا کی کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔ یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ اسی شہر میں بادشاہ کے دربار میں عیسائی مذہب کے حواری ٹامس نامی بھی آتے تھے۔ پہلوی تمدن کی کافی نشانیاں اس شہر میں پائی جاتی ہیں۔ جو شہر دیوار پناہ سرکپ نامی شہر واقعہ ملک شام کے آثارات سے بھی ملتی جلتی ہیں۔ جہاں پہلوی تمدن تھا۔ مگر بوجہ شامی یونانی تمدن کے اثرات کے اس سے مختلف ہے۔ پہلوی تمدن میں محض یکرنگی و امتیازی خصوصیات ہی نہ تھیں بلکہ اس کے حامی اعلیٰ درجہ

کے شہسوار اور قادر انداز تھے۔ اور نہایت جفاکش اور ترقی پسند تھے اور جفاکشی ان کا شیوہ تھا۔ نسلاً یہ لوگ ایرانی ہی تھے۔ اور کسی طرح یونانی و سلجوقی علوم و فنون سے ناآشنا نہ تھے۔ بلکہ وراثتاً اپنے میں شامل کر لیا تھا۔ زیادہ تر تجارت بھی انہیں پہلویوں کے ہاتھ تھی۔ جس کا سلسلہ بحیرۂ روم و سواحل ہند کے درمیان قائم تھا۔ اکثر پہلوی سلاطین ٹیکسلا آتے رہے۔ اور کبھی کبھی کسی مذہبی تقریب پر بھی فروکش ہوا کرتے تھے۔ شہر کے وسط میں سورج دیوتا کا مندر اور شاہی محل بھی بنا ہوا ہے۔ اور گویا منزلہ نظر آتا ہے۔ مگر ان کے نیچے زمین دوز تہ خانے بھی تھے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے۔ کہ بعض سلاطین نے مثلاً فراٹیر کو اپنی سرحد کے وحشی قبائل کو خاموش رکھنے کیلئے وظائف دینے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ جس رسم کا اطلاق آج تک حکومت میں موجود ہے۔ پہلوی سلطنت کے دور زوال کے بعد اہل کشان نے وادیٔ کابل پر حملہ کر کے قندھار کو بھی حاصل کیا۔ یہ کشان ملک چین کے باشندے تھے۔ اور انہیں کو وہاں کے مورخوں نے یوچی لکھا ہے۔ سنہ [illegible] ق۔م۔ یہ ملک چین سے باختر کیطرف نکالے گئے اور اس خطہ پر جو سیتھوں کے نام سے مشہور ہے۔ تسلط کر لیا۔ پھر وادی کابل میں بڑھے۔ اس زمانہ کی تاریخ مشکوک ہے۔ مگر [illegible] ق۔م میں انہوں نے ٹیکسلا کی حکومت حاصل کی تین سو سال تک وہ سریر آرائے حکومت رہے۔ جن میں سے راجہ کنشک بہت مشہور ہوا جو نہایت زبردست و باعظمت تھا۔ واسدیو کی وفات کے بعد تیسری صدی میں اس حکومت کو زوال ہوا جسکی تکمیل کا سبب ساسانیوں کا حملہ تھا۔ مگر اس سے زیادہ زبردست و تباہ کن حملہ سنہ [illegible]ء میں افتالیٹوں یعنی سفید ہنوں کا ہوا جس نے تمام پنجاب کو صاف کر دیا۔ سنہ [illegible]ء میں فاہیان چینی سیاح بھی ٹیکسلا آیا۔ اور بدھ مذہب کے مقدس مقامات کی زیارت کی۔ مگر افسوس ہے کہ قلمبند حالات دستیاب نہ ہوئے۔ اہل ہن کے حملہ کے بعد ٹیکسلا پھر نہ پنپ سکا۔ اور جبکہ ساتویں صدی عیسوی میں ہیون چوانگ ایک اور چینی سیاح اس شہر میں پہنچا۔ تو اسے کشمیر کا ایک معمولی صوبہ بنا ہوا پایا۔ جہاں کے سردار آپس میں برسرپیکار رہتے تھے۔ اور بہت سی عمارتیں اور عبادت گاہیں تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ اس زمانہ سے لیکر ان دنوں تک پھر اس شہر کو کوئی ترقی نصیب نہ ہوئی۔ بلکہ غنیمت یہ ہے۔ کہ بیسویں صدی سے تو پرانے شہر کی کھدائی۔ دیکھ بھال کا پورا پورا بندوبست زیر نگرانی محکمہ آثار قدیمہ شروع ہوا جس کے سبب ہمیں موجودہ حالات بھی کافی و شافی طور پر اس تاریخی بلدہ کے متعلق میسر ہوئے ہیں۔ اور آثارات قدیمہ سے پرانی اشیاء کا برآمد ہو کر محفوظ کیا جانا۔ محض وہاں کے عجائب گھر کو ہی بارونق نہیں بنایا۔ بلکہ سیاح، شائقین اور طلباء کیلئے سبق آموزی کا موجب بنی ہیں۔ ان بیش بہا و قابل قدر اشیا کی برآمدگی کے متعلق بہت شکایت ایک شخص نور ماہی سنار کے خلاف پیدا ہوئی ہے جو اس نواح کا باشندہ تھا۔ اس کا یہ دستور رہا کہ خانقاہوں کی کھدائی کرتا اور جو کچھ وہاں سے برآمد ہوتا اس کی دستبرد کر جاتا تھا۔ سینکڑوں کا مال اور نایاب اشیا اس نے چند روپیوں اور آنوں میں فروخت کر دیں جنکی تاریخی اہمیت بہت تھی۔ اور قدر و قیمت کے لحاظ سے شہر راولپنڈی کے بعض صراف دستکاروں کے سرمایہ و ذخیرہ کی بدولت دولتمند بن گئے۔ اب ان اشیاء کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا جاتا۔ بلکہ قانونی گرفت کے تحت ایسی دستبرد قابل سزا قرار دی گئی ہے۔ محافظین سرکاری کے مضبوط دست دیانت ایسی کام کی چیزوں کو آہنی دروازوں میں قفل بند سنگلاخ میں بطور امانت رکھتے ہیں۔

متذکرہ بالا تاریخی حالات سے یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ شہر ٹیکسلا کا عروج پانچویں صدی قبل مسیح سے لیکر سنہ [illegible]ء تک رہا ہے مگر اس ہزار برس کے عرصے میں یہ بلدۂ ملک ہند کا ایک بیش قیمت اور چمکتا دمکتا نگینہ بنا رہا ہے۔ جس نے ملک کی شہرت ہی کو نہیں شہرۂ آفاق بنایا۔ بلکہ جہاں کے نام و کام سے تاریخ ہند کے سینکڑوں اوراق مزین و مرتب ہوئے۔ یہ شہر مختلف اقوام کے حکمرانوں کے زیر نگیں رہا جن میں قابل ذکر یہ ہیں۔

(۱) اہل ایران (ہخامنشی خاندان) (۲) اہل مقدونیہ یعنی یونانی (۳) خاندان موریا (۴) یونانی باختر (۵) اہل کاشا (اہل سقیا) (۶) پہلوی خاندان (اہل پارتھیا یعنی فارس) (۷) اہل کشان ۔ قرائن سے یہ پایا جاتا ہے۔ کہ ماسوا اہل مقدونیہ کے جنکا قیام چند ہی سال رہا۔ ہر ایک قوم اپنا کچھ نہ کچھ امتیازی نشان ملک کی تہذیب و تمدن اور صنعت و حرفت پر چھوڑ گئی۔ یہی تاریخ کا عام اصول ہے۔ اسلئے ہر ایک عہد کی صنعتی یادگاروں کا نمونہ مختلف اشکال اور چیزوں میں یہاں کی برآمد شدہ اشیا سے پایا جاتا ہے۔ مثلاً سنگتراشی میں خصوصاً قندھاری طرز میں زبردست ایرانی اثر پایا جاتا ہے۔

سکندر اعظم کی فتوحات کے بعد یونانی طرز و طریقہ بھی بہت سی چیزوں میں شامل ہوگیا اور یہ بات ماننی پڑیگی۔ کہ اس زمانہ میں سب قومیں ہی ایرانی و یونانی تہذیب سے کم و بیش متاثر ہو چکی تھیں۔ البتہ موریا سلطنت کے زمانہ میں ٹیکسلا کی اکثر صنعت و حرفت کا بھی رنگ پایا جاتا ہے۔ جو ہندوستانی تھا۔ گو یہ ابتدائی مدارج میں تھی۔ مگر اسکی باریکی اور پختگی زیورات اور گلی برتنوں وغیرہ میں بہت پائی جاتی ہے۔ جن میں ہند کے کاریگروں نے باریک کام سے نام پیدا کرلیا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کے ہندی سکے بھی بمقابلہ یونانی صنعت کے سکوں سے اچھی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً وہ رائج الوقت سکے جو چھاپ شدہ کہلاتے ہیں۔ نہایت بھدے اور بدنما تھے۔ مگر راجہ سوبھوتی کے سکے جو چوتھی صدی ق۔م۔ میں اور جو کوہ نمک کا حکمران تھا۔ نہایت خوبصورت ہیں۔ اور سلجوقی سکوں کے طرز پہ بنے ہوئے ہیں۔ ان اعلےٰ نمونوں کے پہلو بہ پہلو یک رخی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ان سکوں پر تحقیقاتی نگاہ سے معلومات حاصل کرنے کیلئے مناسب و مفصل کتب کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ عہد موریا کے بعد اس شہر کی صنعتی اشیا پر یونانی تہذیب کا اثر پڑا۔ جسکا ثبوت شہر سرکپ سے برآمد شدہ برتنوں کھلونوں اور تصویروں سے ملتا ہے۔ سکہ جات میں بھی یونانی طرز علیحدہ پایا جاتا ہے۔ جن میں مورتوں کے خط و خال یونانی ہیں۔ بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بعینہٖ ایسے نمونہ کی۔ ہرکولنیم اور پامپیائی کے دور دراز شہروں میں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ اس کے بعد ایک نئی طرز نے ہندوستان میں جگہ پائی۔ جو ایرانی سے ملتی جلتی تھی کیونکہ سکوں پر یونانی زبان کی بجائے عبارت دو زبانوں میں ہوگئی۔ جن میں سے ایک تحریر کھروشٹی کہلاتی تھی۔ اور مثل فارسی کے دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صفائی جو ان سکوں کی تیاری میں پائی جاتی تھی۔ غائب ہوگئی۔ الغرض انحطاط کا یہ عمل جاری رہا۔ جب تک کہ شاکا کی جگہ پہلویوں نے لی۔ یونانی صنعت کا اثر سکوں اور تصویروں پر ہی ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ گلی ظروف میں بھی اسے بہت دخل ہوا۔

اس کے علاوہ کتابے بھی ایسے ملے ہیں۔ جو یونانی باختری زبانوں کے علاوہ قدیم براہمی حروف میں کندہ ہیں۔ مگر یہ ٹیکسلا میں نہیں ملا۔ بلکہ شہر ددلیشا جسے اب بھیلہ پکارتے ہیں۔ ایک لاٹھ پر کندہ ہے۔ شاکا قوم کی صنعت کچھ اعلیٰ پایہ کی نہ تھی۔ بلکہ اس کے سکوں پر موٹے اور بھدے نقوش پائے جاتے ہیں۔ پہلوی سلطنت کے آتے ہی یہاں کی یونانی تخیل و صنعت کو پوری پوری تقویت پہنچی۔ حتےٰ کہ اس شہر کی صنعت کو چار چاند لگے۔ اور جس کے سبب اس کی رونق دوبالا ہوگئی۔ سب سے بڑی صنعت علاوہ سکوں کی ضرب کے مجسمہ سازی میں پائی جاتی ہے۔ جو یہاں ماحول کے مطابق تھی۔ اس کی سہولت کیلئے سُرمئی پتھر کا دستیاب ہونا بھی بہت بڑی بات تھی۔ جسکا استعمال کافی طور پر کیا گیا۔ قندھاری طرز کے مجسمے اور ابھرواں تصویریں رُومی تصویروں سے بھی ملتی جلتی تھیں مگر یونانی صنعت میں یہ امور نہایت وضاحت و دلکش پیرائے میں پیش کئے گئے۔ جو ملک ہند کے کاریگروں کیلئے سودمند و سبق آموز ثابت ہوئے۔ مذہبی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے نہایت ذوق شوق سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور ایسا سیکھا کہ اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ ایسی شہرت و کمال تک پہنچنے کے بعد زوال کو آتے دیر نہ لگی۔ اور ہزاروں برس کا آباد شہر ایسا لُوٹا کھسوٹا

گیا۔ کہ سوائے کھنڈرات اور پتھروں کے وہاں اب کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اردگرد کی چند بستیاں بھی ایسی ہیں کہ ویرانے کے برابر بظاہر کوئی سامان ترقی اس قدیمی شہر کو دوبارہ جلانے کیلئے نظر نہیں آتا۔ انسانی کوششیں نیرنگی زمانہ کے سامنے اسطرح تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ جیسے غول بیابان آیا اور چلا گیا۔

کیا یہ مناظر و واقعات دنیا کی بے ثباتی کا ثبوت نہیں دیتے۔ اگر اہل بصیرت ان کرشمات قدرت کو چشم دوربین سے نہ دیکھیں۔ تو چشمۂ آفتاب را چہ گناہ ❖ واحسرتا۔

اعتزاز الدین احمد لوہارو

آئینہ ٹوٹ گیا

میں نے ہر لمحہ - برائے زندگی
اک نئی زنجیر کا بوسہ لیا
دیکھتے ہی دیکھتے بل کھا گئے
وقت کی پگڈنڈیوں پر چھا گئے
مضمحل ہونٹوں کے لرزیدہ نشاں
آج تک میں اس طرح خاموش تھا
جیسے یہ منحوس سائے، یہ دھواں
ایک منزل، منزلوں کی راز داں
آج پچھلی شب فضا کی چشم نم
مضمحل ہونٹوں نے کچھ مجھ سے کہا
بتکدہ انگڑائی لے کر جاگ اٹھا
اپنے آوارہ تخیل کی قسم
عذر خاموشی ستاتا ہے مجھے
ماضی جیسے کھائے جاتا ہے مجھے

منظر سلیم۔

غزل

اُن کا تو غم کی بات پہ بھی قہقہہ ہُوا
لائے کہاں سے خُون کوئی کھَولتا ہُوا

اُس فتنۂ شباب کی اللہ رے ادا،
آتا ہو جیسے مست کوئی جھُومتا ہُوا

اُن کو تو اپنے جور و ستم کی مِلی نہ داد
ہم نے تڑپ کے جان بھی دے دی تو کیا ہُوا

اپنی نگاہ میں ہے یہی رازِ کائنات
اُس کو مِلی حیات، اگر یہ فنا ہُوا

بجلی کی طرح عُمرِ رواں تھی، گزر گئی!
یہ کیا سوال "کیا نہ ہُوا اور کیا ہُوا"

عالم پہ لاکھ طرح کے نغمے بکھر گئے
اُف قلبِ عندلیب میں نشتر چُبھا ہُوا

کیا شے جہانِ عشق میں ہے اہلِ آرزو،
خود اپنی زندگی سے گیا کھیلتا ہُوا

اِس حُسنِ اختلاف پر کیونکر نباہ ہو
وُہ شوخ طبع، اور یہاں دِل دُکھا ہُوا

آخر برس پڑیں نہ یہ آنکھیں تو کیا کریں
وہ پاس، اور شوق کا دریا رُکا ہُوا!

"ہرگز نہ رحم آئے گا اُس کو" یہ کیا کہا!
اچھا تو آدمی نہ ہُوا وُہ خدا ہُوا؟!

اللہ رے بعدِ یاس وُہ تصویرِ آرزو،
جیسے پڑا ہو کوئی شرارہ بجھا ہُوا

بھُولے گا کیا کبھی وُہ تبسم کا اِک جمال
نازک لبوں کی رو پہ شرر کانپتا ہُوا!

حرماں خیرآبادی

غزل

ہر جذبۂ غم کی تلخی میں اک مستیٔ پنہاں دیکھیں گے
جو گردشِ ساغر دیکھ چکے کیا گردشِ دوراں دیکھیں گے

ہر بار ہماری جانب سے تجدیدِ محبت کیا معنی
اِک دن تری نیچی نظروں کو خود سلسلہ جنباں دیکھیں گے

سمجھے تھے کہ تُو اے پردہ نشیں ادراکِ یقیں کی حد میں نہیں
لیکن یہ خبر کیا تھی کہ تجھے نزدیکِ رگِ جاں دیکھیں گے

اے ہم نفسو مایوس نہ ہو ٹوٹا وہ طلسمِ قیدِ قفس
اِک بار ذرا پھر مِل جُل کر کہہ دو کہ گلستاں دیکھیں گے

محسوس کچھ ایسا ہوتا ہے دُنیا کو سمجھ کر رشکِ ارم
جیسے کوئی مجھ سے کہتا ہو" پھر لغزشِ انساں دیکھیں گے"

ہے خواہشِ لُطفِ بے پایاں لیکن یہ کوئی اُن سے کہہ دے
تکمیلِ طلب منظور نہیں ہم وسعتِ داماں دیکھیں گے

سب رونقِ گلشن خاک ہوئی لیکن نہ گئی پھولوں کی ہنسی
شاید ہے انہیں یہ خوش فہمی پھر فصلِ بہاراں دیکھیں گے

بے کار ہیں تارے محرِ فسوں بے سُود ہے تکہتِ وقفِ جنوں
ہو جن کو نہ خود یارائے سکوں وُہ کس کو پریشاں دیکھیں گے

کیا اور شکیلؔ اب اس کے سوا ہو گا بھی مآلِ شکوۂ غم
اپنی ہی زباں پچھتائے گی اپنا ہی گریباں دیکھیں گے

شکیل بدایونی

تعاقب

آجکل ایک شخص نہایت مستعدی سے میرا تعاقب کر رہا ہے۔ کافی ہاؤس میں۔ سیر راہے۔ کسی محفل میں۔ جہاں کہیں میرا اُس کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔ وہ چھوٹتے ہی مجھ سے ایک سوال کرتا ہے۔ "صاحب! آپ کو پریم چند کا کونسا ناول پسند ہے؟" بظاہر سیدھا سادہ سوال ہے۔ جس کا جواب دینا مشکل نہیں۔ لیکن جس شخص نے پریم چند کا کوئی ناول نہ پڑھا ہو اُس کے لئے کچھ اتنا آسان بھی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ پچھلے دنوں پریم چند کی دوسری برسی کے موقع پر میں نے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ عنوان تھا "پریم چند بحیثیت ناولسٹ"۔ یہ مقالہ بے حد سراہا گیا۔ صاحب صدر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پریم چند پر ایسا پُرمغز مقالہ اُردو زبان میں لکھا گیا ہے نہ لکھا جائے گا۔ اور بہت حد تک۔ گو غیر شعوری طور پر ہی۔ صاحب صدر حق بجانب تھے۔ کیونکہ میں نے سارے کا سارا مقالہ ایک انگریزی کتاب سے جو کسی جدید نقاد نے او ہنری (O. Henry) پر لکھی تھی، چرایا تھا۔ البتہ اس میں تھوڑا سا رد و بدل ضرور کر دیا تھا۔ یعنی جہاں جہاں او ہنری کا نام آتا تھا۔ وہاں "پریم چند" لکھ دیا تھا۔ اُس جلسہ کے اختتام پر یہ شخص مجھے ملا۔ اور مجھے مبارکباد دینے کے بعد اُس نے کہا "میں پچھلے پندرہ برس سے پریم چند پر ایک کتاب لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اس موضوع پر آپ سے مفصل بحث کرنا چاہتا ہوں"۔ رسمی طور پر میں نے نہایت خندہ پیشانی سے کہا "بڑے شوق سے۔ آپ کبھی غریب خانہ پر تشریف لے آیئے"۔ لیکن جب کچھ دنوں کے بعد وہ واقعی میرے مکان پر آدھمکا، تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے پریم چند کا کوئی ناول شروع سے آخر تک نہیں پڑھا۔ کسی کا دیباچہ دیکھا ہے کسی کا پہلا باب پڑھا ہے، کسی کا آخری۔ خیر اُس دن تو میں نے اُسے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ مجھے آج زکام ہے، اور جب زکام ہو۔ تو اچھی چیز بھی بُری لگتی ہے۔ چاہے وہ پریم چند کی کہانی ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جب اتوار کے دن وہ پھر نمودار ہوا۔ تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ میں نے اُسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ پوچھا "آپ کو ولایتی شلغم پسند ہیں یا دیسی۔ آپ کو پتنگ بازی سے شغف ہے یا بٹیر بازی سے۔ آپ کی پتلون نئی ہے یا سیکنڈ ہینڈ"۔ لیکن وہ کم بخت ہر تیسرے منٹ کے بعد اپنا سوال دُہرا دیتا۔ "آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کو پریم چند کا کونسا ناول پسند ہے؟" آخر ایک دفعہ میں نے ہمت کر کے کہہ دیا "مجھے پریم چند کے تمام ناول پسند ہیں"۔ اُس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آخر تمام ناول شاہکار تو ہو نہیں سکتے"۔ میں نے سنجیدگی سے کہا "تو آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میرے خیال میں پریم چند کا کونسا ناول شاہکار کا درجہ رکھتا ہے"۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے آہستہ سے کہا "چوگانِ ہستی"۔ فرمانے لگے "کیوں پسند ہے؟" میں نے چہرے پر متانت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا "دیکھئے یہ ناول سب شریف آدمیوں کو پسند ہے۔ ممکن ہے آپ کو پسند ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مجھے بھی اچھا نہ لگے"۔

"چھوڑیئے اِس بات کو" اُس نے جلدی سے کہا۔ "یہ بتایئے کہ اس ناول میں آپ کو کونسا کردار پسند ہے؟"

"ہیرو کا"

"ہیرو کے علاوہ ؟"

"ہیروئن کا"

"ہیروئن کے علاوہ ؟"

"ہیروئن کے علاوہ مجھے کوئی کردار پسند نہیں۔"

"وجہ ؟"

"وجہ یہ ہے کہ ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ جتنے کردار ہیں، میں اُنہیں کردار ہی نہیں سمجھتا۔"

"آپ انہیں کیا سمجھتے ہیں ؟"

"گھسیارے"

خوش قسمتی سے اِس موقع پر ایک دوست تشریف لے آئے اور میں نے اُن سے معذرت چاہی۔ چند دن آرام سے گزرے۔ اُس کے بعد وہ پھر تشریف لے آئے اور کہنے لگے۔ "اُس دن آپ کے جوابات کچھ اس قدر مبہم اور غیر واضح تھے کہ میری تسلی نہیں ہوئی، آج مجھے تفصیلاً بتایئے، کہ آپ چوگانِ ہستی کو کیوں شاہکار تسلیم کرتے ہیں۔" میں نے چوگانِ ہستی کی شان میں چند رسمی تعریفی کلمات کہے۔ "دیکھئے۔ اس ناول میں پریم چند نے زندگی کی عکاسی کی ہے۔ بعض مقامات پر وُہ شیکسپیئر سے بھی بلند نظر آتا ہے۔ کردار سازی میں وُہ فیلڈنگ، سکاٹ، جیمز جائس سے بھی بازی لے گیا ہے۔ اسلوبِ بیان میں وہ ہمیں ٹامس ہارڈی، میریڈتھ اور ورجینیا وُلف کی یاد دلاتا ہے۔ دو ایک ابواب میں اُس نے چارلس ڈکنز، ٹھیکرے، موپساں اور میکسم گورکی سے ٹکر لی ہے۔" اُس نے مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اور کہا "مثلاً کونسے باب میں ؟" میں نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے جواب دیا "میرے خیال میں آخری باب میں یا شاید پہلے باب میں۔" اُس نے چوگانِ ہستی کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ اور کہا "آپ وثوق سے فرمایئے پہلے باب میں یا آخری باب میں ؟" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور جلدی سے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا۔ اِس وقت مجھے ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہے۔ میری خالہ کا بھائی فرنٹیئر میل سے آرہا ہے۔ آپ پھر کسی وقت تشریف لایئے۔" ایک ہفتہ کے بعد وہ پھر مجھے میرے گھر پر ملا۔ اُس دن میں نے جھوٹ موٹ عدیم الفرصتی کا بہانہ پیش کیا۔ "مجھے آج ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ بھینس بیمار ہے، اسے ہسپتال لے جانا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے لئے بہتر صفحات کا ایک فیچر لکھنا ہے۔ بچوں کے لئے ایک خرگوش خریدنا ہے"۔

اُس نے سنجیدگی سے کہا۔ "کوئی مضائقہ نہیں۔ میں پرسوں حاضر ہوں گا۔"

"پرسوں نہ آیئے گا۔ میں راولپنڈی جا رہا ہوں۔"

"بہت اچھا۔ اتوار کو سہی۔"

"دیکھئے اتوار کو میرے بھتیجے کی شادی ہے۔ اُس دن تشریف نہ لایئے گا۔"

"سوموار آجاؤں ؟"

"میرے ایک عزیز دوست سخت بیمار ہیں۔ شاید وہ سوموار کو چل بسیں۔ اس لئے آپ سوموار نہ آیئے گا۔"

"منگلوار کو آسکتا ہوں ؟"

"ہاں ہاں منگلوار کو ضرور آیئے گا۔ لیکن شام کو۔"

منگوار کی شام کو میں ایک دوست کے گھر چھپ کر بیٹھا رہا۔ اور اس طرح اُس دن یہ بلا ٹل گئی۔ چند دنوں کے بعد اُس نے مجھے کافی ہاؤس میں آدبوچا۔ اور پوچھا۔ "گئو دان اور چوگان ہستی میں آپ کس ناول کو ترجیح دیتے ہیں؟" میں نے کہا "گئو دان منشی جی کا آخری ناول ہے۔ اس لحاظ سے میں اُسے چوگان ہستی سے بہتر سمجھتا ہوں۔"

"یہ تو کوئی معقول وجہ نہیں۔"

"معقول وجہ کیوں نہیں۔ آخر جو ڈرامے شیکسپیر نے آخری دنوں میں لکھے، انہیں ہمیشہ اُن ڈراموں پر ترجیح دی جاتی ہے جو اُس نے اوائل عمر میں لکھے۔"

"لیکن اس سے آپ کیا یہ کلیہ گھڑ سکتے ہیں کہ مصنف کی آخری تصنیف اُس کی پہلی تصانیف سے ہمیشہ بہتر ہوتی ہے؟"

"کیوں نہیں"

"آپ کس اعتبار سے گئو دان کو چوگان ہستی سے بہتر سمجھتے ہیں؟"

"اس لئے کہ . . اس لئے کہ . . اس کا اختتام بہتر ہے۔"

"کس لحاظ سے؟"

"اس لحاظ سے کہ جب ہم گئو دان پڑھتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا وہی اختتام ہونا چاہئے تھا جو ہے۔"

اُس کی تسلی نہ ہوئی۔ اور اُس نے پھر کسی دن اس موضوع پر بحث کرنے کے لئے مجھ سے وقت مانگا۔ اُس دن کے بعد وہ کئی بار میرے مکان پر آیا۔ اور میں نے ہر بار اندر سے کہلا بھیجا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ آجکل وہ میرے مکان پر نہیں آتا۔ لیکن جہاں کہیں مجھ سے ملتا ہے، پوچھتا ہے۔ "آپ نے تفصیل سے نہیں بتایا کہ آپ کو پریم چند کا کونسا ناول پسند ہے؟" اور میں جھٹ یہ کہہ کر "اس وقت مجھے ذرا جلدی ہے۔ پھر عرض کروں گا" کنی کاٹ جاتا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں۔ کسی دوسرے شہر چلا جاؤں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ اُس سے ایک دن صاف صاف کہہ دوں کہ میں نے پریم چند کا کوئی ناول نہیں پڑھا۔ لیکن پھر سوچتا ہوں اُس مقالے کا کیا بنے گا۔ جو میں نے پریم چند کی دوسری برسی کے موقع پر پڑھا تھا؟

کنہیا لال کپور

رُباعیات

(۱)

پھر جینے کا انداز بدل جائے گا
احساس نئے رنگ میں ڈھل جائے گا
ہر گام پہ چلتا ہے ساغر ورنہ
یہ دور بھی ہاتھوں سے نکل جائے گا

(۲)

رونے کے لئے ہم کو بہانہ مِل جائے
بیگانوں میں کوئی تو یگانہ مِل جائے
بکھری ہوئی یادوں کو مِلا کر دیکھو
شاید کہیں ماضی کا فسانہ مِل جائے

(۳)

ظلمت میں کہیں کوئی ستارا ہوتا
بھٹکے ہوئے راہی کو اشارا ہوتا
طوفانِ حوادث کی حقیقت کیا تھی
اے کاش مجھے تُو نے پکارا ہوتا

(۴)

نیرنگِ بہار میں خزاں ہے ساقی
یہ شعبدۂ سود و زیاں ہے ساقی
ہنگامۂ پنہاں کا تماشائی ہوں
میرے لئے آرام کہاں ہے ساقی

(۵)

تو محرمِ حالات ہے اللہ اللہ
ساقی تری کیا بات ہے اللہ اللہ
مجبور کے ہر جرم پہ تعزیریں ہیں
یہ دارِ مکافات ہے اللہ اللہ

(۶)

یہ صوتِ فسوں کار سُنی ہے میں نے
ماضی سے کتنی بار سُنی ہے میں نے
ہر شام تصور کے شبستانوں میں
پازیب کی جھنکار سُنی ہے میں نے

(۷)

رنگوں میں نئے رنگ ملا دیتی ہے
ہر نقش کو تصویر بنا دیتی ہے
جب یاس کے آغوش میں سو جاتا ہوں
اُمید کوئی خواب دکھا دیتی ہے

(۸)

غم سے جو سروکار ہوا ہے ساقی
جینا مجھے دُشوار ہوا ہے ساقی
ہر چند نئے ساز تراشے میں نے
کس درد کا اظہار ہوا ہے ساقی

علاؤالدین کلیم

ادب اور جماعتی جنگ

کائنات ایک مسلسل عمل کی حامل ہے۔ فنی یا جمالیاتی اقدار کی تخلیق مصنف کو منطقی طور پر ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر نہیں لے جاسکتی جب تک کہ وہ کردوپیش کو ایک مسلسل عمل تسلیم نہ کرے۔ تمام افراد کائنات میں تو دلچسپی لے سکتے ہیں لیکن اس کے کسی مخصوص حصے یا چند فنی یا جمالیاتی اقدار میں نہیں۔ اس وجہ سے داخلی ادب لوگوں کی اکثریت سے کٹ جاتا ہے اور ایک مختصر گروہ کی ترجمانی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے۔ اس مضر تجربے سے بچنے کے لئے مصنف کو یہ بنیادی اصول ماننا پڑتا ہے کہ ہر مادی وجود ایک مستقل خارجی عمل کا حصہ ہے اس نظریے کا ذہنی اثبات سوچنے والے کو ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر لے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس قسم کا ادب تفصیل کے اعتبار سے عملی اور جامعیت کے اعتبار سے تمام کائنات پر محیط ہو سکتا ہے۔

کائناتی عمل مسلسل ہونے کے علاوہ جدلیاتی اور خود متبائن بھی ہے۔ اس میں لاتعداد ضدیں اور ان گنت طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ یہ عمل بلا واسطہ (Direct) اور مستقیم نہیں بلکہ بالواسطہ اور مخفی ہے کبھی منفی حالات غالب ہوتے ہیں اور کبھی مثبت۔ کائناتی عمل کے اس جدلیاتی پہلو کا شعور مصنف کو جماعتی جنگ کا احساس دلاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ معاشرہ کی زندگی یکسانیت اور مساوات کی حامل نہیں بلکہ اس میں کئی متنازع جماعتیں ہیں ہر جماعت کا اسلوبِ حیات اپنا ہے اور وہ اپنی بقا کے لئے مخالف جماعتوں سے بقدرِ مفاد نبرد آزما ہے۔

جماعتی جنگ کا شعور کوئی بے مزاحمت فعل (Passive activity) نہیں بلکہ ہر مصنف اس کا اکتساب کرتا ہے اور اس اکتساب میں اُس کی بدنی اور ذہنی کاوشوں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ معاشرہ کے مختلف طبقے مصنف پر اپنا عمل کرتے ہیں کیونکہ وہ اُن کا ایک ناگزیر حصہ ہے وہ ہر عمل کا ردِعمل کی صورت میں جواب دیتا ہے اور اس عمل اور ردِعمل کی ساری میکانیت (Mechanism) کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی یہ کوشش نظری کوشش ہے جو اسے معاشرہ کے جماعتی نزاع کو حالات کے مطابق سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ معاشرہ کی طبقاتی تبدیلی اور مصنف کی شعوری تبدیلی کوئی متوازی عمل نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ خارجی حالات کی ہر معمولی تبدیلی مصنف کی شعوری تبدیلی کا باعث بن جائے۔ عملی مشاہدہ ثابت کرتا ہے کہ انسانی ذہن خارجی حالات کی رفتار کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا بلکہ مقابلتہً بہت سست ہے۔ میکسم گورکی اس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے ”خارجی اصلیت انسانی دماغ کو ہمیشہ پیچھے چھوڑ دیتی ہے کیونکہ انسانی دماغ جو اُسے پیدا کرتا ہے بہت آہستہ آہستہ ترقی کر کے تکمیل تک پہنچتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو اصلیت انسانی دماغ کو مطمئن کر دے۔ اور جیسا کہ ظاہر ہے اطمینان تساہل کی بنیاد ہے اصلیت تاریخ کے لامحدود اور دانشمندانہ محرکات سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ترقی کرنے سے باز نہیں رہ سکتی“ ——— اس قاعدہ کے مطابق ایک ہی زمانے کے مصنف ایک ہی حالات میں رہتے ہوئے مختلف طریقوں پر فکر کرتے ہیں۔

انسانی دماغ حالات کو صرف سمجھتا ہی نہیں بلکہ اُسے تبدیل کرنے کی بھی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ مصنف بھی جماعتی نقطۂ نظر سے بیرونی معاشرتی رشتوں کو صرف سمجھتا ہی نہیں بلکہ ایک ارتقائی مقام پر پہنچ کر اُن کے خلاف بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی اُسلوب زندگی وہی طریق پیداوار وہی طبقاتی نسبتیں جنہیں وہ درست سمجھتا تھا۔ اب اُس نے کسی اور ہی طرح نظر آنے لگتی ہیں۔ اور وہ اُن کے مٹانے پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ مصنف کو اس اندازِ نظر سے ایک خالص ادبی فائدہ بھی پہنچتا ہے کوئی مصنف اگر اپنے زمانہ سے ایک ہزار برس پہلے کا واقعہ جس کا روائتی اعتبار سے موجودہ زمانے سے کوئی تعلق نہ ہو قلمبند کرے تو مواد کے اعتبار سے قاری اُس میں دلچسپی کا اظہار نہیں کرے گا بالفرض اگر جمالیاتی اقدار کے باعث قابلِ قبول بن جائے تو بھی افادی نہیں بن سکتا۔ گذشتہ عہد کے واقعات موجودہ افراد کی ذہنی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اُنہیں تو ایسا مواد ہی پورا کرے گا۔ جو اُن کی مادی اور ذہنی ضروریات کا حل پیش کرتا ہو ـــــ یہ وجوہ مصنف کے جماعتی فکر کو انقلاب کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور مصنف زندگی کی متنازع طاقتوں کو صرف بیان ہی نہیں کرتا بلکہ منفی حالات کو جو معاشرہ کے ارتقا میں رکاوٹ ڈالتے ہوں مٹانے کی سعی بھی کرتا ہے اب اُس کا مطمحِ نظر سماج کا طبقاتی اظہار ہی نہیں ہوتا بلکہ سماج کی نئی قدروں کی تخلیق کرنا بھی اُس کے پروگرام میں شامل ہو جاتا ہے سماج کی نئی قدروں اور نئی جماعتوں کا تصور کیونکہ گذشتہ سماجی تاریخ کے منافی ہوتا ہے اس لئے تعمیری قوانین رواج دینے سے پہلے تعمیری قوانین کی احتیاج کو ظاہر کرنا ضروری ہے۔ یہ اُسلوبِ فکر ادب میں تنقیدی رجحان کو رواج دیتا ہے۔ اور مصنف میں محاربی انداز پیدا کر دیتا ہے۔

جس مصنف کو معاشرہ کی بدلتی ہوئی جماعتوں اور اُس کی مقداری یا کیفیاتی تبدیلیوں کا پورا شعور ہوتا ہے اُس کی ادبی روایات داخلی ادب کے پیرو ادیبوں کی روایات کی طرح فرسودہ استمراری اور مشینی نہیں ہوتیں بلکہ مسلسل ترقی و ارتقا پر ایمان رکھنے کی وجہ سے اُسے ہر دور کی ذہنی دریافتوں کے مطابق نئی تخلیقی روایات کو پیدا کرنا ہوتا ہے

ادب میں جماعتی جنگ کا اظہار حقیقت میں تاریخ انسانی کے اُن تنازعات کے اظہار کا نام ہے جو آقا اور غلام ـــ زمیندار اور کسان۔ سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان ہوتے رہے ہیں۔ ہر زمانے کے ادب کو اُس کے مادی پس منظر کی روشنی میں دیکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ ادب پر کوئی قید لگا دی جائے یا اُسے معاشرے کے متنازع گروہوں میں بانٹ دیا جائے بلکہ بقول (Mikhail Lifshitz) اُس کا مطلب ہے کہ ہر قاری اپنے ادب کی متقل اور دیرپا قدروں کو آسانی کے ساتھ سمجھ لے۔ اس اندازِ تنقید سے یہ بات کلیتہً واضح ہو جاتی ہے کہ فلاں مصنف کا شعور کس قدر ترقی یافتہ تھا اُس کے اظہار میں گہرائی اور صداقت کس قدر تھی۔ اُس کا ذہنی رجحان کن سماجی طاقتوں کی طرف تھا وغیرہ وغیرہ

ادب کو جماعتی قدروں سے پرکھنا کافی دقّت طلب کام ہے۔ معاشرہ کا غلط تجزیہ کرنے والے ناقد کسی مصنف پر صحیح تنقید نہیں کر سکتے ہر مصنف کا کسی ایک جماعت سے تعلق ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس کا ادب بھی اُس کی متعلقہ جماعت کا پابند ہو۔ ایک درمیانہ طبقہ کا ادیب ایسا ادب پیش کر سکتا ہے جو معاشرہ کی ایک یا دو سے زیادہ جماعتوں کی ترجمانی کر سکے۔ جماعتی جنگ کا غلط تجزیہ کرنے والے ناقدوں نے پشکن کو ایک جماعتی ادیب ہی سمجھا تو (V. Kemenov) نے اُن کی تردید میں لکھا۔ نوابی نظریات کے نمائندہ کی حیثیت سے پشکن ایک جماعتی ادیب تھا لیکن ایک بڑے فنکار کی

حیثیت سے اُس نے ایسی قدریں پیدا کیں جو صرف روسی زمینداروں کے مفاد سے ہی نہیں بلکہ روس کے تمام اشرفا کی عملی دنیاؤں سے بھی بالا تھیں۔"

گزشتہ ادب کو موجودہ جماعتی شعور کی روشنی میں دیکھنا بھی غلط ہے ہر زمانہ اپنے جماعتی رشتوں کے ساتھ ایک خاص شعور کا حامل ہوتا ہے لہٰذا ہر ادیب کو اُس کے اپنے ماحول میں دیکھنا ضروری ہے۔ کاڈویل کا ایلک ویسٹ سے موازنہ بے معنی ہے مقدم الذکر اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے انگلستان کی پیداوار تھا لیکن موخرالذکر بیسویں صدی کے انگلستان کی۔ اٹھارہویں صدی میں کاڈویل کا یہ اعلان کہ معاشرہ ایک "نظم ابدان" (Body Polity) ہے اور سرمایہ داری یعنی انفرادی منافع خوری اس نظم ابدان کی ضد ہے اپنے ماحول کے مطابق اتنا ہی ترقی پسندانہ ہے جتنی ایلک ویسٹ کی موجودہ زمانہ کی مارکسی تنقیدیں۔

قرونِ وسطیٰ کا انگلستان سیاسی مطلق العنانی اور مذہبی تشدد کی وحید مثال ہے اُس وقت ادیب ایک ایسے پُرسکون زمانہ کی تمنا کیا کرتے تھے جس میں حوا کاتتی ہو آدم بُنتا ہو اور انسانی زندگی پیچیدگیوں سے بالکل مبرا ہو۔ اس ادیبانہ فکر کو اگر موجودہ حالات کی روشنی میں جانچا جائے تو بات نہ بن سکے گی۔ اپنے زمانے کے مطابق یہ فکر مروجہ تشدد کے خلاف ایک نئے معاشرہ کا خواب تھا۔

جماعتی نظر سے ادبی تنقید کرتے ہوئے ایک اور دقت بھی ہے تاریخ میں ایسے وقت بھی آتے ہیں جب معاشرہ اپنے عبوری دور سے گذر رہا ہوتا ہے اور جماعتی الجھن (class consciousness) اپنے دور پر ہوتی ہے ایسے زمانے کے ادیبوں پر تنقید کرتے ہوئے سخت احتیاط کی ضرورت ہے رُوس میں ۱۸۹۱ سے ۱۹۰۵ تک جماعتی اُلجھن کا زمانہ تھا نئی جماعتیں ابھی تشکیلی عمل سے پوری طرح نہیں گذری تھیں اور یہی زمانہ ٹالسٹائی کا تھا غلط ناقدوں نے ٹالسٹائی کو بھی جماعتی پنجرے میں بند کر دیا۔ اور اس پر رجعت پسندی کی مہریں لگا دیں لیکن صاف فہم ادیبوں نے ٹالسٹائی کے ادب کی صحیح قدریں دریافت کیں اور بتایا کہ ٹالسٹائی صرف اپنی لفظی معنوی کے باعث آنیوالی نسلوں سے خراج تحسین حاصل نہیں کرے گا۔ بلکہ اُس کی سب سے بڑی فنی بزرگی یہ ہے کہ اُس نے حکومت کے مقابلے پر عوام کے ہمہ گیر ٹرنڈ کا ذکر کیا ہے۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد ہندوستان بھی جماعتی الجھن کے دور سے گذر رہا تھا ایک طرف روس اور چین کا انقلاب جماعتی شعور پیدا کر رہا تھا۔ اور دوسری طرف صنعتی ترقی کے باعث دھیرے دھیرے درمیانہ طبقہ پیدا ہو رہا ہے چنانچہ اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے مذکورہ ادبی ماحول کا خیال رکھنا ضروری ہے ٹالسٹائی میں آزادیٔ عوام اور صلح جوئی کا تضاد موجود ہے۔ اقبال میں آزادیٔ جمہور اور شاہنشاہیت کا تضاد موجود ہے یہ تضاد غیر فطری نہیں ان سے دونوں آرٹسٹوں کے ماحولی تضاد کا پتہ ملتا ہے اور یہی ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

غلط ناقد جماعتی تجزیہ کرنے کے باوجود ادب کی فنی شکل (form) کو سماجی رشتوں سے لاتعلق سمجھتے ہیں اور آرٹسٹ کی فنی عظمت کو ایک ایسا تحفہ بتاتے ہیں جس کا تاریخی ارتقا سے کوئی تعلق نہ ہو ہر زمانہ اپنے ساتھ نئی پیداواری طاقتیں اور نئے جماعتی رشتے لیکر آتا ہے یہ پیداواری طاقتیں اور جماعتی رشتے افراد کے شعور کو ایک خاص انداز میں ڈھال دیتے ہیں چنانچہ ہر زمانے کا مخصوص اسلوب فکر اپنی form خود پیدا کرتا ہے۔ فارم مافیہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ mechanical ہوتی ہے تقدم اگرچہ مافیہ کو ہی حاصل ہے لیکن فارم اُس پر ردعمل کرتی ہے اس لئے غیر منطقی اور غیر ضروری نہیں ہوتی جس طرح ماحول کی پابندی کے باوجود ایک بڑا آرٹسٹ تمام جماعتوں پر محیط ہو سکتا ہے اسی طرح فارم بھی کئی ادوار اور کئی جماعتوں کے لئے قابلِ قدر ہو سکتی ہے۔ روسی اور یونانی ادب آج بھی زندہ ہے کیونکہ اس ادب نے لازوال شہرت کی ذہنی تصویریں فن کے سانچے میں ڈھال دی ہیں۔

ظہیر کاشمیری

اِحساس و ادراک

یہ گھنا جنگل، یہ خاموشی کی پُر اسرار لَے! اِس اندھیرے میں یہ پوشیدہ مغنّی کون ہے؟
جو سکوت افزا ترنّم سے کیا کرتا ہے طے
ہر دیارِ کائنات

اس کے آہنگِ مسلسل میں فرشتوں کی اُڑان اس کے سرگم میں نہاں دستِ مشیّت کی اُٹھان
رُوح میں یوں پیچ و خم کھاتی ہے اِس کافر کی تان
جیسے اسرارِ حیات

سانس ہے اس کی، کہ بہتی ہے شرابِ لالہ فام اس کی کروٹ ہے کہ لرزاں ہے دو عالم کا نظام
لمس ہے اس کا، کہ خود یزداں ہے مصروفِ کلام
در بیانِ ممکنات

آگہی کہتی ہے — اِس راہِ سرور آگیں پہ چل شوق کہتا ہے — خیابانوں کے محبس سے نکل
حُکمِ شاہی ہے کہ اِک نقطے پہ جم جا سر کے بَل
کھو کے امکانِ نجات

لیکن اِک آواز! — خاموشی سی جو موہوم ہے۔ جس کا منبع یا تو خود فطرت ہے، یا معدوم ہے!
"تُو اگر انساں ہے، ہر کرّہ ترا محکوم ہے
اے قتیلِ حادثات!"

یک بیک ہیجان سا آتا ہے ہفت افلاک میں کلبلاتے ہیں کئی مرّیخ بطنِ خاک میں
دہر گھِر جاتا ہے اِس ناقوس کے پیچاک میں
آگہی کھاتی ہے مات

احمد ندیم قاسمی

سویرا

دور پرے حدِ نظر کے قریب ایک گاڑیبان چلا چلا کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے گا رہا تھا ——

کوئی چولا لیراں دا   کول ہی کھوہ دگدا

کول ٹپلا فقیراں دا

بیل جو گاڑی میں جتے ہوئے تھے اپنی مستانہ چال سے چلے جا رہے تھے۔ "کتنے بے پرواہ لوگ ہیں! جب بھی کوئی جاٹ اکیلا ہوگا نا شروع کر دیتا ہے۔ جذبات خام ہی اونچے اونچے سروں میں بہ نکلتے ہیں۔ سوچنے کا تو یہ لوگ اپنے دماغ کو موقعہ ہی نہیں دیتے" دلّود کے دل میں خیال گذرا۔

سڑک کے کنارے پر چھپر کے نیچے دھونی رمائے ہوئے جوگی کی آنکھ لگ گئی تھی۔

"ٹپلا فقیراں دا" سن کر وہ چونک اٹھا۔ اس نے جھلسی ہوئی لکڑیوں کو جھاڑا ایک چھوٹا سا شعلہ نکلا۔ دھوئیں میں ایک روشن سی لکیر۔ وہ لہرایا اور گم ہو گیا دلّود کو یاد آیا کس طرح یہی سادھو آج سے دو مہینے پہلے ٹاہلی کی چھاؤں تلے بیٹھا بھیک مانگا کرتا۔ کبھی کبھی کسی تھکے ہارے راہگیر کو وہ اپنے پاس بٹھا لیتا اور گیان کی باتیں کرنے لگتا پھر کس طرح اس کے شردھالو بڑھتے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھونی لگ گئی لکڑیوں کے ڈھیر جمع ہونے لگے آخر کسی نے ایک چھوٹا سا چھپر بھی بنوا دیا۔ دریاں آ گئیں۔ گدے بچھ گئے۔ سوچتے سوچتے دلّود کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ تھوڑا ہی سا عرصہ گذرنے کے بعد اس جگہ ایک بڑا مندر بن گیا ہے۔ لوگ دور دور سے اس کی یاترا کے لئے آ رہے ہیں۔ دنیا کی بھیڑ چال پر دلّود کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کتنے ہی مندر مسجدیں اور شوالے ہر روز ہندوستان میں اسی طرح بنتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی حیرانی میں اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

کائیں کائیں کرتے ہوئے کوؤں کی ڈار اس کے سر پر سے گذر گئی۔ ایک بیٹھ اس کے تکیے پر آ گری کان کے عین قریب۔ وہ حیران تھا کہ اتنے سویرے کوؤں کے غول کے غول اڑ کر کہاں جاتے ہیں۔ [illegible] کھیت تو دوسری طرف ہیں۔ شہر میں انہیں کیا ملتا ہوگا۔ شاید لوگوں کے گھروں میں آنے والے مہمانوں کی خبر دینے جاتے ہوں گے۔ پھر اسے وہ بات یاد آئی جو بچپن میں اس کی ماں نے بتائی تھی۔ وہ سکول جانے کے لئے وقت پر نہ جاگتا تو وہ کہا کرتی تھیں "دیکھو بیٹا کوے اپنے مدرسے کو جا رہے ہیں اور تم ابھی تک جاگے بھی نہیں" بچپن کس قدر میٹھا ہوتا ہے۔ کس قدر معصوم ہوتا ہے۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔

چوبرجی کے برج دور دھندلکے میں سے ابھر رہے تھے۔ ایک سال گرمیوں میں دلّود کوہ مری کی دو برجی کوٹھی میں رہا تھا۔ لیکن اس دو برجی کوٹھی کا برج تھا ایک ہی۔ لاہوریوں کی چوبرجی کے برج بھی تین ہی ہیں۔ شاید برج گنتے ہوئے لوگوں کو دھوکا لگ جایا کرتا ہے۔ دنیا کے نام رکھنے کے طریقوں پر اسے خود آپ ہی پھبتی سوجھی۔

پچھواڑے نئی آبادی کے کسی مندر میں گھنٹہ بجنے لگا۔ اس لگاتار ٹن ٹن کی آواز سے دلّود گھبرا رہا تھا کہ کسی مسجد سے

موذن کی آواز سنائی دینے لگی۔ "اور نسب تک یہ آوازیں ہمیں ایک دوسرے سے جدا کیا کریں گی؟" اس کے دل میں خیال گذرا ——— مندر کا گھنٹہ بند ہوگیا۔ مسجد کی بانگ ختم ہوگئی۔ دلنود نے ٹانگوں کو اور پھیلا کر پسار دیا۔ اپنا ننگا بازو اس نے چادر سے باہر نکال لیا۔

تمہیں تو کہا تھا دن نکلنے سے پہلے پہلے ڈبل روٹی لے جایا کرو۔" معاف کردو بھیا۔ آج دیر ہوگئی ہے۔"

"دیر دیر نہیں اگر ایسا ہی کرنا ہے تو ہم دوسرے کو آرڈر دے دے گا۔"

"ایسی تو مشکل ست چوکیے جی ہو۔"

"تو تم اس کا ذمہ دار ہے کیا؟"

کوٹھی کا بیرا ڈبل روٹی والے کو جھڑک رہا تھا۔

"ہر شخص اپنے سے کمتر کے ساتھ جلا کٹا بولتا ہے۔" دلنود حیران تھا رات سوتے وقت بی بی جی نے بلی رام کو سخت سست کہا تھا۔ کبھی کبھی جب ان کی سیر کی لکڑی نہ ملے تو سردار صاحب بی بی جی پر بھی برس پڑا کرتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں "سیڑھیاں" بنی ہوئی ہیں۔ جو گردن ادھر اکڑتی ہے اُدھر ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ لیکن بات کیا ہے۔ جب ہم غصہ میں بھرے ہوں تو ہمارے منہ سے بات اردو ہی میں نکلتی ہے۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ پنجابی زبان شاید اتنی میٹھی ہے کہ اس میں کڑوا بول ہیسے ہی نہیں ——— اردو افسروں کی بولی ہے۔ ہم جب ناراض ہوتے ہیں تو شاید اپنے آپ کو افسر ہی سمجھنے لگتے ہیں . . . . "توڑ ٹانگ دو۔" اٹھے پر تو ہینڈل بھی سست ہونا چاہیئے۔ اسے یاد آیا کہ اس طرح کئی لوگ اردو کی ٹانگ توڑا کرتے ہیں۔

"ٹپ ٹپ" سے نیچے کوٹھی کے صحن میں کسی کے پاؤں کی آہٹ تھی۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے اس نے حیرانی میں دہرا ہو کر دیکھا۔ پیلے رنگ کی میلی سی دھوتی پہنے بھنگن جھاڑ دے رہی تھی۔ جمعدارنی جمعدار سے ذرا لانبی تھی یہی وجہ تھی کہ جب وہ جھاڑو دیتی تو اُسے بہت کبڑا ہو کر کام کرنا پڑتا۔ "پچھلے سال" ان دنوں میں" تو کبھی کبھی بچاری بیٹھ کر کوٹھی کی لمبی لمبی سڑکوں کی صفائی کیا کرتی تھی دلنود کے دل میں کچھ خیال ہوا۔ اس نے پھر دہرا ہو کر دیکھا۔ اس کے ماتھے کے بال بھیگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اُسے یقین ہوگیا کہ ضرور نہا کر آئی ہوگی۔ "بعض اچھوت کتنے صاف ہوتے ہیں" اس کے دل میں خیال گذرا۔ گاندھی جی اچھوت ادھار کے لئے جو مرن برت رکھنے پر تیار ہو گئے تھے تو سچے تھے ——— جواہر لال کبھی ڈولی میں نہیں پڑتا۔ اس کے سینے کچھ اور ہیں ——— پنڈت نہرو کتنا حسین ہے ——— ٹیگور شاید سب سے زیادہ خوبصورت ہندوستانی تھا۔ گاندھی کا دماغ بہت باریک ہے۔ صلح اور سچائی کے جو ہتھیار اس کے پاس ہیں کتنے زبردست ہیں ——— "ٹھک" پھاٹک بند ہونے کی آواز آئی۔ جمعدار ایک بغل میں اپنی جھاڑو دبائے دوسرے ہاتھ سے اپنے بچے کو انگلی پکڑائے اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ساتھ والی کوٹھی میں داخل ہوگیا۔

سفید سفید اور چھتوں والے کبوتروں کی ڈار اوپر سے اڑی۔ لاہور کی بہت سی انوکھی چیزوں میں ایک یہاں کے کبوتر بھی ہیں۔ نہ یہ جنگلی ہیں نہ پالتو۔ دلنود نے دل میں سوچا لیکن کبوتر تو اجاڑ ڈھونڈتے ہیں ——— شہر کی تواریخ میں بے لاتعداد کشت و خون اور لوٹوں گھسوٹوں کے یاد آنے پر اور آئندہ ایسے ہی ہونے والے واقعات کی توقع پر اس کا دل بیٹھ گیا۔ پرانے شہروں میں شاید کبوتر ہوتے ہی بہت ہیں۔ پرانے وقتوں کی عمارتوں کے ساتھ یہ اپنے زمانہ

کی نشانی باقی ہیں ——— شاید اسی ڈلار کا پردادا یا پرپردادا کا پردادا کسی مغل شاہزادہ کی بیٹی کسی شاہزادی کے پاس سے لایا تھا

۔ سنتے ہو بیے! تم سے کہا ہے کمرے صاف کرو" بی بی جی جاگ اٹھے تھے بڑے گھروں کی عورتیں کیسی شہد میں زبان ہوتی ہیں۔ گھر میں آئے گئے کی کیسی آؤ بھگت کرتی ہیں۔ ان کے نیچے بھی ایک نئے سرے سے عزت سے پیش آتے ہیں۔ اسے یاد آیا کہ نوکروں کے کوارٹروں میں کیونکہ ہر روز جوتوں میں دال بٹتی ہے۔ مالی مالن کے پیٹنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔ وہ آگے دن بھر بچوں کی مرمت کرتی رہتی ہے ——— بات حقیقت میں یوں ہے کہ بڑے گھروں میں غصہ کی تھیلی شاید نوکروں پر ہی خالی ہو جاتی ہے۔ خالی مٹھاس اور پیار رہ جاتے ہیں جو باقی سب پر تقسیم ہوتے ہیں۔ نوکروں پر کوٹھیوں میں بھی جھاڑ برستی ہے اور کوارٹروں میں بھی انہیں تلخی ہی میسر آتی ہے ——— لیکن اپنی بیوی کے ساتھ جو اس کے بچوں کی ماں ہے ہمارا مالی کیونکر لڑ سکتا ہے۔ وہ جب میں اور کملا ناراض ہو گئے تھے ہار مجھی کو ماننا پڑی تھی۔ تریا ہٹ مشہور ہے اصل میں عورت کو مرد پر مان ہوتا ہے۔ جب مرد توقع کی ترازو میں پورا نہیں اترتا عورت کے دل کا شیشہ ٹوٹ جاتا ہے

پو پھٹ رہی تھی۔ ہر بادل پر پڑی ہوئی اوس چمکنے لگی۔ اور پورب میں راہ ٹٹولتا ہوا سورج اپنے پہلے پڑاؤ کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اناروں کے بوٹوں میں چڑیوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ باہر گیٹ کی بجلی گل ہو گئی پتنگے کھا کھا کر پھولی ہوئی چھپکلیاں اپنے بلوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ مزدور کی آنکھ کھلی۔ وہی کدال وہی بیلچہ اور وہی ٹوکری پہاڑ بن کر اس کے سر پر گر پڑے۔

دلو دپھر سو گیا تھا۔ آخر پچھواڑے والے لڑکیوں کے کالج کے ہوسٹل میں جاگنے کی گھنٹی بجی۔ وہ پھر جاگ اٹھا۔ چھ بج چکے ہیں۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا دوپٹے سنبھالے بال بکھیرے آدھی بندی آدھی کھلی آنکھیں ملتی ہوئی انگڑائیاں لیتی ہوئی لڑکیاں مچھر دانیوں میں سے نکل نکل کر نیچے اتر رہی تھیں۔ "ہندستان آخر بدل ہی رہا ہے" اس نے دل میں سوچا۔ لیکن بیبی "شان" کو کالج میں داخل کرتے وقت کتنی تکلیف ہوئی تھی ——— ملک کو نیا بننے میں اور کتنے سال لگیں گے۔ اس وقت تک وہی لوگ رہ جائیں گے۔ جو اس کے نکھار میں راضی ہیں۔" لیکن نئی روشنی بری ہے" کئی لوگ کہتے ہیں۔ گندی جگہ سے صاف جگہ تک آتے ہوئے رستے میں کئی لوگ پھسل پڑتے ہیں۔ اس میں صاف جگہ کا کیا قصور ہے لیکن بڑی اماں شان کو کالج کیوں نہ بھیجتی تھیں ؟ ——— بچپن میں پتا جی مجھے اپنا قیمتی قلم نہ دیا کرتے تھے۔ ان کو ڈر تھا میں گم کر دوں گا۔ بڑی اماں کو بھی خوف تھا۔ شان "گم" نہ جائے۔ جب خاوند اپنی بیوی کو کسی سہیلی کے ہاں اکیلے جانے سے روکتا ہے تو اس کا باعث بھی ایسا ہی خطرہ ہوتا ہے۔ تمام دنیا کے تعلقات میں اسی قسم کا خوف جاری و ساری ہے۔ اگر یہ "خوف" نہ ہو تو دنیا کے کاروبار بند ہو جائیں۔

"دودھ بکری کا ——— لے لو دودھ تازہ بکری کا" دس پندرہ بکریوں کو ہانکتا ہوا دودھ والا نوکروں کے گھروں کی طرف ہانک لگا رہا تھا۔ دودھ بیچنے کا یہ طریق دلو کو ہمیشہ حیران کیا کرتا تھا۔ دودھ بکری ہی کا سہی۔ ہے تو بالکل تازہ اور صاف۔ اسے نادر گوالا جو کئی سال تک کوٹھی میں دودھ دیتا رہا یاد آیا۔ ایک دفعہ نادر کے دودھ میں سے چھوٹی سی مچھلی نکل آئی تھی۔ بیچارے کی چوری پکڑی گئی۔ "گائے کہیں مچھلی پی گئی ہوگی بی بی جی" اگلے روز جب دریافت ہوئی تو اس نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔ دلو کو پھر بچپن کے دن یاد آئے جب گاؤں میں ان کے

ہاں وہ دو تین تھی بھینسیں ہوا کرتی تھیں کس طرح وہ انہیں پانی پلانے جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ بھینسیں لڑ پڑیں ان کے سینگ آپس میں پھنس گئے۔ سارے گاؤں میں ہل چل مچ گئی۔ آخر بیچاری "بھوری" کا سینگ آری سے چیرنا پڑا تھا۔ کتنا رویا تھا ان کا نوکر لپٹ لاڈلے مال کے ساتھ ظلم ہوتا دیکھ کر اسی غم میں تو بخار آنے لگ گیا تھا۔ جب بھی وہ بھوری کو دیکھتا اس کا دل بیٹھ سا جاتا۔

——— "او ہو بڑی دیر ہو گئی" ونود نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ زرد زرد دھوپ نکل آئی تھی۔ سامنے کا سارا آکاش روشنی سے منور ہو چکا تھا۔ سڑک پر آمد و رفت کافی بڑھ گئی تھی۔ ونود اٹھنے ہی کو تھا کہ اس کا ننھا سا چار سالہ بچہ اسے جگانے آیا۔

"آپ ابھی تھوڑی بیٹھے ہیں۔ ہم تو مدت سے جگ رہے ہیں"۔ سونے کے کپڑوں میں بال بکھرائے جب ننھا لڑکا اپنے بتا کے پاس آتا ہے۔ اسے بہت ہی پیارا لگتا ہے۔ ونود نے اسے گود میں لیا اور چھاتی سے لگا لیا۔

"تیری اماں بھی جاگ اٹھی ہیں؟ کیلاش!"

"ہاں تو"

"وہ کیوں نہیں آئے؟"

"پھر وہ نہیں آتیں"

"اچھا تم میرے بیٹے ہو یا اپنی اماں کے؟"

اس بات کا فیصلہ کرنا کیلاش کے لئے بڑا مشکل ہوا کرتا تھا کئی دفعہ پہلے بھی اس سوال پر وہ دیر تک شش و پنج میں رہا کرتا تھا۔ اگر ماں نہلاتی تھی۔ کپڑے بدلتی تھی۔ سارا دن پیار کرتی تھی تو پتا بھی تو بازار لے جایا کرتا تھا۔ سائیکل انہوں نے ہی تو لے دی تھی روز ٹافیاں خریدنے کو پیسے دیتے تھے۔

"تم بولتے ہی نہیں کیلاش؟ کیا سوچ رہے ہو؟ میں نے پوچھا ہے۔ بیٹا کس کے ہو گے؟"

"ڈیڈی! آپ کا"

"اپنی اماں کے سامنے بھی کہہ دو گے نا؟"

بچہ چپ رہا۔ ونود نے اس کی آنکھوں میں دیکھا وہ صاف انکاری تھا۔

"اچھا کیلاش! تمہیں بازار سے کیا لا دیں؟ سیتا خالہ کی بیٹی تمہیں پیاری لگتی ہے؟"

"ہاں ڈیڈی۔ چھوٹی ممی بہن، بچہ دانی ممی" اس نے اپنے ہاتھوں سے بتایا ونود مسکرایا۔ معلوم نہیں ابھی کے روز باقی ہیں۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ اچھا کیلاش وہ گیت تو سناؤ "ندی کنارے بیٹھ کے آؤ"

"نہیں ڈیڈی پیا ملن کو جانا" "نہ بھئی ندی کنارے"

"نہ بھئی۔ پیا ملن"

"نہ! پھر ہم نہیں بولیں گے"

کیلاش چپ ہو کر چھاتی پر لیٹا رہا۔ ونود آنے والے دنوں کے تصور میں غرق ہو گیا۔ آخر جب اس نے بچے کی طرف دیکھا تو وہ سو رہا تھا۔

"بھلا مانس کسے جگانا تھا جگاتا آپ ہی سو گیا ہے" بچے کو سینہ سے چمٹائے ونود اٹھا اور نیچے اتر گیا۔

کرتار سنگھ دگل

غزل

پُرنور ہے عالم ترے جلووں کے اثر سے
ہر ذرّہ ہے خورشید ترے فیضِ نظر سے

کیوں درد اُٹھا ہُوک اُٹھی میرے جگر سے
کیا تُو نے گرایا ہے مجھے اپنی نظر سے

اب اس سے غرض کِس کو گھٹا برسے نہ برسے
پیمانے برسنے لگے ساقی کی نظر سے

سرشار کوئی ہے کوئی اِک گھونٹ کو ترسے
ساقی! یہ گلہ ہے تری مستانہ نظر سے

اب کیف نظر سے مری برسے کہ نہ برسے
دیکھا ہے کسی نے مجھے پُرکیف نظر سے

دیکھا تھا کبھی خواب میں اِک رشکِ چمن کو
اب تک چمنستان ٹپکتے ہیں نظر سے

غائب ہوئے نظروں سے کلیسا بھی حرم بھی
پردے جو تعیّن کے اُٹھے میری نظر سے

ڈر ہے کہیں بن جاؤں نہ محسُودِ زمانہ
وُہ دیکھ رہے ہیں مجھے اُلفت کی نظر سے

ہر ایک اشارہ ترا اَے ساقیٔ رعنا!
رہتا ہے نظر میں بھی جو ہوتا ہے نظر سے

اے ذوقِ نظر! دیکھ مَیں کیا دیکھ رہا ہوں
وُہ دیکھ رہے ہیں مجھے دزدیدہ نظر سے

دُنیا سے انہیں کام نہ کچھ دین سے مطلب
وُہ دیکھتے ہیں جن کو محبت کی نظر سے

مسجُود وہی ہے مرا مقصُود وہی ہے
جو خواب میں بھی رہتا ہے پوشیدہ نظر سے

کیا خاک مِلے اُن کی طبیعت سے طبیعت
مِلتی نہیں جب اُن کی نظر میری نظر سے

پردوں میں بھی عریاں ہی رہا وُہ رُخِ انور
رُو پوش کبھی ہو نہ سکا میری نظر سے

اللہ رے یہ جذبِ جنوں کہتی ہے لیلیٰ
مَیں دیکھتی ہوں قیس! تجھے تیری نظر سے

امرچند قیس

تنقید کے نئے پہلو

حال ہی میں ایک ہندوستانی ناول نگار، کچھ عرصہ انگلستان میں رہنے کے بعد، جب واپس تشریف لائے تو اپنے ملک کی سیاسی اور سماجی حالت کو جب بھی مد نظر رکھ کر دیکھا تو ادبی دنیا کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے مغربی انداز تنقید قبول کئے بغیر کوئی ہندوستانی ادیب درجۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ مغربی زندگی ہمارے ہاں چلتی ہی ہے مد مطلوب ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ اس قسم کی تقلید ایک غلام ذہنیت کا عکس ہے بلکہ اس لئے کہ ادب میں تخلیق اور تنقید کے اس طرز کے پیوند بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ایک ملک کے تخلیقی جوہر پر کسی دوسرے ملک کے طریق تنقید کی پابندی اُس جوہر کو ابھارنے کی بجائے دبا دیتی ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں شاعری میں تنقید اور تخلیق کے صحیح تعلق کو واضح کرنے کے بعد اردو تنقید کے ارتقا پر بحث کی گئی ہے۔ اور آخر میں تنقیدی ذہن کی نئی کروٹوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بہت سے ایسے نام اور کتابیں جن کا آج کل بہت چرچا ہے اور جنہوں نے اردو تنقید کی نشوونما میں قابل قدر حصہ لیا ہے، آپ کو اس مقالے میں نظر نہیں آئیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصود مختلف نقادوں سے انفرادی نقطۂ نظر سے بحث نہیں، بلکہ تنقید میں عمومی تحریکات کا اجاگر کرنا ہے۔

تنقید کا سب سے پرانا اور سب سے محبوب طریقہ منصفانہ انداز تنقید ہے یعنی نقاد ایک منصف کی حیثیت سے تخلیقات کی جانچ پرکھ کرنے کے بعد ان کی خوبیوں یا برائیوں پر اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ ایسے نقاد کے حضور میں ادیب ہمیشہ ملزم کی حیثیت سے پیش ہوتا ہے۔ مصور اپنی تصویر، شاعر اپنی نظم، موسیقار اپنا راگ حاضر کرتا ہے اور نقاد ایک تجربہ کار استاد کی طرح ان پر غور کرتا ہے، کسی کو برا جان کر پھینک دیتا ہے اور کسی کو اچھا سمجھ کر چوم لیتا ہے۔ جس طرح منصف کے سامنے قانون کی کتاب ہوتی ہے۔ اور وہ ہر معاملہ کا قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہے بالکل اسی طرح ہمارے نقاد کے ذہن میں ادبی قوانین کی ایک فہرست موجود ہوتی ہے جسے وہ قطعی معیارِ تنقید سمجھتا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک اردو شاعری پر اسی انداز نظر کے ماتحت تنقید ہوتی رہی، اس صدی کے آغاز سے لیکر آج تک تنقیدی ذہن اس کوشش میں ہے کہ منصفانہ رویّہ کو چھوڑ کر اپنے لئے نئی راہیں تلاش کرے، اسی کوشش اور کشمکش میں اردو تنقید نے اپنے ابتدائی مراحل طے کئے ہیں، اور اب ہم اس قابل ہو رہے ہیں کہ ان منزلوں کا صحیح طور پر جائزہ لے سکیں جنہیں ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

تنقید نے ہمارے ہاں پہلے پہل ادارۂ اصلاح کی صورت اختیار کی، ہر وہ شاعر جو چند ایک اچھی غزلیں لکھ کر نام پیدا کر لیتا، اپنا فرض سمجھتا کہ وہ نوجوان لکھنے والوں کی اصلاح کرے، شعروں کی اصلاح میں استاد کی چابکدستی کا شہرہ دور دور پہنچتا اور لوگ اپنی غزلیں لئے استاد کے قدموں میں آ بیٹھتے، اور مدتوں اس کے علم سے فیضیاب ہوتے۔ فیض رسانی اور فیض یابی کا یہ سلسلہ کچھ ایسے بڑھا کہ ہر شہر میں کوڑیوں استاد اور ہر استاد کے سینکڑوں شاگرد ہونے لگے۔ اس کا ایک اچھا اثر یہ ہوا کہ شعر گوئی اور شعر فہمی کا ذوق دور دور تک پھیل گیا، ان دنوں جب کتابیں نہ چھپ سکتی تھیں، استاد کا کمال شہرت کے لئے شاگردوں کا محتاج تھا، شاگرد جہاں اپنے شعروں کی اصلاح کراتے وہاں استاد کے شعر حفظ بھی کرتے، اور غیروں کے سامنے جھوم جھوم کر پڑھتے۔ یہ ادارہ برا تھا یا اچھا اس سے بحث نہیں، بحث ان اثرات سے ہے جو اس ادارہ کی وجہ سے فن تنقید میں رونما ہوئے۔ اس قسم کی اصلاح کا سب سے اہم اثر یہ ہوا کہ تجربہ اور احساس کی بجائے زبان اور بیان پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ قافیہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ محاورہ درست ہے یا غلط؟ زبان صاف ہے یا الجھی ہوئی؟ یہ وہ سوالات تھے جو بیشتر استادوں کی توجہ کا مرکز

بنے رہتے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ اصلاح کرتے وقت استاد ایک غیر شخصیت کے تجربے کو اس طرح اپنالے کہ بیان بالکل صحیح اور واضح ہو جائے وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے کہ چند لفظوں کی تبدیلی سے بیان زیادہ صاف کر دے، محاورہ کی غلطی کو دور کر دے، یا ترکیب کی نشست بہتر بنا دے ممکن ہے ایسا کرنے سے کبھی کبھی بنیادی اصول ٹکرا جائے لیکن یہ توقع رکھنا کہ استاد اصلاح کے ساتھ ساتھ جذبہ کی شدت میں، یا احساس کی گہرائی میں کوئی قابلِ قدر تبدیلی کر دے، کسی طرح بھی جائز نہیں، آپ مجھے کئی ایک ایسی مثالیں یاد دلائیں گے۔ جہاں استاد نے محض ایک لفظ بدل دینے سے مبتدی کے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جہاں اُس نے اصلاح کے زور سے شعر میں مبتدی ہی کے جذبے کو اس قدر اُبھارا کہ محفل میں ڈونگرا برسنے لگا، لیکن وہ ہزاروں شعر جن کی اصلاح محض لفظی اور فنی ہی رہی آپ انہیں نظر انداز کیونکر کر سکتے ہیں، وہ کمالِ اصلاح جس کی آپ مثالیں دے رہے ہیں، اتفاقات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اور پھر اگر کوئی استاد مبتدی کے خیال کو اپنا کر مناسب لفظوں میں ادا کر دیتا ہے تو اس کا فائدہ استاد ہی کو پہنچتا ہے، مبتدی کو نہیں، اس لئے کہ مبتدی پر خیال کے اپنانے کا داخلی عمل واضح نہیں ہوتا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے یہی آتا ہے کہ اس کے لکھے ہوئے مصرعے میں استاد نے جنبشِ قلم سے نئی جان بھر دی ہے، اور یہ سب تبدیلی محض ایک لفظی غلطی دور کر دینے سے ہوئی ہے۔ بیشتر یوں ہوا کہ مبتدی تجربہ اور احساس سے بے نیاز ہو کر زبان کی صحت اور بیان کی صفائی کے پیچھے پڑ گیا۔ اسی لئے آج ان بزرگ شاگردوں میں سے فقط چند ایک کے نام زندہ ہیں، شعر کہنا ایک مشق بن گیا۔ شاعر کا کمال مشکل زمین میں شعر نکالنے، روزمرہ اور محاورہ کے صحیح استعمال کرنے، اور صحتِ زبان برقرار رکھنے سے جانچا جانے لگا، تنقیدی ذہن کو شعر کی پرکھ کے لئے جو اصول دیئے گئے وہ سب کے سب ہیئت سے متعلق تھے۔ طریقِ اظہار پیچیدہ نہ ہو۔ غیر متعلق باتیں نہ کہی جائیں۔ خیال کی تکرار نہ ہو، بیان غیر مربوط نہ ہو۔ شعر خارج از بحر نہ ہو۔ اور شعر کی تمام خوبیاں سلاست، لطافت، یکسانیت، زورِ بیان اور روانی سے متعلق ہو کر رہ گئیں۔ یہاں اس بات کا اقرار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُستادفن کاروں نے ہیئت اور زبان پر اس قدر زور اس لئے دیا کہ وہ خیال اور جذبہ کو شعر کی اولین اور اہم ترین ضرورت سمجھ کر اُس پر زیادہ بحث نہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پیشِ نظر وہ صورتیں تھیں جہاں جذبہ اور شعری تجربہ تو موجود ہو لیکن اس کے اظہار میں چند مشکلیں آ پڑی ہوں، اُن کے تمام اصول اظہار کی ان مشکلوں کو کم کرنے کے لئے وضع کئے گئے، ان کا سب سے پہلا کلیہ یہ تھا۔ کہ شاعر پہلے روز ہی سے شاعر ہوتا ہے، اس میں احساسات کی گرمی پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے، اگر اُسے زبان کا صحیح استعمال سکھا دیا جائے تو وہ بخوبی اپنے احساسات کو الفاظ میں منتقل کر سکتا ہے، شعر گوئی کا شوق بڑھا تو لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ شعر کی جان فی الاصل صحیح زبان اور رَس دار بیان ہے، شعراء نے تجربہ کو ضروری سمجھ کر اپنے تنقیدی بیانات میں اسے قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا، مشاق مبتدیوں نے اُسے غیر ضروری سمجھ کر پس پشت ڈال دیا۔ اور زبان کی پرورش میں مشغول ہو گئے، پھر اردو شاعری میں وہ دور آیا جب زبان، انجمن گئی، اس دور کے شعر پڑھ جایئے شاید ہی کہیں کوئی گہرا احساس آپ کو نظر آئے، البتہ اردو زبان نے اس دور میں بہت ترقی کی یہ شاعروں کا نہیں زبان دانوں کا دور ہے، تخلیق ہر زمانہ میں جاری رہتی ہے لہٰذا اس زمانہ میں بھی آپ کو ایسے فن کار ضرور ملیں گے جو اپنے وقت کی مخصوص روش کے باوجود اپنا جوہر دکھائے بغیر نہ رہ سکے۔

ادارہ اصلاح نے تجربہ اور احساس کی بجائے زبان اور ہیئت کی اہمیت بڑھائی تو ساتھ ہی منصفانہ اندازِ تنقید کو بھی مسدود کر دیا۔ ہیئت کے متعلق وضع کئے گئے اصول نقاد کے سپرد کئے گئے اور وہ انہیں اصولوں کی روشنی میں

شعروں کی خوبیاں اور برائیاں تلاش کرنے لگا۔ غالب کے بہت بعد تک اردو تنقید میں یہی اصول کارفرما ہے غالب کے متعلق اس کے معاصروں کی تنقید اسی انداز کی آئینہ دار ہے، ہر وہ شعر جو زبان کے مروجہ اصولوں سے ذرہ ہٹ کر کہا گیا ہو مطعون ہوتا، انیسویں صدی کی ابتدا میں میر امّن نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی تجویز پر باغ و بہار سلیس اور سلیس زبان میں لکھی، قدیم طرزِ تحریر کو اس بنیاد پر ترک کرنے کی بنا پر میر امّن مخالفین کے اعتراضات کا شکار ہوئے یہاں تک کہ میر زا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں ان کی زبان اور طرزِ بیان پر حملے کئے رسمی اور رواجی ضوابط کی پابندی کا یہ اثر ہوا کہ اردو میں تنقید کا انداز منفی ہوتا چلا گیا اور یہ دیکھنے کی بجائے کہ شاعر نے جو کچھ بات کہی ہے کیسے کہی ہے یہ دیکھا جانے لگا کہ شعر کا بیان ان اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں جنہیں ہم صحیح سمجھتے ہیں، اور ان سے انحراف کسی حالت میں بھی جائز نہیں، اس حالت میں یہ توقع کیونکر کی جاسکتی ہے کہ نقاد زبان کی ایک ایسی غلطی جو اس کی نگاہ میں کھٹکتی ہے کے باوجود کسی شعر کے بنیادی خیال کی داد دے سکے گا، جس طرح منصف کا اہم فرض شہادت کے بیانات میں سقم تلاش کرنا ہے اسی طرح یہ نقاد شعر میں عیب ڈھونڈتا ہے یوں بھی یہ انداز تنقید چاہتا ہے اس لئے کہ شعر میں عیب مل جائیں تو ان کی طرف اشارہ کرکے ان پر بحث کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر شعر بے عیب ہو تو یہ نقاد سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہے کہ شعر کی سلاست اور روانی قابل داد ہے، کیا بات پیدا کی ہے، وغیرہ وغیرہ، آج ہم یہ دیکھ کر رنجیدہ ہوتے ہیں کہ ہماری تنقید سمجھنے اور شعر سمجھنے کے عمل کو واضح کرنے کی بجائے داد دینے یا محنت گنوانے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، آج کیوں ہر شخص یہ کہنے پر مجبور ہے کہ اردو میں تعمیری تنقید کی ضرورت ہے؛

"دوسرا اہم امر جس کی طرف . . . . نقادوں کو توجہ کرنی چاہئے تعمیری تنقید نگاری ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں اردو کی کتابوں پر تخریبی تنقیدیں لکھنا مضر بلکہ سخت مضرت ہے . . . . اگر مصنف نے کوئی غلطی کی ہو تو اس کا ازالہ اپنی تنقید میں اس طرح کیا جائے کہ نہ مصنف کو برا معلوم ہو اور نہ عوام اس سے بدظن ہونے پائیں" (سلسلہ درج تنقید ۱۹۲۷ء)

ہماری تنقید محض تخریب بن کر رہ گئی اس لئے کہ جو زاویۂ نظر اختیار کیا گیا تھا وہاں سے عیب ہی عیب نظر آسکتے تھے، ایک استاد اور اس کے شاگرد کسی دوسرے استاد کے کلام پر جرأت اس لئے کرتے رہے نیز کیا کرتے کہ عوام کی نظروں میں اس کی وقعت کم ہو جائے۔ اسی تخریبی یا منفی اندازِ نظر کی وجہ سے تنقید ایک گھٹیا قسم کا ادب بن کر رہ گئی۔ تنقید کے تخلیقی پہلو سراسر دبا دیئے گئے۔ اور سالہا سال تک تنقیدی ذہن پر ایک جمود طاری رہا۔

مولانا حالی پہلے آدمی تھے جنہوں نے شعر و شاعری میں ایک فلسفیانہ انداز سے بحث کی مقدمہ شعر و شاعری میں شعر کے ان پہلوؤں کو روشن کیا جو اس سے پہلے اردو تنقید میں ظاہر نہ تھے۔ شعر موزون الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک تجربہ کا اظہار تھا۔ اور اس اظہار کی سب سے بڑی خوبی سلاست اور روانی نہیں۔ بلکہ دلگداز ہونا تھی۔ شاعر کا فرض اپنے تجربہ کا احسن ترین طریق سے پڑھنے والے تک پہنچانا تھا، اور نقاد کا فرض زبان میں عیب نکالنے سے اور ان کی اصلاح کرنے کی بجائے یہ دیکھنا تھا۔ کہ وہ شعری تجربہ مکمل طور پر منتقل ہوتا ہے یا نہیں، گذشتہ پچاس سالوں میں مولانا حالی مرحوم کے بتلائے ہوئے اصولوں ہی کے مطابق ہماری تنقید پروان چڑھی ہے۔ آج ہماری نظر میں ایک اچھے نقاد کی وہی وقعت ہے جو ایک اچھے شاعر کی ہو سکتی ہے، اس لئے کہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں تخلیق کرتے ہیں، شاعر ایک تجربہ پڑھنے والے تک پہنچاتا ہے نقاد اس عمل کا تجزیہ کرتا ہے، نقاد کا کام تخلیقی کارناموں کی وضاحت اور ذوق کی تصحیح ہے، وہ دور اور

نزدیک کی چیزوں کے عکس لے کر انہیں ملاتا ہے اور پھر ان سے اہم نتائج اخذ کرتا ہے، اس سلسلے میں نئے نقاد نے شعر کی پرکھ کا ایک بالکل نیا معیار پیش کیا، جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اردو میں شعر کی پرکھ کا یہی طریقہ تھا۔ کہ اگر شعر کا مطلب واضح اور زبان صاف ہے تو شعر اچھا ہے، جب زبان منجھ گئی تو زیادہ زور معانی پر دیا جانے لگا۔ شعروں کی شرحیں لکھی جاتیں اور یہ ظاہر کیا جاتا کہ ایک ایک شعر میں کئی کئی مضمون قید کئے گئے ہیں۔ معانی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی اور اس طرح شاعر کے کلام میں معانی کی وسعت کا اندازہ کیا جاتا۔ آج کا نقاد معانی اور زبان سے زیادہ "کیفیت" پر زور دیتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ شعر میں جو بات کہی گئی ہے وہ بالکل اس طرح واضح ہو جیسے سائنس یا جغرافیہ کا کوئی اصول، شعر میں خیال، جذبے اور احساس سے گھل مل کر ایک انوکھی شکل اختیار کر لیتا ہے جسے واضح طور پر بیان کرنا ناممکن ہے، شعر کا اثر اس ظاہرہ مطلب میں نہیں جو آپ چند ایک جملوں میں بیان کر سکتے ہیں، اور نہ ہی ان الفاظ میں ہے جنہیں ایک خاص بحر کی قید میں جمع کر دیا گیا ہے بلکہ اس کیفیت میں ہے جو ان الفاظ کے پڑھنے کے بعد آپ کے دل پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کے کئی پہلو ایسے ہوتے ہیں جنہیں آپ سمجھ تو نہیں سکتے لیکن محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ غالب کا یہ شعر ؎

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی   کیوں ترا راہگذر یاد آیا

آپ نے کئی دفعہ سنا ہوگا، واضح طور پر اس کا کیا مطلب ہے، میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس شعر کے پڑھنے سے جو انوکھی یاس آمیز کیفیت دل پر طاری ہو جاتی ہے۔ اُسے میں نے بارہا محسوس کیا ہے، آج کا نقاد نہ منصف ہے نہ شارح بلکہ ایک حساس قاری ہے جو اس گہری کیفیت کا تجزیہ کرتا ہے جو شعر پڑھنے سے اس پر طاری ہو جاتی ہے، شاعر تجربہ کی تخلیق کرتا ہے نقاد اس تخلیق کا تجزیہ کرنے کے بعد اصل تجربہ کی تہہ تک پہنچتا ہے اور اپنے انداز میں شاعر کا عمل دہراتا ہے، شاعر تجربہ سے تخلیق تک پہنچتا ہے اور نقاد تخلیق سے تجربہ تک، یہ سب کچھ محض ذوقی یا وجدانی نہیں۔ بلکہ نقاد کو اس تجزیاتی عمل کے لئے پورے طور پر تیار ہونا پڑتا ہے وہ اپنے ملک کی ادبی اور سماجی روایات سے کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہے اور پھر ان کی روشنی میں کسی تخلیق کا جائزہ لیتا ہے، موازنہ اور تجزیہ نقاد کے دو اہم ہتھیار ہیں، موازنہ کے لئے اُسے تاریخی پس منظر درکار ہے اور تجزیہ کے لئے اُسے ایک کشادہ ذہن کی ضرورت ہے تاکہ ایک ادبی تخلیق اس پر اپنا پورا اثر کر سکے، ایک وقت تھا کہ غالب کا یہ شعر پڑھ کر "تو اور آرائش خم کاکل، میں اور اندیشہ ہائے دور دراز" نقاد صرف یہی سوچتا تھا کہ "آرائش خم کاکل" کی ترکیب صحیح ہے یا نہیں، اس کے بعد شعر میں کا دوسرا پہلو یہ بتایا گیا کہ "اندیشہ ہائے دور دراز" میں کیا کیا باتیں پوشیدہ ہیں، محبوب بن سنور کر نکلے گا کئی اس کی نگاہ کے شکار ہوں گے، اور شاعر کو ٹھہر ٹھہر کے لڑائی لینا پڑے گی، اور پھر آج کے نقاد نے یہ کہا کہ شاعر محبوب کے بالوں کی لہروں میں کھو کر نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ بالوں کی لہروں اور خیال کی لہروں کو ملا کر شاعر نے جو کیفیت پیدا کرنا چاہی نقاد نے وہ پوری طرح سے محسوس کی اور تجربہ سے لطف اندوز ہونے کے بعد اس نے اس کیفیت کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کیا، نئے ادیبوں میں سے میراجی نے نظموں کا اس انداز نظر کے مطابق جائزہ لیا ہے، حال ہی میں ان کی کتاب "اس نظم میں" شائع ہوئی ہے جس میں آپ نے آج کل کے شعرا کی بہت سی نظموں پر جائزے لکھے ہیں ان جائزوں کو تاریخ تنقید میں ایک اہم حیثیت حاصل ہے، پہلی بار نقاد نے اپنی ذات کو دبا کر یہ کوشش کی ہے کہ جب نظم اپنا پورا اثر کر چکے تو اس کا صحیح طور پر تجزیہ کیا جائے، ان جائزوں میں مجھے ایک خامی نظر آئی، جنس (Sex) نقاد کا مرکزی نقطۂ نظر ہے۔ اور وہ ہٹ ہٹ کر اسی مقام سے نظم پر غور کرتا ہے نئے نقادوں کا کیفیاتی گروہ بہت حد تک مغرب کے طرز تنقید سے متاثر ہے۔ اور یہ چاہتا ہے کہ نقاد اپنے آپ میں ایک علیحدگی پیدا کرے تاکہ وہ ادبی تخلیقات کا ایک ایسی سطح سے مطالعہ کر سکے جو تخلیق کی سطح کے متوازی ہو۔ اس گروہ کے متعلق اور کچھ کہنے سے پہلے

نیاز فتحپوری اور فراق گورکھپوری کا ذکر ضروری ہے۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے تنقید پر منصفانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے اردو نقد و نظر میں ایک بہتر معیار پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے مغرب کے طریق تنقید کو اپنے یہاں خالص مشرقی رنگ میں اردو فن تنقید کی ترویج کرنا چاہی ہے۔ اس گروہ نے تنقیدی مقالات کو ادبی رسائل کا ایک ضروری جزو بنا دیا، اور اس طرح تنقید شعر اور افسانہ کے پہلو بہ پہلو ترقی کرنے لگی۔ نیاز فتحپوری ایک سرگرم نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں، اپنے بیانات کے ثبوت میں وہ اسناد اور ادبی مآخذ کی کتابوں سے اقتباسات اس کثرت سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ چاہتا ہو تو وہ اپنے ذوق سے کیا کام لے سکے گا؟ فراق گورکھپوری نے خالص مشرقی رنگ میں، مدد علم پر مشتمل ہے۔ لیکن ان کی تنقید میں وہ علیحدگی (DETACHMENT) نہیں جو کیفیاتی نقاد کے خیال میں اچھی تنقید کا خاصہ ہے۔ ان کی طبیعت کا جھکاؤ شعر میں لکھنؤ اسکول کی طرف ہے اور اسی لئے ان کی پسند محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ فراق کے ذہن میں چمک ہے۔ لیکن وسعتِ نظر کی کمی کی وجہ سے ان کی تنقید میں ایک گھٹاؤ سا پیدا ہو گیا ہے۔ بعض دفعہ ادبی تعصبات (Literary Prejudices) انہیں ایسے بیان دینے پر مجبور کر دیتے ہیں جنہیں سنبھالنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ چند ایک تحقیقی مقالے جو فراق نے لکھے ہیں انہیں تعصبات کا شکار ہوئے۔ اس گروہ میں ایک اور نام قابل ذکر ہے عبدالقادر سروری جنہوں نے ایک عام پڑھنے والے (LAYMAN) کے نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے، دوسروں کی اندازِ سے بے نیاز ہو کر انہوں نے چاہا ہے کہ ایک عام قاری کے خصوصیت کو پیش کر دیں۔ رام بابو کی تاریخ ادب اردو بھی اسی گروہ کی تنقیدات میں شامل ہے، اور اس میں بھی وہی خامیاں ہیں جو نیاز، فراق اور دیگر نقادوں کی تنقید میں نظر آتی ہیں، یعنی سطحیت، تعصب اور سرسری پن۔

دیباچہ نگاری، سر عبدالقادر، جلسوں کی صدارت، مولوی عبدالحق یہ چاروں ایک ساتھ ذہن میں آتے ہیں۔ سر عبدالقادر کا مخزن سے تعلق اور مخزن کا اردو ادب کی نشو و نما میں حصہ محتاجِ بیان نہیں، مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کے ذریعے اردو میں تحقیقی تنقید کو صحیح راستوں پر چلایا ہے۔ فن تنقید کا سب سے ضروری مقصد کسی زبان کے سرمائے کو زندہ رکھنا ہے۔ تحقیقی تنقید کی مدد سے گذشتہ صدیوں کے ادبی کارناموں کو محفوظ کیا جاتا ہے اور پھر نئی اقدار کی روشنی میں پرکھا جاتا ہے۔ اس تمام ترقی کے باوجود بعض ادبی مرکز (خصوصاً آگرہ) اب بھی پرانی ڈگر کے قائل ہیں۔ اور منصفی کی کرسی جو محض اعزازی ہو کر رہ گئی ہے دستبردار ہونا پسند نہیں کرتے، آج بھی ایسی کتابیں چھپتی ہیں جن میں ایک استاد اپنے شاگردوں کے نام گنوا کر اور ان کی تصویریں چھاپ کر ادبی دنیا کو سرفراز کرنا چاہتا ہے۔ استادی شاگردی کا یہ ادارہ اب بالکل ختم ہو چکا ہے۔ جیسا کہ اس ادارہ کی ایک کتاب کے اس آمیز عنوان سے ظاہر ہے "میرے شاگرد"۔

کیفیاتی نقاد جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں تاریخی لحاظ سے اس خالصتاً مشرقی گروہ کے بعد آتا ہے۔ اس نقاد کا تمام تر تعلق نئی شاعری سے ہے۔ ابہام کے اعتراض کے جواب میں اس نقاد نے اپنا کیفیاتی نظریہ پیش کیا، اور اس طرح نئی نظموں کے قبول کئے جانے کے لئے ایک مناسب ماحول تعمیر کیا۔ روایات میں الجھے ہوئے ذہن کو اس نقاد نے وقت کے نئے تقاضوں اور نئی ضرورتوں سے آشنا کیا۔ آج سے دس سال پہلے یہ نقاد اُن فرسودہ روایتوں کو جو ہمارے ادب سے چمٹی ہوئی تھیں جھنجھوڑ کر پھینک دینے پر تلا ہوا تھا۔ آج جب وہ روایات کے غیر ضروری اور مردہ اجزا ختم ہونے میں کسی قدر کامیاب ہو چکا ہے تو اب وہ نئی روایات کے صحیح اجزا کو زندہ کرنے اور محفوظ رکھنے میں مصروف ہے۔ اسی تنقید کی بدولت نئے لکھنے والے اور نئے پڑھنے والے اب اس بات پر متفق ہیں کہ صحت مند لازوال ہوگا جو پرانی روایات کو اپنے ماحول کے مطابق ڈھالنے سے پیدا ہوگا اور وہ ادب جو روایات سے قطعی طور پر منحرف

ہو محض وقتی اور ہنگامی ثابت ہوگا۔

اردو تنقید کے دو نئے پہلو جو غالباً مغربی ہیں اب ہمارے ہاں رواج پاتے جا رہے ہیں۔ نفسیاتی اور اشتراکی انداز تنقید، نئی نفسیات اور اشتراکیت کے ادبی اصولوں کے زیر اثر ہمارے نقاد ادبی کارناموں کو ایک نئی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں، نفسیاتی نقادوں میں میراجی - وجیہہ الدین احمد، ریاض احمد اور رفیع الزمان کے نام قابل ذکر ہیں، نفسیاتی نقاد ایک ادبی تخلیق میں استعمال کی گئی مختلف علامتوں کو ان کے ماحول کی روشنی میں سمجھنے کے بعد مصنف کی ذہنی شخصیت کا پتہ چلاتا ہے بنیادی طور پر یہ انداز تنقید داخلی اور تشخیصی ہے۔ جس کے استعمال کے لئے نقاد کو نفسیات اور ادب دونوں سے کما حقہٗ واقفیت حاصل کرنا پڑتی ہے، ورنہ وہ علامتوں سے موزوں نتائج اخذ نہیں کر پائے گا۔ کسی علامت سے کسی خاص نتیجہ کو محض اس لئے اخذ کر لینا کہ ایک ماہر نفسیات نے یہی کہا ہے، مناسب طریق تنقید نہیں۔ اب تک جو نفسیاتی مقالے ہمارے ہاں لکھے گئے ہیں ان میں یہی نقص ہے، ایک علامت کو موڑ توڑ کر اپنے نظریوں کے مطابق بنا لینا صحیح تجزیہ کے اصولوں کے خلاف ہے۔

اشتراکی اصول گو ہمارے ہاں بہت زیادہ مقبول نہیں ہو سکے تاہم سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، احتشام حسین اور ظہیر کاشمیری نے ادب کے کئی ایک پہلوؤں پر انہیں اصولوں کے مطابق بحث کی ہے۔ اشتراکی اصول ادب کو سماج کا غلام بنانا چاہتے ہیں۔

ان اصولوں کے مطابق ادب وہی ہے جو سماج کی فلاح کے لئے ہو - کیفیاتی نقادوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک گہرا تجربہ خواہ وہ کسی سماجی مسئلے سے متعلق ہو یا نہ ہو شعر کا موضوع بن سکتا ہے۔ اس لئے شاعر پر یہ قید نہیں لگائی جا سکتی کہ وہ صرف وہی موضوعات چنے جو اشتراکیت کے ادبی اصولوں کے مطابق ہوں۔

گذشتہ چھ برس میں تخلیق کا ایک بحرانی دور اردو ادب پر چھایا رہا ہے، اب تخلیق سنبھل رہی ہے۔ اور اُن منازل کا جو وہ طے کر چکی ہے۔ جائزہ لینا چاہتی ہے۔ تنقید کی زندگی کا ایک کڑا اور اہم دور آ رہا ہے۔ جب اُسے کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کے بعد صرف ان چیزوں کو قبول کرنا ہوگا۔ جو صحیح طور پر روایات اور ماحول کی پیداوار ہیں۔

(حلقۂ ارباب ذوق میں پڑھا گیا)

الطاف گوہر

ایک احساس

ڈھک گئے برف سے ہر پست و بلند   کھل گئے پھول کنول کے ہر سُو
چاندنی رہ گئی جم کر ہر سمت   کر لیا نُور سے پیڑوں نے وضو
اُٹ گئی دہر کی چاندی سے لٹیں   اب کہاں کا نے جہاں کے گیسو

یہ گھٹائیں ہیں کہ رقصاں ہے دُھواں   اُف یہ تاریکی تجلی افگن
کہُر کے پردے سے چھنتا ہُوا نُور   جیسے دوشیزہ کے آگے چلمن
سنگِ مرمر کا بُرادہ لے کر   حورِ فطرت نے بھرا ہے دامن

یہ ہر اک شاخ پہ تاروں کی پھوار   اور یہ ٹہنیاں بوجھل بوجھل
چشمِ گرداں سے یہ لرزاں لرزاں   رس کے بہتا ہُوا اُجلا کاجل
چار سُو ایک ردائے سیمیں   جیسے گنگا سے ہو عالم جل تھل

نُور ہی نُور ہے کہساروں پر   آج کام آ ہی گیا ذوقِ نظر
کوئی نینا کہ نشیبوں میں تمام   بیٹھتی جاتی ہے وہ گردِ قمر
کاش ایسے میں پکارے کوئی   مجھے افلاک سے "اختر اختر"

اختر ہوشیاری

پامسٹ

اَب تو خیر میں نے اپنا کاروبار بہت بڑھا لیا ہے۔ اور ہر طرح سے مطمئن ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب میں نے کوئی کام شروع نہیں کیا تھا۔ یونہی آوارہ گھوما کرتا تھا۔ میں بیکار تھا لیکن میرا دماغ بیکار نہیں تھا۔ دن رات ایک ہی فکر تھی۔

دسویں جماعت پاس کی تھی۔ ایف اے میں داخل ہوا۔ بڑی شاہانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ میرے اخراجات اِس قدر زیادہ تھے کہ پتا جی نے مجھے خرچ کی بجائے یہ رائے دی کہ مجھے کوئی کام کرنا چاہیئے۔

جہاں تک نوکری کا معاملہ تھا۔ دسویں پاس کو تیس پینتیس روپے سے زیادہ کی ملازمت مل ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن پتا جی کا اصرار تھا کہ جیسی نوکری ملے کر لوں۔ انہیں بڑی مشکل سے میں نے یہ بات سمجھائی کہ اس قسم کی نوکریوں میں کچھ نہیں دھرا۔ بجائے نوکری کے کوئی کاروبار شروع کیا جائے۔ وہ دیہاتی اور اَن پڑھ شخص تھے۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں اس بات پر رضامند کر لیا۔

اَب سوال یہ تھا۔ کہ کاروبار کیا جانے تو کس قسم کا۔

جنگ دو اڑھائی برس سے زور شور سے جاری تھی۔ تجارت پیشہ لوگوں نے خوب ہاتھ رنگے تھے۔ ہمارے پاس زیادہ سرمایہ تو تھا نہیں۔ یہی طے پایا کہ امرت سر میں کوئی دکان ڈھونڈ کر خالص گھی کا کاروبار شروع کیا جائے۔

ہمارا خاندان گاؤں ہی میں رہتا تھا۔ پتا جی کا اردگرد کافی رسوخ تھا۔ گھی آسانی سے فراہم ہو سکتا تھا۔ ایک ہاتھ دے اور دوسرے ہاتھ لے والا معاملہ تھا۔ کوئی دقت پیش نہ آسکتی تھی اور پھر گھی کے "خلوص" کے بارے میں آجکل جو سینے کہاں تک کام آسکتے ہیں؟ چنانچہ میں فوراً امرت سر چلا گیا۔

جنگ کے زمانہ میں اگر ایک طرف گھی نہیں ملتا تھا۔ تو دوسری طرف دوکانیں بھی نایاب تھیں۔ ویسے تو شہر میں جس طرف نظر دوڑاؤ دوکانیں ہی دوکانیں تھیں۔ پہلے بڑے بازار میں کوشش کی گئی۔ پھر چھوٹے چھوٹے بازاروں میں تلاش کی گئی۔ لیکن دوکان نہ ملی پر نہ ملی۔

اِس طرح امرتسر میں چار پانچ روز آوارگی میں گذر گئے۔ پتا جی تھوڑے سے روپے بھیج دیتے تھے۔ جو میرے لئے ناکافی تھے۔ واپس گاؤں کو جانے سے دل گھبراتا تھا۔ پتا جی کے خط پہ خط چلے آتے تھے۔ کہ اگر دوکان نہیں ملتی۔ تو واپس چلے آؤ۔ میں یہی جواب دیتا کہ لڑائی کی وجہ سے دوکانوں کی قلت ہے۔ لیکن میرا موقع پر رہنا بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی دکان مل رہی ہو اور میری غیر موجودگی میں ہاتھ سے نکل جائے۔

ایک روز شام کے وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ کہ ڈاکیہ خط لایا۔ خط پتا جی کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا۔

"......... میں فیروز کوٹ میں ایک بیاہ کے سلسلہ میں گیا تھا۔ وہاں میرے پرانے دوست سردار اندر جیت سنگھ مل گئے۔ اتفاق کی بات کہ تمہارا ذکر بھی ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ امرتسر کے بھنڈی بازار میں ان کے سالے کی اپنی دوکانیں ہیں۔ وہ ضرور اپنی دوکانوں میں سے کوئی دوکان دے دیگا۔ برخوردار! تم اس کو ملو۔ اس کا نام سردار جگیندر سنگھ گھڑی ساز ہے۔ اس سے مل کر دوکان

کیسے کہو' امید ہے کہ تمہارا کام بن جائیگا۔ ادھر سردار اندرجیت سنگھ نے بھی ان کو ایک چٹھی لکھ دی ہے۔ بار بار تاکید ہے سستی نہ کرنا۔ میرا خط ملتے ہی ان سے ملو . . . .

اس کے بعد اسی طریقے کے مطابق بار بار تاکید . . . . اس خط کو تار سمجھنا وغیرہ لکھا ہوا تھا۔

میں ذرا دیر سے اٹھنے کا عادی ہوں لیکن اس دن میں صبح آٹھ ہی بجے اٹھ بیٹھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے سرد ہوا کا موسم تھا۔ بستر سے نکلنے کو دل تو نہ چاہتا تھا لیکن مجبوراً اٹھ کر کپڑے پہنے۔ احتیاطاً اپنا چسٹر بھی جو پچھلے دنوں کی یادگار تھا۔ پہن لیا۔ ہاتھوں پر دستانے چڑھائے۔ دھوپ کا چشمہ لگایا۔ اور صندی بازار کا پتہ پوچھتا ہوا چل دیا۔

خالو صاحب نے لکھا تھا کہ وہ گھڑیوں کی دکان کرتے ہیں۔ میں جگندر سنگھ گھڑی ساز کے بورڈ کا دل میں خیال رکھتے ہوئے صندی بازار میں سے گزرنے لگا۔ جب بازار ختم ہوگیا۔ تو بڑا تعجب ہوا کہ آخر جگندر سنگھ گھڑی ساز کہاں غائب ہوگئے چنانچہ الٹے پاؤں آنا پڑا۔ اب کے پہلے سے بھی زیادہ غور کے ساتھ نیچے اوپر دیکھتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ معاً اوپر کی منزل پر ایک چھوٹے سے بورڈ پر نظر پڑی۔

سردار جگندر سنگھ گھڑی ساز (سند یافتہ)

اب میں اوپر جانے کا رستہ ڈھونڈنے لگا۔ یہ بھی ایک معمہ ہی ثابت ہوا۔ بازار میں ایک تنور تھا۔ کونے پر سائن بورڈ لکھنے والے کی ایک دکان تھی۔ ارد گرد گھوم کر دیکھا۔ دوکانداروں سے دریافت کیا تب کہیں معلوم ہوا کہ حضرت نے سیڑھیاں کسی نائی کو کرایہ پر دے رکھی ہیں۔

میں اس نائی کی آنکھ بچا کر سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ جب سیڑھیاں بائیں ہاتھ کو گھومیں تو دیکھا کہ سامنے ایک دروازہ ہے۔ جس پر قفل پڑا ہوا ہے۔ دروازے کے اوپر ایک چھوٹا سا سائن بورڈ ٹنگا ہے جس پر لکھا تھا:-

Palmistic Researches.

گویا اس کمرے میں ہاتھ کی ریکھاؤں کی ریسرچ کی جاتی تھی۔ میں گھبرا کر نیچے اترنے لگا۔ تو اس کے قریب ہی ایک دوسرا دروازہ دکھائی دیا۔ ذرا گردن بڑھائی تو دیکھا کہ یہ دوسرا دروازہ ایک کمرے کی طرف کھلتا تھا۔ چنانچہ قدم ناپتا ہوا آگے بڑھا۔

یہ ایک نیچی چھت والا تقریباً پندرہ فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا کمرہ تھا۔ پرلے کونے میں داہنی طرف ایک میز اور اس کے اوپر شیشے کا بنا ہوا ایک کیس نظر آ رہا تھا۔ میز کے پیچھے سے دو ٹانگیں ایک دوسری کے اوپر ٹکی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ میز کے قریب ہی بانہوں والی دو کرسیاں بچھی تھیں۔ بس اس کے علاوہ کمرہ بالکل خالی تھا۔

میں نے سگریٹ پھینک کر پاؤں سے مسل دیا۔ اور رومال سے منہ پونچھتا ہوا آگے بڑھا۔

سب سے پہلے تو میری متجسس نظریں اس شخص پر پڑیں۔ جو میز کے پیچھے دبکا بیٹھا تھا۔ وہ سکھ تھا۔ اس نے پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اور اس کی داڑھی پر ایک پٹی سی بندھی تھی۔ جسے ٹھاٹھا کہتے ہیں۔ سردار صاحب کا ڈیل ڈول تو ویسا ہی تھا۔ جیسا ہونا چاہیئے لیکن صورت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ٹھاٹھے سے ان کا آدھے سے زیادہ چہرہ ڈھنپا ہوا تھا۔ البتہ مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح سیدھی اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ ٹھاٹھے کی وجہ سے گال سمٹ کر ابھر آئے تھے۔ اور آنکھیں اندر کو گھس گئی تھیں۔

کچھ عرصہ میں ان کی صورت کا جائزہ لیتا رہا۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ میں نے اطلاعاً مصنوعی کھانسی

کی آواز نکالی۔

ان کے ٹھاٹھے میں سے مبہم سی آواز آئی:۔

"کیا بات ہے"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا "ست سری اکال!"

"سس سری کال" انہوں نے جواب دیا "کرسی پر بیٹھ جائیے"

اگر وہ صرف بیٹھ جائیے کہہ دیتے تو بھی میں کرسی ہی پر بیٹھتا۔ خیر!

"کہیئے"

میں نے ذرا اہتمام کے ساتھ گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا "مجھے اپنے پتاجی کی ایک چٹھی موصول ہوئی تھی۔ کل شام انہوں نے ہدایت کی تھی۔ کہ میں جناب سے ملوں۔ شاید پچھلے دنوں آپ کو بھی اپنے .... سردار اندرجیت سنگھ سے کوئی چٹھی موصول ہوئی ہو۔ میں اسی کام سے حاضر ہوا تھا"

سردار صاحب نے ناک میں بولتے ہوئے کہا "جی ہاں! مجھے بھی چٹھی ملی تھی۔ میں خود آپ کے کام کی بابت غور کر رہا تھا"

ناک میں بولنے کا باعث ان کا گنگناپن نہیں تھا۔ بلکہ وہ اُسے محض ایک امیرانہ ادا سمجھتے تھے۔

"جی۔ اگر آپ نے غور کر لیا ہو۔ تو فرمایئے۔ میرے لئے کوئی اُمید ہے ...."

"اوہم .... دیکھیئے بابوجی میں ذرا صاف گو آدمی ہوں ......"

مجھے معلوم ہوگیا۔ کہ دکان نہیں ملے گی۔

"......... آپ سمجھے نا! میں لگی لپٹی باتیں پسند نہیں کرتا۔ آپ سمجھ گئے؟"

"جی" میں نے جواب دیا۔ "یہاں تک تو سمجھ گیا ہوں"

"سو اب آپ خود غور کیجئے۔ آجکل جنگ کا زمانہ ہے۔ دکانیں ملتی نہیں۔ جو دوکانیں تھیں وہ لگی ہوئی ہیں۔ میری دوکانوں میں سے ایک بھی خالی نہیں ہے ...."

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ ان دوکانداروں کو اپنی دوکانوں سے نکال نہیں سکتے۔ اس لئے آپ اس معاملہ میں میری مدد کرنے سے معذور ہیں ......"

"جی نہیں میں جسے چاہوں اپنی دوکان سے نکال باہر کردوں۔ واہ یہ کیا بات کہدی آپ نے ....."

میں گھبرایا "جی نہیں۔ میرا مطلب تھا۔ کہ سرکاری قانون ہی ایسا ہے۔ کہ کسی کو دوکان سے باہر نہیں نکالا جاسکتا ...."

اس پر انہوں نے گرم ہو کر کہا "میں کوئی قانون وانون نہیں جانتا۔ میں جس دوکاندار کو دل چاہے۔ شام سے پہلے پہلے نکال دوں۔ میں کیا نکالوں گا۔ وہ خود ہی بھاگ جائے گا۔

میں ذرا اور قسم کا آدمی ہوں ...."

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ آدمی تو خیر آپ دکھائی دے ہی رہے ہیں۔ البتہ "قسم" ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔ دراصل مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں سردار صاحب نے میرے چہرے پر کونسی پوشیدہ تحریر پڑھ لی۔ بڑی نرمی سے بولے "دیکھئے نا بابوجی! فرض کیجئے آپ ہی نے میری دوکان کرایہ پہ لے رکھی ہو۔ اگر آپ مجھے وقت پر کرایہ دے دیا کریں۔ اور مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ تو پھر میں آپ کو کیسے

نکال سکتا ہوں۔ آپ خود ہی غور کیجئے"

ان کی یہ سلیس گفتگو سن کر میرے دل کی رنجش دور ہو گئی۔ میں نے سوچا درحقیقت سردار صاحب بہت شریف آدمی ہیں انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "آپ سمجھ گئے نا! میری دکانوں میں سے ابھی کوئی دکان ملنے کی اُمید ہی نہیں ہو سکتی۔ مگر اس معاملہ میں بہت مجبور ہوں۔ بہتر ہے میں اور کوئی دوکان ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں۔ آجکل دوکان کا ملنا ناممکنات میں سے ہے۔ لیکن میں انتہائی کوشش کروں گا"

اس کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ اب گفتگو تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے یہاں سے چل دینا چاہیئے۔ لیکن مجھے ایک بات یاد آگئی۔ میں نے کہا "سردار صاحب! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں آپ سے ایک بات دریافت کروں"

"شوق سے" ان کے نعا مچھے میں پوشیدہ منہ سے آواز آئی۔

"یہ بیر صبوں کے سامنے آپ نے پامسٹک ریسرچز Palmistic Researches. کا بورڈ لگا رکھا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے۔ میرا مطلب ہے۔ یہاں کوئی صاحب اس فن میں ریسرچ کیا کرتے ہیں"

انہوں نے میرا یہ سوال سنا تو ایسی نظر سے کہ یہ بازی کونے کیطرح پھول گئے۔ اسی وقت گھڑیوں کا کام بند کر دیا اور کرسی گھما کر رُخ میری طرف کر لیا۔ اور تمام تر توجہ میری طرف مبذول کرتے ہوئے فرمایا "میں پامسٹری میں آج کل ریسرچ کر رہا ہوں ....."

انہوں نے مجھے اور زیادہ مرعوب کرنے کے لئے نعا مچھا اتار کر علیحدہ رکھ دیا۔

میں نے مرعوب ہو کر کہا "آپ ...... آپ ریسرچ کر رہے ہیں؟"

"بندہ پرور"

میں اپنے تئیں کسی جذبے کے ماتحت کچھ بول ہی نہ سکا۔

انہوں نے ہاتھ سے داڑھی سنوارتے ہوئے کہا "اس فن میں میری معلومات بہت وسیع ہیں ...... اب میں نے اعلے پیمانے پر ریسرچ کا کام شروع کر دیا ہے۔ مختصر الفاظ میں آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں ریسرچ سکالر ہوں"

میں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔

کہنے لگے "مجھے لڑکپن ہی سے اس بات کا شوق تھا۔ میں نے ادھر اُدھر کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ لیکن اس وقت میرا علم بالکل ادھورا تھا۔ ایک مرتبہ میرا ایک دوست کہیں سے چیرو (صحیح تلفظ کیرو ہے) کی کتاب لے آیا۔ میں نے اسے پڑھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ تب مجھے پتہ چلا کہ اب تک میں اندھیرے میں ہی ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ دل کو افسوس بھی ہوا کہ اب تک ساری محنت بیکار ثابت ہوئی لیکن خوشی بھی ہوئی کہ آخر صحیح رستہ نظر آ ہی گیا ...... میں کیا عرض کروں میں اس فن کا شیدائی ہوں، دیوانہ ہوں۔ اس کا مجھ پر خبط سوار ہے ....

اور دیکھئے۔ یہی انگریزوں اور ہم ہندوستانیوں میں فرق ہے۔ انگریز جو کام کریں گے۔ ساری قوت اس پر صرف کر دیں گے۔ لیکن ہم لوگ کوئی کام جان توڑ کر نہیں کرتے۔ اسی لئے وہ لوگ ہم پر حکومت کر رہے ہیں ...."

میں نے کہا "سردار صاحب! آپ تو چھپے رستم نکلے۔ کوئی شخص آپ کی ظاہری صورت سے اس بات کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔ کہ آپ اسقدر "گُنی گیانی" ہونگے۔

"بندہ پرور .... دیکھئے جب میں نے دسویں پاس کر لی۔ تو گھڑیوں کا یہ کام شروع کر دیا۔ دا گجووہ کا دیا

سب کچھ ہے۔ گھڑیوں کا کام تو وقت گذارنے کا حیلہ ہے۔ گھڑیوں کا کام تو وقت گذارنے کا حیلہ ہے۔ اور میری اصلی دلچسپی پامسٹری ہی میں ہے .... آپ میری اس بات کو یاد رکھیئے کہ اس دنیا میں انسان کے اندر کوئی ایسا گن ضرور ہونا چاہیئے جس سے وہ لوگوں کو اپنے پیچھے لگا سکے۔ آپ سمجھے نا؟ دراصل ہمیں سب انسانوں کی خدمت کرنی چاہیئے۔ اسی میں ساری دنیا کا بھلا ہے۔ اگر ہر آدمی دوسرے کی خدمت پر کمر باندھ لے تو بس بیڑا پار ہے۔ بابو جی! آخر یہ دنیا کیا ہے۔ یہاں کی ہر چیز آنی جانی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ لوگ ایک دوسرے پر اسقدر ظلم کیوں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے نفرت کیوں کرتے ہیں .... میں صاف گو شخص ہوں .... معاف کیجئیے گا. بابو جی: میں لگی لپٹی باتیں کرنا جانتا ہی نہیں۔ میں ایک سیدھا سادا شخص ہوں۔ مجھے ادھر ادھر کی چالاکیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ گورو صاحب نے فرمایا ہے۔

" باہروں دھوتی تو نبڑی

............؟

باہروں دھوتی تو نبڑی "

انہوں نے اپنی پیشانی دباتے ہوئے کہا

" خیر اس وقت مجھے یہ شلوک یاد نہیں آ رہا۔ اس کا مطلب یہی ہے۔ کہ اگر کوئی چیز باہر سے دھلی ہوئی اور اندر سے گندی ہو تو پھر باہر کی صفائی کا فائدہ ہی کیا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ " سردار صاحب سچ مانئے مجھے آپ کے درشن کر کے بہت ہی خوشی ہوئی ہے۔ جیسے خیالات آپ کے ہیں۔ اگر سب لوگ اسی طرح سوچنے لگیں تو پھر دنیا میں یہ دکھ یہ تکلیف اور پریشانی باقی نہ رہے۔"

"جی ہاں تو اس قسم کے خیالات تھے جن کی وجہ سے میں نے پامسٹری میں دلچسپی لینی شروع کی۔ لیکن میں نے یہ کام بڑی توجہ اور لگن کے ساتھ کیا۔ اور پھر واہگورو اکال پرکھ کی کرپا سے اب میں اس فن میں استاد سمجھا جاتا ہوں۔ آپ اسے بڑا بول نہ سمجھیں کہ ہندوستان بھر میں شاید ہی کوئی پامسٹ ہوگا۔ جو میرے پاس مجھے ملنے کیلئے نہ آیا ہو۔ کئی لوگ تو اس راستے سے گذرتے ہیں تو صرف مجھے ملنے کیلئے امرتسر میں کچھ روز ضرور ٹھہرتے ہیں۔ اور بعض لوگ تو مدراس سے صرف مجھ ہی سے ملنے کیلئے پنجاب آتے ہیں۔"

ان کی یہ باتیں سن کر مجھے خیال آیا کہ میں بھی انہیں ہاتھ دکھا ہی دوں۔ پھر سوچا نہ معلوم ان کی بہت لمبی چوڑی فیس ہو۔ میں دے بھی نہ سکوں۔ اس لئے میں خاموش رہا۔

" بابو جی! دنیا میں قدردانوں کی کچھ کمی نہیں۔ صرف انسان میں کوئی گن ہونا چاہیئے۔ اب اپنی قدردانی کا حال اگر آپ کو بتاؤں تو شاید آپ یقین ہی نہ کریں۔ لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ کہ پراچین بھارت میں ہمارے گورو، رشی منی وغیرہ لوگوں پر اس قدر اثر قائم کیسے کر لیتے تھے؟ کیوں ساری دنیا انہی کے نام کی مالا جپتی تھی۔ اس لئے کہ ان میں کچھ گن ہوتے تھے .... دیکھئے نا! اس دنیا میں لوگ آپ کی بات پر اس وقت تک پوری توجہ نہیں دیں گے جب تک کہ آپ انہیں کوئی چمتکار نہ دکھائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ گورو صاحب نے چمتکار یا معجزہ دکھانا کبھی درست نہیں سمجھا لیکن اس دنیا کے لوگ دوسرے فرقوں سے اچھی طرح سمجھتے بھی تو نہیں کم از کم ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے کوئی نہ کوئی بات پیدا ضرور کرنی چاہیئے ورنہ آپ اگر ان کے حق میں کوئی نیکی کرنا چاہیں تو تب وہ آپ کی راہ میں مطلب سے لگائیں گے۔

میں حیران تھا کہ یہ سردار صاحب تو فلاسفر نکلے۔ کون کہہ سکتا تھا۔ کہ اس چھوٹے سے کمرے میں معتق اتنے بڑے سردار صاحب ایسی ٹھوس اور مدلل گفتگو کر سکتے ہیں۔ انہوں نے میری بڑھتی ہوئی دلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کھڑکی میں سے سامنے کے مکان کی طرف رُخ کر کے زور زور سے آوازیں دیں۔ "کاکا اوئے کاکا"

ایک آٹھ نو برس کا لڑکا آتا دکھائی دیا جس کے سر پر بالوں کا بڑا سا ڈھیلا ڈھالا جوڑا تھا۔ سردار جی نے پکار کر کہا "بیٹا چائے لاؤ دو گلاس اور نمکین مٹھیاں بھی لیتے آنا"

اب ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی تھی۔ ایسے موقعہ پر سردار جی کی اس برمحل تجویز سے دل بہت خوش ہوا۔ میں نے اظہار خوشنودی کی غرض سے ان کی باتوں میں اور بھی دلچسپی لینی شروع کر دی۔ وہ ہنس کر بولے "معاف کیجئے گا میں آپ سے چائے کیلئے پوچھنا بھول ہی گیا تھا۔ سردی پڑ رہی ہے نا کڑاکے کی.........."

"جی کوئی مضائقہ نہیں" میں نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر صبح کا بھولا شام کو واپس آجائے تو پھر........"

"ہاہا.......... جی تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ ہاں، سو یہ بات ہے۔ جناب عالی! اب مجھی کو دیکھئے۔ اتنا تو آپ تسلیم کریں گے کہ آجکل ریل گاڑیوں میں بہت سخت ہجوم ہوتا ہے۔ اگر کسی ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کیجئے تو اندر والے لوگ ٹھوکریں مارتے ہیں۔ لیکن مزے کی بات دیکھئے کہ اگر مجھے ایک دفعہ پائیدان پر پاؤں رکھنے کیلئے جگہ مل جائے تو دس منٹ کے اندر اندر میں ڈبے کے اندر سب سے آرام دہ جگہ پر بیٹھا نظر آؤں گا..........

.... آپ کو تعجب ہو رہا ہے۔ جی؟..........

پچھلے ہفتہ ادھر ہی کی تو بات ہے۔ مجھے ذرا لاہور تک جانا پڑا۔ اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو گئی۔ جب ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ گاڑی میں تل پھینکنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ ڈبے تو خیر بھرے ہوئے تھے ہی بعض لوگ چھت پر جا بیٹھے۔ اور بیسیوں آدمی بھڑوں کیطرح دروازوں کی سلاخوں کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ میں پلیٹ فارم پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم گیا لیکن جناب کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ گاڑی کے چلنے میں ایک آدھ منٹ ہی باقی رہ گیا تھا۔ خیر جناب میں نے بھی دھینگا مشتی کر کے دروازے کا ہینڈل پکڑ لیا اور پائیدان پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ جو پہلے کھڑے تھے۔ وہ لگے بڑبڑانے۔ میں نے ان میں سے ایک کا ہاتھ دیکھ کر پتے کی بات بتا دی۔ قریب کھڑے ہوئے دوسرے شخص نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اسے بھی ایک آدھ بات بتا دی۔ گاڑی کے اندر کھڑے ہوئے ایک شخص نے بھی مجھے ہاتھ دکھانا چاہا۔ میں ذرا آگے سرک گیا۔ بس اسطرح ہاتھ دیکھتا ہوا میں گاڑی کے اندر داخل ہوا۔ اور لوگوں نے میرے لئے جگہ بنا دی اور میں آرام سے بیٹھ گیا۔ کئی امیر آدمی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی ہاتھ دکھائے۔ غرض کیا عرض کروں کس قدر مزا آیا۔ میں ٹھاٹھ سے ایک جگہ بیٹھا ہوا لوگوں کے ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ وہی لوگ جو چند منٹ پہلے مجھے ٹھوکریں مارنے پر آمادہ تھے۔ اب مجھے آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ دیکھا آپ نے.......... دنیا کا تو یہی رویہ ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر کوئی گُن پیدا کرے"

میں نے آداب بجا لاتے ہوئے کہا۔ "دھنیہ ہو مہاراج۔ دھنیہ ہو"

اسی طرح وہ بڑی تفصیل کے ساتھ اس مشکل فن میں اپنی جان توڑ کوششوں کا ذکر کرتے رہے۔ جب دو گلاس چائے اور ان کے قول کے مطابق نمکین مٹھیاں بھی آگئیں تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ ان کی زبان منہ سے نکل کر ناک کی نوک سے چھو گئی۔

"لیجئے بابو صاحب! میں آپ کو اور بات سناتا ہوں"

اُب میرے ہاتھ دستانوں میں کھجلانے لگے۔ میں نے دستانے اُتار کر پرے رکھ دیئے۔

"جی! ——— ایک مرتبہ میں انبالہ اسٹیشن پر کھڑا تھا۔ امرتسر کو جانے والی گاڑی کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ گاڑی دو گھنٹے لیٹ ہے۔ میرے ہمراہ میرا ایک دوست بھی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے پامسٹری سے دلچسپی ہے چنانچہ گاڑی کے انتظار میں جب ہم بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے تو اس فن شریف کا ذکر شروع ہو گیا۔ میں نے جب ذرا اس کی اہمیت کا ذکر کیا تو بس صاحب وہ اسے مبالغہ سمجھے۔ میں نے کہا۔ حضور! دکھا دوں تماشہ؟ بولے دکھاؤ۔ پھر کیا تھا۔ میں نے اُٹھ کر ایک اچھے خاصے جنٹلمین کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ دیکھتے ہی چند پتے کی باتیں ایسی بتائیں کہ وہ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنی دیر میں اور بھی بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں سے ایک سفید پوش حضرت نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جب انہیں باتیں بتائیں تو حضرت حیران رہ گئے۔ اب کیا تھا اور لوگ بھی ہاتھ بڑھانے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں سب کا ہاتھ دیکھوں گا۔ لیکن دو ہی دو باتیں بتاؤں گا۔ وہ بڑے خوش ہوئے لیکن اتنا صبر کہاں۔ نہ معلوم کہاں سے اتنے لوگ آن جمع ہوئے۔ وہ مجھ پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ صاحب! کیا کہوں میں کس قدر پریشان ہوا۔ یہاں تک کہ مجھے آخر کار بھاگتے ہی بنی۔ اب تماشہ دیکھئے۔ آگے آگے میں پیچھے پیچھے ہجوم۔ بڑی مشکل سے میری جان چھوٹی.... میرا ساتھی بس حیران ہی رہ گیا۔ اس دن وہ گاڑی بھی رہ گئی اور ہم دوسرے دن گاڑی پر سوار ہو سکے"

میری حیرانی کی بھی کچھ حد نہ رہی۔ میں کنکھیوں سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا۔ نہ معلوم میرے ہاتھوں میں کیا لکھا ہو۔ سردار صاحب بولتے چلے گئے .... یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اسے خاص اہمیت دی جانی چاہیئے۔ ہاتھ کی لکیروں سے انسان کے کردار کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے۔ اس کی خوبیاں اور خامیاں صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ اس کا فائدہ ہی کیا تو جناب فرض کیجئے ایک شخص کاروبار کرتا ہے۔ حالانکہ وہ کاروبار کرنے کا اہل نہیں ہے۔ وہ بجائے اس کے اگر نوکری کرے تو زیادہ کامیاب رہے۔ اجی دُور کیوں جاتے ہو۔ میرے بڑے بھائی صاحب کا قصہ سُنیئے :-

پہلے وہ دندان سازی کا کام کرتے تھے۔ ادھر نکڑ پر ان کی دوکان تھی۔ بابو جی آپ سچ مانیئے ڈھائی سال تک وہ اس دوکان میں رہے لیکن جناب کیا مجال جو کوئی گاہک پھٹک بھی جائے۔ یعنی یونہی کوئی بھولا بھٹکا گاہک تو خیر آپ جانے ہی دیجئے۔ ان کی روٹی بھی مشکل ہی سے چلتی تھی۔ خیر صاحب ایک دن میں نے انکا ہاتھ دیکھا۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ حضرت کس دھیان میں ہیں۔ کاروبار میں آپ کو کوئی فائدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بڑے پریشان ہوئے میں نے کہا۔ بھائی صاحب ملازمت اختیار کیجئے...........

خیر جناب میرے بہت کہنے سننے پر انہوں نے دوکان کا کام چھوڑ کر معمولی مستری بن گئے۔ لیجئے صاحب ترقی کرتے کرتے اب وہ انجینئر بن گئے۔ خوب روپیہ پیدا کرتے ہیں۔ کیا عزت ہے کیا ان شان ہے۔ اپنا مکان بھی بنوا لیا ہے........ اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں پامسٹری سے مدد لی جا سکتی ہے۔ مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بچوں کے ماں باپ انہیں زبردستی کوئی نہ کوئی مضمون پڑھواتے ہیں حالانکہ بچے کی طبیعت اور اس کے طبعی رجحان کے مطابق ہی سب کام کرنے چاہییں۔ اس معاملے میں پامسٹری سے بڑھ کر کسی اور چیز سے مدد نہیں مل سکتی۔ سمجھے آپ، کوئی لڑکا سائنسدان بن سکتا ہے۔ کوئی آرٹسٹ کوئی جج کوئی کاروباری اور کوئی لیڈر۔ یہ سب باتیں انکے ہاتھ دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ غور فرمایئے کہ اگر ہم اس تجویز کے مطابق عمل کرنے لگیں۔ تو کسی کو تکلیف نہ رہے۔ جس طرف بچے کا رجحان ہو وہی موقع اسے دیا جائے۔ بڑا ہو کر وہ یقیناً بہت قابل شخص بن جائیگا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ عدالتوں میں بھی پامسٹری سے کام لینا چاہیئے آپ کو شاید معلوم نہیں کتنے بیگناہ شخص پھانسی پر لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ بعض بیچارے کئی کئی برس قید کی سزا پاتے ہیں۔ غلط ثبوت مل جانے پر ان بیچاروں کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ اس کا بھی سہل علاج یہی ہے۔ کہ اچھے پامسٹوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ صاحب! دیکھئے میں

صاف گو شخص ہوں۔ لگی لپٹی کہنے کی مجھے عادت ہی نہیں۔ آپ ہی کہیئے کہ اگر کسی شخص کے ہاتھ سے یہ بات ظاہر ہو کہ وہ ایک شریف اور نیک دل شخص ہے اور اس کا طبعی رجحان جرائم کی طرف نہیں ہے تو پھر اس بیچارے کو سزا دینے سے کیا فائدہ؟ ——— یہ ہے میرا نظریہ۔ اسی طرح میں غریبوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ ہائے ہم ہندوستانیوں کو آخر کب سمجھ آئے گی۔ پراچین بھارت میں ان سب باتوں پر یقین کیا جاتا تھا۔ اسی لئے ان دنوں اس ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں۔ اب وہ زمانہ بھی گیا۔ بابو جی! آپ ان باتوں سے واقف نہیں پہلے زمانے میں ان سب باتوں کا علم اس قدر عام تھا کہ ایک عضو آپ کے جسم کا کوئی حصہ دیکھ کر آپ کے سارے جسم کی کیفیت بتا سکتا تھا میں نے ایک کتاب "نرنجن درشنی" میں ایک راجہ کا قصہ پڑھا۔ وہ اپنی رانی کی تصویر بنوانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک مصور کو بلوایا جب مصور حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ ہماری مہارانی کی تصویر بناؤ۔ لیکن ایک شرط ہے کہ تم مہارانی کی صورت نہیں دیکھنے دونگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب سے وہ رنج محل میں آئی ہے۔ اس کی صورت میرے سوا کسی غیر مرد نے نہیں دیکھی۔ مصور نے عرض کی مہاراج! آپ انہیں پردے میں بٹھا دیجئے۔ انہیں پردے کے پیچھے بٹھلا دیجئے۔ سامنے قد آدم آئینہ رکھ دیجئے۔ میں آئینے میں صورت دیکھ دیکھ کر تصویر تیار کر دونگا راجہ نے کہا یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس پر مصور نے بہت غور کرنے کے بعد کہا۔ تو مہاراج ایک اور ترکیب ہو سکتی ہے۔ آپ مجھے ان کا پاؤں دکھا دیجئے صرف پاؤں۔ میں اسی سے اندازہ لگا لوں گا۔"

یہ کہہ کر سردار صاحب نے یہ بڑی بڑی آنکھیں نکال کر میری طرف دیکھا۔ "سمجھے آپ؟ بس راجہ نے منظور کر لی یہ بات۔ چنانچہ مصور نے رانی کے پاؤں دیکھ کر ان کی پوری تصویر بنا دی۔ ایک بات اس نے یہ کی۔ کہ رانی کی ران پر تل کا نشان بنا دیا۔ مہاراج کو تصویر بہت پسند آئی۔ لیکن راجہ نے اس بات پر اعتراض کیا کہ مہارانی کی ران پر تل کا نشان کیوں بنایا۔ اس پر مصور نے کہا کہ ران پر تل موجود ہے۔ چنانچہ جب مہاراج نے مہارانی کی ران دیکھی تو اس پر تل نظر آیا۔ اس پر مہاراج کو مصور پر شک گذرا۔ . . . .

. . . . . . اور جناب مصور نے ثابت کر دیا۔ کہ وہ صرف پاؤں دیکھ کر نہ صرف انسان کے قد و قامت اور شکل و صورت کا بالکل صحیح اندازہ لگا سکتا تھا۔ بلکہ وہ یہ بھی معلوم کر سکتا تھا۔ کہ انسان کے جسم کے کس حصہ پر تل کا نشان موجود ہے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ اس کہانی میں خواہ مبالغہ ہی کیا گیا ہو لیکن پامسٹری کو ماننے والے تو بہت سے لوگ موجود ہیں۔ میں بھی انہیں ہاتھ دکھا ہی ڈالوں فیس تو نہیں کا خوف تھا۔ میں نے ہاتھ رگڑ رگڑ کر ان ریکھاؤں کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ سردار صاحب نے میز کی دراز میں سے ایک بڑا سا آتشی شیشہ نکال کر کہا کہ میں اس شیشے سے ہاتھ دیکھا کرتا ہوں سمجھ گئے آپ؟ اس شیشے سے ہر قسم کی لکیریں نظر آ جاتی ہیں۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ منگل کے دن میں ہاتھ دیکھتا ہوں۔ چونکہ میں کسی سے کوئی فیس نہیں لیتا۔ اسی لئے بہت لوگ آ جاتے ہیں

...... "میرے دل کو اطمینان حاصل ہو گیا میں نے رومال سے ہاتھ صاف کئے اور آگے بڑھانے ہی لگا تھا۔ کہ سردار صاحب بولے "ایک مرتبہ جناب! گورنمنٹ سے ٹکر ہو گئی میری۔ میں نے دو دکانوں کا ٹیکس نہیں دیا تھا۔ اس بات پر ٹیکس وصول کرنے والے افسر سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ وہ تھا کٹر مسلمان۔ میں نے کہا میاں دیکھو میرے ہاتھ ۔ سمجھے صاحب! اصل معاملہ یہ تھا۔ کہ وہ ٹیکس کے ساتھ کچھ جرمانہ بھی وصول کرنا چاہتا تھا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ میں جرمانہ نہیں دونگا۔ ٹیکس ادا کر دونگا۔ حضرت بگڑ گئے۔ جھگڑا بڑھا۔ تو میں ایک ان سپیڈ ڈی سی کے دفتر میں جا پہنچا۔ چپڑاسی نے مجھے اندر داخل ہونے سے روکا۔ میں نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کے حوالے کیا اور کہا جاؤ صاحب کو دے دو۔ میرے کارڈ پر لکھا تھا۔ سردار جگندر سنگھ ریسرچ سکالر۔ صاحب نے مجھے فوراً اندر بلا لیا۔ انہوں نے پوچھا کس چیز میں ریسرچ کرتے ہیں آپ؟ میں نے کہا۔ پامسٹری میں ——— چنانچہ میں نے ان کا ہاتھ دیکھا اور ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ حضرت خوش ہو گئے۔ بعد میں میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے اسی وقت لکھ کر حکم بھیج دیا کہ سردار جگندر سنگھ ریسرچ سکالر سے

جرمانہ وصول نہ کیا جائے ...."

اب دامنِ صبر ہاتھ سے جاتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ انہیں اپنا ہاتھ دکھا ہی ڈالوں۔ اُدھر وہ بھی تاڑ گئے تھے کہ میں انہیں ہاتھ دکھانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے اپنے ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر آتشی شیشہ مارتے ہوئے چھپی نظروں سے میرے ہاتھ کیطرف دیکھا۔ میں نے انہیں ذرا ڈھب پر لانے کیلئے کہا "سردار صاحب! آپ فیس کیوں نہیں وصول کرتے۔ آپ ہزاروں روپیہ کما سکتے ہیں۔"

سردار جی نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا "بابو جی میں صاف گو شخص ہوں۔ میرا اصول یہ ہے۔ کہ منہ کے سامنے بات کہدیتا ہوں۔ لگی لپٹی کہنے کی عادت ہی نہیں میری۔ در حقیقت میں حرام کا روپیہ حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ لوگوں کو دھوکا دے دے کر ان کا روپے بٹورنا اور اپنی جیبیں بھرنا........ بتائیے میں پرلوک کو کیا منہ لے کر جاؤنگا.......... میں صاف گو آدمی ہوں۔ مجھے لگی لپٹی.........."

میں نے جلدی سے دستانے پہنتے ہوئے کہا "اچھا سردار جی! ست سری اکال"

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئے اور میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا واپس چلا آیا ❖

بلونت سنگھ

(سانیٹ)

الجھن

چاند کی نذر کئے میں نے نظر کے سجدے
حسن معصوم کے جلووں کا پرستار رہا
میں نے تاروں پہ نگاہوں کی کمندیں پھینکیں!
ایک رنگین حقیقت کا طلب گار رہا
ذہن کے پردے پہ رقصاں ہے کوئی عکسِ جمیل
حسن کے روپ میں شاید وہ لیکایک مل جائے
ہر نئے جلوے سے بیساختہ یوں لپٹا ہوں
جیسے بچھڑا ہوا اک دوست اچانک مل جائے
میں نے الفاظ میں رومان کے نغمے ڈھالے
سعیٔ تخلیقِ ترنم سے سکوں مل نہ سکا
مطمئن ہو نہ سکیں میری سلگتی نظریں
حسب دِل خواہ مجھے ذوقِ جنوں مل نہ سکا
میری آشفتہ نگاہی کا اثر چھن جائے
مجھ سے اے کاش! مرا ذوقِ نظر چھن جائے

نذیر مرزا برلاس ایم اے

غمگسار

رات خاموش ہے رُوٹھی ہوئی قسمت کی طرح
وُہ بھی دُور سے چپ چاپ گزر جائے گی
تم تو کچھ بات کرو تم مری قسمت تو نہیں
اِس خموشی میں ہے احساسِ گرانباریٔ زیست
اِس خموشی ہی سے گھبرا کے یہاں آیا ہوں

دیکھو جلتا ہوا اِک پھول ہے وُہ آتشدان
شعلے اُٹھتے ہیں پہ اِس بُت کو نہیں چھو سکتے
بُت تو بیگانۂ آلام بنے جاتا ہے۔
کیسے شعلے ہیں کہ جلتے ہیں مگر آنچ نہیں
کوئی محسوس نہ کر پایا مرے دل کی جلن

میں سمجھتا تھا کہ پتھر بھی پگھل سکتے ہیں،
میں نے دیکھا تھا کہ جلتے ہیں خزاں میں اشجار
اور ہر شام کسی غم سے سُلگتا ہے فلک،

اِن کو ہے اپنے ستاروں سے شگوفوں سے غرض
میں کسی کو بھی مگر آج تک اپنا نہ سکا۔

یہ ستارے یہ شگوفے تو پلٹ آتے ہیں
میری رُوٹھی ہوئی قسمت بھی کبھی آئیگی؟

کتنی یادیں غمِ امروز سے جاگ اُٹھتی ہیں
گرتے پتوں سے بہاروں کا خیال آتا ہے
یادیں رمانوں میں گھُلتی ہیں تو غم بڑھتا ہے
اب بھی ہے جینے کا ارمان مگر یہ یادیں
میرے قدموں سے لپٹتی ہوئی زنجیریں ہیں

(۲)

ابھی اشجار نے پہنا نہ تھا پتوں کا لباس
خواہشیں شاخوں میں لہراتی نمی کی صورت
فصلِ گُل کا مجھے پیغام دیئے جاتی تھیں،

اور پھر ہنستی ہوئی جانِ بہار آ پہنچی۔
میرے ارمان تھے شاخوں پہ شگوفوں کی طرح
انہی شاخوں کے تلے پرتوِ خورِ رخشاں
وہ مرے پاس کھڑی رنگِ چمن دیکھتی تھی
اس کے دامن میں کئی پھول تھے شبنم آلود
اس کا چہرہ بھی تو اک پھول تھا ہنستا ہوا پھول
میرے سینے میں کئی سیلِ فراواں اُٹھے
ایسے میں وقت کا احساس کسے رہتا ہے
ہوش آیا تو خزاں مجھ پہ کھڑی ہنستی تھی
حسرتِ گریہ بھی طوفان بداماں لیکن
درد وہ سنگِ گراں ہے کہ پگھلتا ہی نہیں

اب مری زیست تو برف ڈھلانوں کی طرح
صرف اک مرمریں مرقد ہے مرے ماضی کا۔

زندگی برسے ہوئے ابر کی مانند اُداس
آج بھی کھوئے ہوئے وقت کی راہ تکتی ہے

رات خاموش خلاؤں کے چلی آتی ہے
اس خموشی ہی سے گھبرا کے یہاں آیا ہوں۔

مَیں سمجھتا تھا کہ پتھر بھی پگھل سکتے ہیں
لیکن انسان تو پتھر بھی نہیں اُس کی ہنسی
اِک تذبذب میں مجھے چھوڑ کے چل دیتی ہے

آج اُس زیست سے گھبرا کے یہاں آیا ہوں
آج مَیں نے وہ "ستارہ سرِ مژگاں" دیکھا
جو کسی اور کے غم سے بھی دمک اُٹھتا ہے
تُم نے محسوس کیا ہے مرے غم کو شاید
تُم پہ بھی ایسی ہی راتیں کبھی آئی ہونگی
تُم بھی کچھ بات کرو، تم مری قسمت نہ سہی
تم مری بات، مرا غم تو سمجھ سکتی ہو۔

اِس خموشی میں ہے احساسِ گرانباریِ زیست
اِس خموشی ہی سے گھبرا کے یہاں آیا تھا

سید ضیا جالندھری

اکیلا

اب نیلے وسیع آسمان پر گھومتا ہوا بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا غائب ہوگیا تھا۔ اور پہاڑی نالے کا شور آہستہ آہستہ خاموش فضا میں ابھرتا آرہا تھا۔ لیکن اب اس کی نگاہیں بادل کے اس تنہا ٹکڑے کی آوارہ گردی سے اور اس کے کان پہاڑی نالے کے مسلسل شور سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ سنسان سڑک کے موڑ پر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھے ہوئے وہ بالکل بھول چکا تھا کہ اس کے دوست اس کا انتظار کرتے کرتے اکتا گئے ہوں گے۔ وقت کی ایک ہی الٹی زقند سے ماضی کی تصویر کا ایک ایک نقش ابھر آیا تھا۔ اور یادوں کے قافلے اس تیزی سے بڑھے آرہے تھے کہ اسے اس بات کا ہلکا سا احساس بھی نہیں رہا تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے قد کا مسکین سا شاعر ہے جس کے چہرے پر مظلومیت برستی رہتی ہے۔ اور جو آنے جانے کے سیکنڈ کلاس کے کرایہ کے علاوہ ساٹھ روپے کی رقم لے کر ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لئے یہاں چلا آیا ہے۔ اس نے کبھی مشاعروں میں شرکت کرنے سے انکار نہیں کیا تھا، محض اس لئے کہ ایسی محفلوں میں جانے سے اسے خاطر خواہ رقم مل جاتی تھی۔ اور جب سے جنگ کی گراں سالی نے نچلے متوسط درجے میں ایک جانکاہ پریشانی کے اسباب پیدا کردیئے تھے۔ محض مشاعرے ہی اس کے لئے خوشحالی کا پیغام لاتے تھے۔ جب کبھی مہینے میں دو مشاعرے ہو جاتے تو وہ سمجھتا کہ شاید قدرت کو اپنے معصوم انسان کی تنگ دستی کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ اکثر اوقات یوں بھی ہوتا کہ مہینے بھر کی تنخواہ میں سے اس کی جیب میں پانچ روپے کا آخری نوٹ رہ جاتا اور وہ منے کی بیماری اور ڈاکٹر کے بل کے متعلق سوچتا ہوا سو جاتا۔ صبح چپ چاپ بیٹھتا اور پہلی ڈاک میں اسے کہیں سے مشاعرے کی دعوت آجاتی۔ مشاعروں کے منتظمین اور اکثر احباب یہی سمجھتے کہ وہ ان دعوتوں کو بادلِ ناخواستہ قبول کرتا ہے اس لئے وہ لوگ اس کی منتیں کرتے اور اس کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اور جب ڈلہوزی کی کسی ادبی انجمن کی طرف سے اسے مشاعرے کی دعوت ملی تو اس دلفریب وادی کا سارا حسن اس کی نظروں کے سامنے چھا گیا۔ اور اس کا دل بے ساختہ ڈلہوزی جانے کے لئے تڑپ اٹھا جہاں وہ آج سے بیس برس پہلے اپنے سنہرے بچپن کی یادیں چھوڑ آیا تھا۔ اس نے بغیر کسی انکار کے وہ دعوت قبول کرلی اور بیس سال گزرنے پر عمر کی ایک گردش اسے پھر اسی وادی میں لے آئی۔ جہاں ہرے ہرے دھان کے کھیت تھے۔ کالی کالی سلیٹ کی چھتیں تھیں اور چہروں کی سفیدی میں زرد رنگ کی آمیزش لئے پہاڑی عورتیں تھیں جو جوانی میں بوڑھی ہوگئی تھیں۔ وہ دھان کے ان کھیتوں اور سلیٹ کی ان چھتوں کے درمیان آج پھر ان دنوں کی یاد کو واپس لانے کی کوشش کر رہا تھا جب اس کا بچپن آسمان پر پھیلی ہوئی قوس قزح کی طرح رنگین تھا۔ جب اس کی جوانی نے زہر کے گھونٹ نہیں پئے تھے۔ اور جب وہ زیست کے راستے میں اپنے کندھوں پر زندگی کا بوجھ محسوس کئے بغیر ناچتا کودتا جا رہا تھا۔

وہ آج پھر اسی مکان کے سامنے آ بیٹھا تھا۔ جہاں وہ آج سے بیس برس پہلے اپنے والدین کے سائے میں خوشی اور اطمینان کے دن گزار چکا تھا۔ وہ اس وقت ان پریشانیوں سے بے خبر تھا۔ جو اس کے گھر والوں کا راستہ روکے کھڑی تھیں

اور اگر اسے کبھی ان کا احساس بھی ہوا تھا۔ تو اتنا ہلکا کہ وہ ان کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہا تھا۔ اور آج یہ سامنے والے مکان کے تین کمرے جس میں اس کے بچپن کی یادیں دفن تھیں اسے اپنے والدین کی بے بضاعتی کا احساس دلا رہے تھے لال کوٹھی اور سیٹھ دھارکا داس کے بنگلے کے درمیان وہ تین کمروں والا مکان راجہ کے محل کے سامنے بڑھیا کے جھونپڑے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ لال کوٹھی والے بچوں سے ماں کے منع کرنے پر بھی بے تکلفی سے ملا کرتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی اپنی ماں کو لال کوٹھی والی عورتوں سے ملتے جلتے نہ دیکھا تھا۔ بچپن میں یہ بات کبھی اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ مگر آج اسے وہ خلیج صاف نظر آ رہی تھی۔ جو لال کوٹھی اور ان تین کمروں کے درمیان حائل تھی اور جسے عبور کر جانا اس کی ماں کے بس کا روگ نہ تھا۔

پھر اسی مقام پر بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھیں اپنے گزشتہ بیس سالوں کی بے ربط تصویریں دیکھنے لگیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی پریشانیوں کی ابتدا اس کے والد کی بیماری سے ہوئی تھی جب گھر کا مرکز ڈگمگا گیا تھا اور پھر اپنی ماں کی شکل اس کی آنکھوں میں پھر گئی جو اس اندھیرے میں روشنی کی تنہا کرن بنی تھی۔ اس کے والد کی بیماری لمبی ہوتی گئی۔ اور ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ مریض کو کسی صحت افزا مقام پر لے جانا شاید اس کے لئے بہت مفید ثابت ہو۔ اس کی والدہ نے ایک ماہر اقتصادیات کی طرح گھر کے جمع خرچ کا جائزہ لیا اور وہ اپنے بیمار والد اور اپنی باحوصلہ ماں کے ساتھ ان چھوٹے چھوٹے تین کمروں میں آ مقیم ہوا۔ اس کے والد کا علاج ہوتا رہا اور اس کی والدہ کے زیور کم ہوتے گئے مگر پہاڑ کی خوشگوار ہوائیں بھی اس کے والد کی صحتِ رفتہ کو واپس نہ لا سکیں۔ اور آخر کار خاندان کا مرکز معدوم ہو گیا اور وہ محور ٹوٹ گیا۔ جس کے گرد خاندان کی فارغ البالی چکر لگایا کرتی تھی۔ اور پھر آنے والے مصائب کے خلاف اس کی والدہ ڈھال کی طرح قائم ہو گئی۔ جب اس کے والد کا جنازہ اٹھا اور لوگ پرسے کے لئے آئے تو اس کے چچا نے اپنے روتے ہوئے یتیم بھتیجے کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا "ارشد آج سے میرا بیٹا ہے" لیکن اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ چچا کی محبت والد کی محبت سے بہت مختلف تھی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے محسوس کر لیا کہ اسے اپنے چچا سے کسی قربانی کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ اس کی ماں نے اپنے جی سے عہد کر لیا تھا کہ وہ اپنے بچے کے سامنے کبھی نہیں روئے گی۔ مگر جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اسے اپنی والدہ کی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کی جھلک صاف دکھائی دینے لگی اور پھر عید سے ایک روز پہلے جب اس نے اپنی والدہ اور ثریا کو روتے دیکھا تو اسے پہلی دفعہ اس بات کا احساس ہوا کہ ثریا اس کے چچا کی بیٹی اپنے باپ سے کس قدر مختلف تھی۔ اس دن کے بعد اس کے دل میں ثریا کے لئے ایک احترام کا سا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اگرچہ ثریا اس سے عمر میں ایک سال چھوٹی تھی۔ مگر اس کی نگاہوں میں ایک خاص قسم کی ملائمت تھی۔ اور جب وہ اس کی طرف دیکھتی تو اسے یقین سا ہونے لگتا۔ کہ یہ ملائمت اس کے زخم کا مرہم بن سکتی ہے۔ وہ ذہین تھا۔ اس لئے اس کے استاد اس کی تعلیمی رہنمائی کرنے میں ہمیشہ خوش ہوا کرتے تھے۔ جب اس نے نویں جماعت کا امتحان دیا اور اپنی جماعت میں پہلے درجہ پر کامیاب ہوا تو محلے کی عورتیں اس کی ماں کو مبارکباد دینے کے لئے آئیں۔ اس شام جب وہ گھر میں داخل ہوا تو ثریا اس کی والدہ کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے ثریا کی طرف دیکھا اور ثریا نے اپنے دوپٹے کو آنکھوں تک سرکا لیا اور اس کی والدہ نے کہا "ارشد ثریا کہتی ہے کہ اب وہ تم سے پردہ کیا کرے گی" اور اسی دن کے بعد ثریا کی آنکھوں میں ملائمت اور اس کے دل میں اسی ملائمت کا احساس بڑھتے چلے گئے اس کی ماں اپنے بیٹے کے اس بڑھتے ہوئے احساس سے بے خبر نہیں تھی۔ اس نے خیالوں

ہی خیالوں میں ثریا کو بنی ہوئی بیٹی دیکھ رہی تھی۔ اور پھر وہ اس طوفان کے خیال سے کانپ اٹھی جو گھر کی خاموش فضا میں ثریا کے قلم سے نکلی ہوئی چند سطروں نے پیدا کر دیا تھا۔ ثریا کے گھر میں اس کے رشتے کی باتیں ہونے لگیں تو اس نے ایک خط کے ذریعے اس کو سب کچھ لکھ بھیجی۔ اور جب یہ بات عام ہوئی اور اس کی والدہ نے ثریا کو اپنے بیٹے کے لئے حاصل کرنا چاہا تو اس کے بھائی نے یہ سمجھا جیسے اس کی بے عزتی کی گئی ہو۔ اس کی لمبی لمبی گھنی مونچھیں لرز اٹھیں اس کی آنکھوں میں شعلے اتر آئے اور وہ دروازہ جو دونوں گھروں کے درمیان کھلتا تھا ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ چچا کے ہاں اس کا آنا جانا ترک ہو گیا۔ اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی روح کچل دی گئی ہے۔ جیسے زندگی اب ایک چٹان کی طرح تھی جس میں سے ملائمت کا آخری ذرہ تک ختم ہو گیا ہو اور اس واقعہ کے بعد وہ ایک جوان ہوتا اور شاعر بنتا چلا گیا۔

بل کھاتی ہوئی سڑک پر چند پہاڑی اپنی لمبی لمبی لکڑیاں اپنے کندھوں پر رکھے اور ان کے دونوں طرف دودھ کے چھوٹے چھوٹے برتن لٹکائے بات چیت کرتے دیکھتے ہوئے گزر گئے۔ اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور ہونٹوں کو آہستہ آہستہ کھولتے ہوئے دھوئیں کو فضا میں بکھیر دیا۔ دھواں ہوا میں ہلکی ہلکی قوسیں بناتا ہوا معدوم ہوتا چلا گیا۔ ثریا کی کاوش نے کیا۔ اس کی ملامت تیر بنے تھے۔ وہ دھواں فضاؤں میں بکھر چکا تھا۔ ثریا کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہوئی اور روتے روتے ہوئے ڈولی میں بٹھا دیا گیا۔ پھر وہ چٹان روز بروز قریب ہوتی گئی لیکن اس نے اس چٹان سے سر نہیں پھوڑا بلکہ اس کی سنگدلی کا احساس کرنے کے لئے اس کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ اب وہ اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد کالج میں جا سکا تھا جہاں اس کے لئے اس چٹان کی بے رحم سختی کا احساس فزوں تر ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کی ماں نے اپنے بیٹے پر توجہ باندھ کر اسے تعلیم کے لئے بہترین کالج میں بھیج دیا تھا۔ مگر جب خیالات کے پر دور رہتے ہیں اس کے پاؤں اکھڑ جاتے تو اس کی ماں اس کی مدد کو نہ آسکتی تھی۔ اور وہ اس طوفان کا تنہا مقابلہ کرتے کرتے اکتا جاتا تھا۔ اور آخر اس کے خیالات نے ایک راستہ نکال لیا۔ جب ایک روز پہلی دفعہ گاڑھے کا کرتہ اور موٹے کھدر کا پاجامہ پہنے کالج میں آیا تو ایک معمولی جھجک کے ساتھ اسے ایک عجیب خوشی کا احساس ہوا۔ جیسے اس نے اس چٹان کا ایک بھاری پتھر جو اس کی آنکھوں میں کھٹکتا رہتا تھا۔ نیچے لڑھکا دیا ہو اور لوگ اس پر نہیں بلکہ اس لڑھکتے ہوئے پتھر کو دیکھ کر مسکرا رہے ہیں اب اسے کالج کے خوش پوش کھاتے پیتے لڑکوں سے کد نہیں تھی۔ اور نہ باپ کی کار پر کالج آنے والے ہم جماعتوں سے گلہ تھا۔ پھر اس کی تحریروں میں پختگی آتی گئی اور خلوص کا رنگ ابھر ہوتا گیا۔ اور جب وہ پہلی دفعہ اپنی چند تقریروں کے خلاف پرنسپل کے ونسنٹ پولیس کا نوٹس موصول کرنے کے لئے باہر آیا تو اس کے چہرے کے اطمینان سے یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے کی خوش خطی کی کاپی پر استاد نے شاباش لکھ دیا ہو۔

اب وہ پارٹی کا قابل اعتماد رکن ہو چکا تھا۔ ثریا کی آنکھوں کی ملائمت اب ایک بھولا ہوا خواب تھی۔ مگر شمی کے ہاتھوں کا لمس ایک حقیقی چیز تھی۔ حقیقت جو دھوئیں کی قوسیں برابر ہوا میں پھیلتی گئیں۔ اور اس کی زندگی میں ہوا کی بیلیاں یکے بعد دیگرے آئیں۔ رنگینی لمحوں میں مسکراہٹوں اور ایک آدھ ریشمیں لمس کی نشانیاں چھوڑ کر دور نکل گئیں۔ آج بھی اپنی زیست کے اندھیرے میں ثریا کی آنکھوں، شمی کی پیشانی اور بانو کی انگلیوں کے سرخ سرخ ناخنوں کو چمکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اس کی زندگی کے ہنگامے میں جوانی اور عورت ایک ساتھ آئے تھے اور جب وہ ہوش و خرد کی متاع کو سنبھالے زندگی کے کارزار میں داخل ہونے لگا تھا۔ تو عورت اسے دہلیز پر ہی مل گئی تھی۔ پھر کچھ عرصے تک یہ

دونوں ہنس مکھ ساتھی قدم قدم اس کے ساتھ چلتے آئے تھے۔ مگر ابھی وہ منزل تک نہ پہنچ پایا تھا۔ کہ یہ دونوں اسے تنہا چھوڑ کر خدا جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ آج دم بھر اپنے آپ کو تنہا محسوس کر کے ان دونوں ہمراہیوں کی کم ہمتی پر ہیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ہر ناکامی اس کے لئے ایک غیر آسودہ خلش چھوڑ گئی تھی۔ ہر لڑکی سے رخصت ہوتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ جس کی یاد عرصے تک اسے ڈستی رہی تھی۔ اور پھر وہ چونک اٹھا جیسے سرد ہوا کا تیز جھونکا اس کے کان میں کچھ کہہ گیا ہو۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ان ہمراہیوں کی قدر نہ کی ہو اور ایک ایک کر کے خود ہی انہیں کھو دیا ہو۔ وہ اس خیال کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اگرچہ شمی کے الفاظ ہوا کے جھونکے کی تیزی سے ملتے جلتے تھے جب وہ پارٹی کے دفتر میں پہلی دفعہ اس سے ملا تو وہ ایک شرمیلا سا طالب علم تھا۔ اور جب اس کے تعارف کے وقت رمیش نے اس کے سیاسی کام کی تعریف کی تو کنواری لڑکیوں کی طرح اس کے چہرے پر سرخی کی لکیریں دوڑ گئیں لیکن سمترا نے جو پارٹی میں کامریڈ ہاشمی کے نام سے مشہور تھی۔ جیسے اس کے دل کا چور پکڑ لیا اور بول اٹھی۔ "ارشد صاحب ہم سب کو آپ کے کام پر ناز ہونا چاہیے۔ میں تو ایک مدت سے پارٹی کے ممبروں سے آپ کے کام کی تعریف سنتی آئی ہوں مگر آج تک آپ سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا تھا۔" پھر ملاقات کے موقع بڑھتے چلے گئے اور ہر موقع سے پورا فائدہ اٹھایا جانے لگا۔ اب وہ پارٹی کا اہم ترین رکن سمجھا جاتا تھا۔ شمی ان کا اخلاقی سہارا تھی۔ جس کی پیہم تعریفوں نے اسے آگ کا ایک طوفان بنا دیا تھا۔ جس کی ہر لحظہ بڑھتی ہوئی تیزی سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ڈائنا سیٹ کی طرح اس چٹان سے ٹکرا جائے گا۔ جو آج تک اس کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ اتنے بڑے افسر کی اکلوتی بیٹی ایک مزدور کی طرح اس کے ساتھ اس چٹان کو پاش پاش کرنے کے لئے اپنی مدد کا ہاتھ بڑھا کے اور وہ اسے قبول نہ کر سکے، وہ بزدل نہیں تو اور کیا تھا۔ شمی اگر مسلمان نہیں تھی تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ تو اس جہان کا باشندہ تھا جہاں قوم اور ملک کے بت توڑ دیئے گئے تھے، جہاں مذہب و ملت کا امتیاز مٹ گیا تھا۔ اور جہاں نسل اور رنگ کی پرانی دیواریں ڈھائے جانے کے بعد ایک عالمگیر بھائی چارے کا پرچار ہوتا تھا۔ لیکن جوں جوں شمی قریب آتی گئی اسے اپنی بے بسی کا احساس زیادہ ہوتا گیا۔ اگرچہ وہ ہزار دفعہ اس خیال پر ہنس چکی تھی مگر وہ شمی کے باپ کی تنخواہ کا خیال اپنے دماغ سے محو نہ کر سکا تھا۔ تیرہ سو روپے!!! جیسے اس کے دماغ میں سینکڑوں سوئیاں تیرنے لگتیں، نوکیلی ہلکی ہلکی چبھن پیدا کرتے والی سوئیاں!!! شمی اس خیال پر ہنس پڑتی اور ان سوئیوں کی چبھن ایک لمحے کے لئے رک جاتی اور پھر اسے اپنی ماں کا خیال آ جاتا جس کے گھر کی تاریکی بہو کی روشنی کا انتظار کر رہی تھی، جس کا دروازہ بہو کے قدموں کو خوش آمدید کہنے کے لئے اب تک کھلا تھا اور جو اپنی آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کی دھندلاہٹ لئے اس کے لئے چاند سی دلہن تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ اس نے سوچا شاید اسے بیوی کی نہیں بلکہ اپنی ماں کے لئے ایک بہو کی زیادہ ضرورت ہے۔ وہ اپنے آپ سے چھپتا پھرتا تھا لیکن شمی ایک سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور پھر اس نے بے سوچے سمجھے تاریکی میں چھلانگ لگا دی اور وہ سایہ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو گیا۔

ایک چھوٹی سی میز کے گرد بیٹھے ہوئے شمی نے صاف لفظوں میں اس دوراہے کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ جس پر وہ ایک مدت سے کھڑے تھے اور آگے بڑھنے کی ہمت نہیں پا سکتے تھے۔ میز پر پڑی ہوئی کافی کی پیالیوں میں دودھ کے قطرے سفیدی کی لکیریں بنا کر ناپید ہو رہے تھے۔ اور پھر کافی کی گہری سیاہی میں ہلکی سی سفیدی تیر کر گم ہو گئی۔ کمرے کی گھٹی گھٹی فضا بہت بوجھل معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے شمی کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈالیں اس نے اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں نہیں لیا!

اس نے اس کی ڈھلی ہوئی شفاف پیشانی کی طرف نہیں دیکھا جس کو وہ ہزار دفعہ چوم چکا تھا لیکن اس کے کانوں نے اس کی آواز کو اور شمی کے دل کی دھڑکن کو ضرور سنا شمی نے آہستہ سے کہا: "ارشد اگر مجھے زندگی میں کبھی اس بات کا احساس ہوا کہ تم مجھے تنہا ہی حاصل کرنا چاہتے تھے تو یقین جانو کہ یہ احساس میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگا:" اس نے اپنی زندگی بھر کی تلخیوں کو اپنے ہونٹوں پر لا کر ایک بجھی ہوئی مسکراہٹ میں تبدیل کر لیا اور بولا "شمی! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم کبھی اس احساس سے دوچار نہیں ہو سکو گی:" اور شمی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا: "ارشد تم آج سے میرے بھائی اور دوست ہو؟" اور پھر جیسے ایک بڑی سی لہر اٹھی اور طوفان ہمیشہ کے لئے تھم گیا۔ فضا نے سانس روک لیا، زمین کی گردش تیز ہو گئی اور شمی کی موجودگی میں اپنے اردگرد قبر کی سی تنہائی محسوس کرنے لگا۔

شمی اب پارٹی کی ممبر نہیں رہی تھی اس لئے اس سے ملاقات کے مواقع آہستہ آہستہ بہت کم ہو گئے تھے۔ اور ایک دن جب شمی نے ٹیلیفون پر بات کرتے ہوئے اسے اپنی شادی کی دعوت پر بلایا تو اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ ضرور شامل ہوگا اس نے پچاس روپے کی رقم پارٹی فنڈ میں جمع کرا دی اور جیب میں اس کی رسید اور چہرے پر وہی بجھی ہوئی مسکراہٹ لئے شمی کی شادی میں شامل ہونے کے لئے چلا گیا۔ پارٹی کے چند اور افراد جنہیں شمی نے اپنی شادی پر مدعو کر رکھا تھا۔ اس کے ہمراہ تھے۔ اس کے دوست تمام راستہ شمی کے اس عجیب و غریب رویے کی تاویلیں ڈھونڈتے رہے جس نے چار برس تک اس خلوص اور ہمدردی سے پارٹی کا کام کرنے کے بعد اب پارٹی سے علیحدہ ہو کر ایک آئی۔سی۔ایس سے شادی کرنا قبول کر لیا تھا۔ اور جب وہ کوٹھی کے جگمگ جگمگ کرتے صحن میں داخل ہوئے تو شمی ہلکے آسمانی رنگ کی زرکار ساڑھی میں ملبوس زیوروں سے لدی پھندی اُن کے استقبال کے لئے بڑھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور جیب سے پچاس روپے کی رسید نکالتے ہوئے اس سے کہا "کامریڈ! یہ تمہاری شادی کا تحفہ ہے" شمی نے شکریے کے ساتھ قبول کرتے ہوئے اپنے خاوند کو ان سب لوگوں سے متعارف کیا جو زندگی کی دوڑ میں کبھی اس کے شریک رہے تھے۔ انہوں نے غور سے اس کے خاوند کو دیکھا۔ کالی اچکن اور سفید پاجامہ پہنے لمبے قد کا بھدا سا نوجوان جس کے چہرے پر نہ کوئی کشش تھی نہ ذہانت کے کوئی آثار لیکن جو صوبے کے ایک اہم ضلع کا سب سے بڑا افسر تھا۔ وہ اس سے ملا اور بہت ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا اور شمی ان سب کے درمیان بیٹھی بہت غور سے اپنے پرانے ساتھیوں اور نئے ہمراہی کی باتیں سنتی رہی۔

اس واقعے کے ایک ہفتہ بعد جب اس نے پارٹی آفس میں اپنا استعفٰے داخل کر دیا تو ساری پارٹی میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ یہ تبدیلی کچھ ایسی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ کہ اس کے کسی جاننے والے کو اس پر اعتبار نہیں آتا تھا۔ اور جب پارٹی کے تمام بڑے بڑے رکن اس کے پاس اس کی وجہ دریافت کرنے کے لئے آئے تو اس نے ان کی تمام باتیں سن لینے کے بعد کہا: "کامریڈز! میں خوش ہوں کہ پارٹی میں میری حقیر خدمات کو آپ نے اتنی اہمیت دی۔ کہ آج آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی ان خدمات کو جاری رکھوں لیکن یقین جانئے کہ میں ایمانداری سے یہ محسوس کرتا ہوں کہ آج میرے کندھوں میں اس ذمے داری کو اٹھانے کی طاقت نہیں رہی اور پارٹی میں بیکار رہنے کی بجائے میں نے یہ بہتر سمجھا ہے کہ پارٹی سے علیحدہ ہو جاؤں" اس کے ساتھی اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اور وہ ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح اس بساط سے علیحدہ ہو گیا۔ اپنی تمام دلچسپیوں سے الگ ہو کر زندگی اسے ایک بہت بڑا خلا معلوم ہوتی تھی جسے وہ کبھی ماضی کی یادوں،

کبھی حال کی تلخیوں اور کبھی مستقبل کی امیدوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ اب وہ بیت جھڑ میں درخت سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح تھا جسے تیز ہوائیں اڑائے اڑائے پھرتی ہوں۔ اس نے نئے شناسا پیدا کئے۔ نئے دوست بنانے کی کوشش کی اور پرانے تعلقات کو ختم کر کے اپنے اردگرد نئے لوگوں کو جمع کرلینا چاہا۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ زندگی کو آزادانہ پرواز کی اجازت دینا چاہتا ہے اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ زندگی کا تعاقب نہیں کرے گا۔ بلکہ اسے خود بخود نئے سانچوں میں ڈھلنے کی اجازت دے دے گا۔ وہ ایک شوقین مزاج تماشائی کی طرح خود اس کا تماشا کرے گا۔ نہ اس کے ہاتھ باگ پر ہوں گے، نہ وہ پاؤں رکاب میں ڈالے گا۔ اور رخشِ عمر خود بخود زندگی کی منزلیں طے کرتا جائے گا۔ چنانچہ جب بانو کو اس کی مرجھائی ہوئی آنکھیں اور کملایا ہوا چہرہ پسند آگیا اور اس نے اس کے قریب ہونے کی کوشش کی تو اس نے اس کا برا نہیں مانا۔ بانو جو عمر میں اس سے پانچ سال بڑی تھی، جسے ایم۔ اے پاس کئے تین سال ہوگئے تھے۔ اور جو اب لڑکیوں کے کالج میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ دھیمی سی، مری ہوئی آواز میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے والی بانو۔ لمبوترے سے چہرے والی لڑکی نما عورت جس نے اسے اپنا لینے کی ناکام کوشش کی تھکے ہوئے راہی کی طرح وہ اسی منزل پر ستایا ضرور لیکن رکا نہیں۔ اس نے اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے سویٹر پہنے، اس کی خریدی ہوئی نکٹائیاں استعمال کیں، اس کے ساتھ کئی اداس شامیں گزاریں لیکن اس کا ہو کر نہ رہ سکا۔ وہ جانتا تھا کہ بانو کو اس کی ذات سے ہمدردی اور اس کے شعروں سے پیار ہے لیکن ہمدردی کو اس نے کبھی انسانیت کا پسندیدہ جذبہ نہیں سمجھا تھا۔ اس کے خیال میں اس جذبے کے ساتھ ہی کمتری اور برتری کے درجے مقرر ہوجاتے تھے شاید اسی لئے اس نے اپنے آپ کو اس قیمت پر بیچنا نہیں چاہا اور بانو ایک ٹوٹتے ہوئے تارے کی طرح اس کی زندگی میں آئی اور دور چلی گئی!!!!

اب وہ ایک ادبی رسالے کا ایڈیٹر ہوگیا تھا جہاں سے اسے ایک معمولی سی رقم ہر مہینے مل جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے چند اچھے گھرانوں میں کچھ ٹیوشنیں قبول کرلی تھیں۔ اور اس طرح گزر اوقات کی ایک مستقل صورت پیدا کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو قدرے محفوظ خیال کرنے لگا تھا کہ قدرت رضیہ کو اس کے راستے میں لے آئی۔ گھر کی چار دیواری میں قید، کیتلی میں ابلتے ہوئے پانی کی طرح شوخ و شنگ رضیہ جو پہلے اس کی شاگرد تھی اور پھر اس کا زنداں۔ اسے بی۔ اے کے امتحان کی تیاری کرتے کراتے وہ خود اپنے امتحان میں پورا نہ اتر سکا تھا۔ ایک کھاتے پیتے گھر کی ذہین لڑکی جو سماج کی بندشوں کو گالیاں دیتی تھی، جس نے اپنے اختیاری مضامین میں اقتصادیات اور فلسفے کو منتخب کیا تھا اور کالج جاتے وقت جس کے تانگے کی دونوں کھڑکیوں کے سامنے پردہ لٹکا دیا جاتا تھا، اس کے لئے معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ رضیہ شاید اس راز سے واقف تھی کہ بجھی ہوئی شمع کو دوبارہ روشن کرلینا بہت آسان ہوتا ہے۔ ابتدا میں اسے رضیہ کی حرکتوں پر ہنسی آتی رہی۔ اور وہ سمجھتا رہا کہ ڈوبتی ہوئی رضیہ تنکے کا سہارا لے رہی ہے۔ اگرچہ آخر میں وہ تنکا سہارا تو نہ بن سکا لیکن ڈوبنے والا اسے اپنے ساتھ لے کر ڈوب گیا۔ جب اس نے اس سحر سے آنکھیں کھولیں تو اس نے دیکھا کہ فرار کے تمام راستے مسدود ہوچکے تھے۔ اور اس کے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔ اس نے کئی دفعہ رضیہ کو اپنی بے بسی کا احساس دلانے کی کوشش کی لیکن رضیہ جو جذبات کی رو میں بہہ چکی تھی ان باتوں کو خاطر میں نہ لاسکی۔ اس کی محبت مثالی محبت تھی۔ اس نے اسے اسی طرح چاہا تھا جس طرح ایک نوجوان عورت کو ایک مرد سے محبت کرنے کا حق حاصل ہے۔ اور ایک دو مرتبہ جب اس نے..........................

. . . . دبے لفظوں میں اپنی زبوں حالی اور تنگدستی کا تذکرہ کیا

تو رضیہ نے ہنستے ہوئے کہا، بہت تنخواہ تو دیکھ رہے ہو اگر تم ایک بھکاری بھی ہوتے تو خدا جانتا ہے میں تم سے شادی کرنے سے گریز نہ کرتی۔ خدا کیلئے اس طرح بار بار دولت کا ذکر کر کے میری محبت کی توہین نہ کرو۔ اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ رضیہ نے اپنے والدین کو بھی اس بات پر رضامند کر لیا ہے۔ آج اس وقت لاکھ متوسط درجے کی تہذیب کے پیمانوں پر رحم آنے لگا جن کے ہاں بے ہودہ اخلاق کے جھوٹے ترازؤں میں تولتی تھی جہاں وہ بدنامی کے خوف سے اپنی بیٹیوں کو اس جیسے بیکاریوں کے سپرد کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے جن کی لڑکیاں ماں باپ کے اوراد دیدہ لپیٹ کر تقاضائے بالت کی تعلیم حاصل کرنے کالج جاتی ہیں۔

دولت کی تمام تو میں اس نے بھی جکی تھیں اور زندگی خود بخود نئے سانچوں میں ڈھلتی جا رہی تھی کم از کم وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ اس کی والدہ نے بھی اس کی خوشی میں برابر حصہ لیا تھا۔ اور رضیہ ہر لحاظ سے چاند سی دلہن ثابت ہوئی تھی جس سے اس کا تاریک گھر جگمگا اٹھا تھا۔ وہ توقع سے بڑھ کر سمجھدار ثابت ہوئی اور اس نے شادی کے بعد اپنی امیر اور بدمزاج سہیلیوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ وہ اپنی اتفاقی پسند پہ بہت خوش تھا۔ اس کی بیوی اس کی ہمدرد اور دکھ درد میں برابر کی شریک ثابت ہوئی تھی اس نے بڑے گھر کی لڑکی ہونے کے باوجود اس کے ہاں کی روکھی سوکھی زندگی کو خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ دن یونہی گزرتے جا رہے تھے۔ طوفانوں کی زد سے بچ کر نکلی ہوئی ناؤ کو کنارہ مل گیا تھا لیکن اسے اس بات کا احساس نہ ہو سکا تھا کہ سفینے بعض دفعہ کناروں سے بھی ٹکرا کر ڈوب جاتے ہیں۔ پھر وقت نے ایک کروٹ لی اور رضیہ کے مزاج میں یکلخت ایک تبدیلی پیدا ہو گئی اور ننھے کی پیدائش کے بعد اس کو محسوس ہونے لگا کہ اپنے خاوند کے لئے اس کے جذبات حقیقت کی سرزمین سے نہیں بلکہ خیالات کی پرفریب وادی سے پیدا ہوئے تھے اور اب حقیقت کی ایک ہی چھوت سے دکھاوے کا سارا طلسم نیست و نابود ہو گیا تھا جیسے وہ یکلخت چونک اٹھی ہو اور اسے یاد آگیا ہو کہ بہنا کا خاوند مجسٹریٹ ہیں اور حمیدہ کی شادی ایک مشہور بیرسٹر سے ہوئی ہے۔ وہ حالات کو سنبھال لینے کی ہزار کوشش کرتا مگر اب بڑی بڑی دکانوں کے باہر شیشے کی الماریوں میں پڑی ہوئی ساڑھیاں رضیہ کو اپنی شکستہ حالی پر قہقہے لگاتی ہوئی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اب ننھے کے لئے دودھ کی نہیں بلکہ بچہ گاڑی کی زیادہ ضرورت تھی اور اس کٹیا میں اپنی سہیلیوں کو بلانا جگ ہنسائی نہیں تو اور کیا تھا۔ ہزار کوشش کے باوجود گھر کا امن قائم نہ رہ سکا شکر رنجیاں بڑھتی گئیں اور گھر کی فضا مرابی تر ہوتی چلی گئی۔ وہ اپنی قسمت کو کوسا کرتی اور وہ خاموشی سے اس کی باتوں کو سنا کرتا اس نے ایک روز مصالحت کی کوئی صورت نہ پاتے ہوئے اپنے ترکش کا آخری تیر استعمال کیا اور رضیہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اس نے خود اسے شادی کے لئے مجبور کیا تھا۔ اور رضیہ نے کھلے بندوں اس بات کا اعتراف کر لیا کہ اس نے ایسا کرنے میں اپنی عمر کی پہلی اور آخری غلطی کی تھی اور اب وہ اس کے بچے کی ماں بن کر شادی کا لیبل لگائے محض گلے میں پڑا ہوا ڈھول بجا رہی ہے اور اس دن کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ اور اس نے رضیہ کی تمام زیادتیوں کو برداشت کر لیا۔ اس کی خاموشی گہری ہوتی گئی اور اسے یقین ہوتا چلا گیا کہ محبت کے پودے کو بھی سدا بہار رکھنے کے لئے دولت کے پانیوں سے سینچنا پڑتا ہے۔ روپے سے اس کی محبت بڑھتی چلی گئی اور اب وہ ہر وقت پیسہ کمانے کی دھن میں کھویا رہنے لگا۔

ابدآج وہ ایک معقول رقم حاصل کرنے کے لئے پھر اسی وادی میں چلا آیا تھا۔ جہاں سلیٹ کی ترچھی جھکی ہوئی چھتوں کے نیچے اس کی خوشحالی کی داستان مدفون تھی اس کی نظروں کے سامنے وہ مکان موجود تھا جہاں اس نے زندگی کی پرامن گھڑیاں گزاری تھیں پھر اس چار دیواری کے اندر جانے کا شدید جذبہ اس کے دل میں ابھر آیا اور وہ اس خیال

کی شدت سے تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس مکان کی ایک ایک اینٹ سے گلے ملے گا۔ اس کے ایک ایک ذرے سے لپٹ جائے گا۔ ممکن ہے کسی دیوار پر اس کی والدہ کا عکس مستقل ہو گیا ہو، کسی کونے سے اسے اپنے مدفون قہقہوں کا خزانہ مل جائے، اس کی فضاؤں میں اس کے والد کی بکھری ہوئی آوازیں اس کے کانوں میں گونج اٹھیں اور گرتی ہوئی زندگی کو سہارا مل جائے۔ اس مکان کے در و دیوار اسے پہچان کر اس کی آغوش میں بڑھے چلے آئیں گے۔ اور وہ ان میں سے اپنی آسائشوں کے دفینے ڈھونڈھ نکالے گا۔ اب ذرا سر جھکائے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ بیرونی دیوار پر جابجا اکھڑے ہوئے چونے کے پیچھے سے پتھروں کی سیاہی جھانک رہی تھی۔ چھت یوں جھکی ہوئی تھی جیسے اس برسات میں وہ ہار مان لے گی۔ اور دیواروں پر پھیلی ہوئی لکیریں بوڑھے بے آب چہرے پر پڑی ہوئی جھریوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں وہ اس چار دیواری کے اندر جانا چاہتا تھا۔ لیکن ایک نامعلوم سی جھجک اس کے پاؤں پکڑے کھڑی تھی اب وہ مکان کے دروازے پر دستک دینے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ ذرا دور سے ایک آواز ابھری اور اس کی یاد کے دامن سے لپٹ گئی، آواز اس کے کانوں کے لئے اجنبی نہیں تھی، "منڈو ٹائیگر کو ادھر لاؤ اور کمرے سے میری ٹوپی لے آؤ" اس نے مڑ کر دیکھا لال کوٹھی کے پھاٹک پر ایک دراز قد نوجوان برجس پہنے منہ میں پائپ لئے کھڑا تھا۔ آواز کا تیکھا پن اس کے ذہن میں ابھی تک ایک کرید سی پیدا کئے جا رہا تھا۔ اور جب اس نے دوسری بار غور سے اس کی طرف دیکھا تو بھورے رنگ کی ہلکی ہلکی مونچھوں والے چہرے کے پیچھے اسے کمار کی روتی شکل صاف دکھائی دینے لگی اور اسے حیرت ہوئی کہ وہ بیس برس کی مدت میں کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ جب وہ سر پر شام کی ٹوپی پہنے اس کی طرف آیا تو اس کا دل ایک مبہم سے احساس کی شدت سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ اب تک وہیں کھڑا تھا اور سامنے کی سڑک پر کمار اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس نے اس کے پاس پہنچ کر ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی اور ہاتھ میں کتے کی زنجیر لئے خاموشی سے اس کے پاس سے گزر گیا۔ جیسے تھپڑ سے مارا ہو کسی نے اس کے منہ پر اور اس کا جی چاہا کہ لپک کر اسے گردن سے پکڑ لے اور کہے "ارے کمار تم نے مجھے نہیں پہچانا! ارے تم نے بالا گولیاں کھیلتے ہوئے الجھ پڑنے پر جس نے مار مار کر تمہارا کچومر نکال دیا تھا اور باغ میں ناشپاتیاں چراتے ہوئے جب مالی سر پہ آ پہنچا تھا تو کس کی مدد سے تم وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ ورنہ اس روز وہ پیٹتے کہ ساری عمر یاد رکھتے اور سورج چھپنے پر تمہاری اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ میرے بغیر موتی ٹبے کی سیر تک کو چلے جاؤ" نوجوان اب سڑک کے موڑ سے گھوم کر گم ہو چکا تھا۔ وہ ابھی تک سر جھکائے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ سورج غروب ہو گیا تھا اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے اب شام کے سائے آہستہ آہستہ وادی میں اترتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ سڑک سنسان پڑی تھی اور اس میں سے ایک پگڈنڈی نکل کر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی دور پہاڑی کے اوپر درختوں کے جھنڈ میں گم ہوتی جا رہی تھی۔

اعجاز حسین بٹالوی

موت

(اپنے جوانمرگ بھائی شائق مرحوم کی یاد میں جو چند دن ہوئے ہنستے کھیلتے یکایک اِس دارِ فانی سے رخصت ہو گیا۔)

ہنستے ہوئے یوں بزم سے تم چل دیئے اُٹھ کر — کوئی نہ یہ سمجھا، نہ پھر آؤ گے کبھی تم
ہنس ہنس کے بھری بزم کو تھے تم تو ہنساتے — تھی کس کو یہ اُمید رُلاؤ گے کبھی تم

محفل میں ہے جو آنکھ تمہیں ڈھونڈ رہی ہے — ایسے گئے، ایسے گئے، تم کھو گئے جا کر
لَو تم سے لگائے ہوئے بیٹھے ہیں یہاں ہم — محو اور کسی بزم میں تم ہو گئے جا کر

چپکے سے جو یوں چل دیئے تم اُٹھ کے یکایک — بھولا ہُوا یاد آیا تمہیں کوئی بلاوا؟
پہلے ہی سے جانے کی تھی ٹھانے ہوئے جی میں — یہ سرسری انداز سے جانا تھا دکھاوا۔

رخصت کے بغیر اُٹھ کے یہ جانا تھا مناسب؟ — جاتے ہوئے اتنی تو ذرا سوچتے تم بات
جانا تھا تو محفل کو تو سب تم نے دیا ہوتا — جلدی تمہیں کیا تھی، ابھی باقی تھی بہت رات

کچھ اپنی سُناتے ہمیں، کچھ سنتے ہماری — کر دیتے اسی طرح اندھیرے کو اُجالا
تھیں سننے سُنانے کی ہزاروں ابھی باتیں — ہم نے ابھی ارمان نہ تھا دل سے نکالا

جی بھر کے تمہیں دیکھ نہ پائے تھے ابھی ہم — تم آنکھ سے یُوں چھُپ گئے جیسے کوئی سپنا
دُنیا وہ خیالوں کی جو محبوب تھی تم کو — اب جا کے وہاں تم نے بنایا ہے گھر اپنا

یہ سچ ہے کہ دل سے نہیں کچھ دُور وُہ دُنیا — تم آنکھ سے پنہاں ہو مگر دل میں مکیں ہو
آ جاتے ہو باہر جو کبھی دِل سے نکل کر — سچ مچ یہی لگتا ہے کہ تم جیسے یہیں ہو

آنکھوں کی مگر اس سے تسلی نہیں ہوتی — کیسے انہیں سمجھائیں ہر اِک خوابِ حسیں تم؛
وہ خواب کہ شیرازہ ہُوا جس کا پریشاں — اُس خوابِ مسرت کی ہو تعبیرِ حزیں تم

محمد ہادی حسین

ہندیورپی شعرائے اردو فارسی

یہ مضمون عالی جناب رائے بہادر رام بابو سکسینہ صاحب کی انگریزی تالیف "ہندیورپی شعرائے اردو و فارسی"
کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔ جو ابھی نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے محاسن سے بحث کرنا غیر ضروری ہے
اس لئے کہ مؤلف کا نام اس کی خوبیوں کی کافی ضمانت ہے۔
میں نے یہ ترجمہ مؤلف کی فرمائش سے کیا ہے۔ (خواجہ احمد فاروقی)

اہل یورپ منصۂ ہندوستان پر کئی حیثیتوں سے جلوہ گر ہوچکے ہیں۔ اور انہوں نے مختلف اوقات میں پادری، تاجر، فاتح ،
م او منتظم کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ انہیں کی بدولت ایک نیا اور مخلوط طبقہ عالم وجود میں آیا جو عام طور پر اینگلو انڈین فرقہ کہلاتا ہے
ن" ہندیورپی" اور" انگریز ہندی" طبقہ میں اردو اور فارسی کے نامور شعرا پیدا ہوئے۔ ان شاعروں اور ادیبوں کی تاریخ کے
سلہ میں ہندیورپی یا ایسٹ انڈین" (جیسا کہ وہ لوگ اپنے آپ کو کہتے تھے) فرقہ کے عروج و ترقی کا ذکر بطور تاریخی پس منظر خلاف
محل نہ ہوگا۔

ہندوستان میں اس طبقہ کی ابتدا اہل پرتگال اور دوسری یورپی اقوام کی آمد سے ہوتی ہے۔ لیکن ان کے آنے سے بھی
ے ہندوستان میں کچھ عیسائی بالخصوص اہل آرمینیا موجود تھے جنہوں نے یہاں کے معاملات میں کچھ حصہ لیا۔ یہاں ان کا اجمالی
ر بھی ضروری ہے اس لئے کہ اردو اور فارسی کے کچھ شعرا اس فرقہ سے بھی متعلق تھے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ارمنی تاجر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض (Thomas Cana)
س کینا کی اولاد میں سے تھے۔ جو ۳۴۵ء میں ساحل مالابار پر لنگر انداز ہوا تھا۔ بعض وہ لوگ تھے جو شاہ عباس صفوی
ے ذریعہ ترکوں کی غلامی سے رہا ہوکر (Cranganore) اور (Angamale) کے علاقوں میں اقامت گزیں
ہوگئے تھے۔ وہ ان مقامات سے شاہ ایران کے لئے تجارت کرتے تھے اور اس سے بہت سا نفع حاصل کرتے تھے۔ ارمنی زیادہ
جنوب ہی کے اطراف و جوانب میں پھیلے ہیں انگریز جب پہلے پہل ہندوستان آئے تو ان کو ارمنی لوگوں سے بڑی مدد ملی۔ انہوں نے
ن کو ترجمان کی حیثیت سے نوکر رکھا اس لئے کہ یہ لوگ فارسی جانتے تھے۔ مغل حکام سے گفتگو کرنے میں اس کی واقفیت از بس ضروری تھی
اس کے علاوہ یہ لوگ مقامی زبانوں سے جو بازاروں میں بولی جاتی تھیں بخوبی واقف تھے۔ ان کو قیمتوں کا اندازہ تھا اور ان
لیوں کا بھی علم تھا جہاں سے سامان فراہم کیا جاسکتا تھا۔ ان خصوصیات کی وجہ سے یہ لوگ ترجمان بننے کے لئے نہایت موزوں
ے۔ ارمنی بھی اس خدمت کے لئے بخوشی تیار ہوجاتے تھے۔ اس لئے کہ اس میں دونوں کا فائدہ تھا۔ انگریز تو اس طرح اپنی
است کو فروغ دے رہے تھے۔ اور اپنے دائرہ عمل کو وسیع سے وسیع تر کر رہے تھے۔ اور ارمنی لوگوں کو یہ فائدہ تھا کہ وہ اپنی

دولت اور خوشحالی میں اضافہ کر رہے تھے۔ اور اس طرح ان کو حکومت مغلیہ سے مزید مراعات حاصل کرنے کے مواقع مل جاتے تھے۔ ارمنی لوگوں کی ایک نوآبادی آگرہ میں موجود تھی۔ اکبر و جہانگیر اس کی سرپرستی کرتے تھے۔ کچھ لوگ بنگال میں بھی آباد ہو گئے تھے۔ ان کی تعداد اور دولت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ان میں یورپین اور اینگلو انڈین لوگوں میں باہمی شادیاں ہوتی تھیں

ایسٹ انڈین فرقہ کی باقاعدہ تاریخ پرتگالیوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے یہ ہندوستان کی تاریخ کا عہد آفرین واقعہ ہے۔ الفانسو البوقرق نے جو ڈیو کا گورنر تھا اور جو اپنی فہم و فراست کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ آباد کاری کی ایک پالیسی وضع کی جس کا مقصد اپنے مقبوضات کو مستحکم بنانا تھا اس میں مذہبی اور دنیاوی دونوں فائدے مضمر تھے۔ اس نے اپنے ہم وطنوں اور سپاہیوں کو دیسی عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی ترغیب دی ان میں سے بیشتر اُن مسلمانوں کی عزیز اور بیوائیں تھیں جو پرتگالیوں کے ساتھ لڑائی میں مارے گئے تھے۔ البوقرق نے ان شادیوں میں جو اس کی اجازت اور مرضی سے ہوئیں خود شرکت کی اور سامان اور تحائف بھی دیئے۔

اس نے شادی شدہ لوگوں کو زمین، مکان اور مولیشی فراہم کئے تاکہ وہ بہ سہولت اپنی زندگی کا آغاز کر سکیں۔ اس پالیسی کا بنیادی اصول قومی منفعت حاصل کرنا تھا یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کہ غیر ملکی مقبوضات پر اس طرح تصرف جمایا جائے کہ ایک آبادی جو حاکم و محکوم کے اختلاط ازدواجی کا نتیجہ ہے۔ اس کی حمایت کیلئے موجود ہو۔ بالکل یہی طریقہ کار رومیوں کا تھا جنہوں نے نئے مقبوضات پر ستوار اور محفوظ بنانے کے لئے شادی بیاہ کے رشتے جوڑے جان دوم (۱۴۸۱ء تا ۱۴۹۵ء) شاہ پرتگال نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا جبکہ اس نے مسلم دہ اشی کے پاس سے میں شمالی افریقہ میں اپنے اثرات بڑھانے چاہے تاکہ ساحلی ممالک اور پرتگال کے درمیان تجارتی تعلقات قائم ہو سکیں اس طرح اہل پرتگال اپنی روایات قدیم تاریخ اور مزاج کے اعتبار سے اس پالیسی پر کاربند ہونے کے لئے نہایت موزوں تھے۔ ان لوگوں کا تعلق ٹیوٹانی اور سلاو قوموں سے نہیں بلکہ رومی نسل سے تھا۔ اسی لئے پرتگالیوں نے ہر اس قوم کے ساتھ ارتباط و اختلاط کو قبول کیا ہے۔ جن کے دوش بدوش انہیں کام کرنے کا موقع ملا ہے۔

مورسی حکمران پرتگالی عورتوں سے شادی کر لیتے تھے۔ پرتگالی ان مناظر کو دیکھ چکے تھے۔ اس لئے ہندوستانی اقوام سے شادیاں کرنا ان کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ پرتگالی لوگ صرف تجارتی اور ملکی تعلقات ہی بڑھانا نہیں چاہتے تھے، بلکہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کی تبلیغ کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس کار خیر کے لئے اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا کہ عورتوں کو عیسائیت کی دعوت دی جائے۔ اور مناکحت کے ذریعہ عیسائیت میں اضافہ کر دیا جائے۔ کسی ہندوستانی عورت کے ساتھ اس وقت تک شادی نہیں ہوتی تھی۔ جب تک کہ وہ کلیسائے مقدس سے وابستہ نہیں ہو جاتی تھی۔

اس پالیسی پر کچھ عرصہ تک عمل ہوتا رہا لیکن یہ ناکام ثابت ہوئی۔ پرتگالیوں کے اندازے صحیح نہیں تھے۔ اس پالیسی میں عمل اور ردعمل کے سخت گیر قانون کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہ ہندوستانی بیویاں جو عیسائی مذہب کو قبول کر لیتی تھیں۔ وہ برادری سے خارج کر دی جاتی تھیں اور یہ سزا نہایت سخت تھی ان عورتوں کے عزیز بھی اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں میں حقیر سمجھتے تھے۔ اس لئے کہ ان کا تعلق ایسے لوگوں سے تھا جو عیسائی مذہب میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ کلو خاندان اپنی ذلت و خواری کو بھولے نہیں تھے۔ ان کے دل میں پرتگالیوں کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی اس لئے کہ ان لوگوں کی ہی بدولت ان کی تذلیل ہوئی تھی۔ ان حالات نے پرتگالیوں کی تجارت کو صدمہ پہنچایا اور وہ منافرت اور

جو نسل جو اس طرح پیدا ہوئی اس نے بالآخر پرتگالیوں کے اقتدار اور تسلط کی آبرو کو پامال کر دیا۔ وہ اولاد جو پرتگالیوں اور ہندوستانیوں کی آمیزش سے عالم وجود میں آئی تھی اس کو بھی نظرِ حقارت سے دیکھا گیا۔ اور وہ بھی اپنی ماؤں کی طرح دوسرے لوگوں سے بالکل الگ تھلگ ہی رہی۔ جب پرتگالیوں کا زوال ہو گیا تو ان لوگوں کی گزر صرف خیرات اور سرکاری امداد پر ہوتی تھی۔ ان کا سیاسی تعلق ہندوستان سے منقطع ہونا شروع ہوا تو ان کا معاشرتی اقتدار بھی اٹھنے لگا۔ اور ان کی ایک بڑی تعداد ہندوستانی معاشرہ میں داخل ہو گئی اور رفتہ رفتہ اس میں گھل مل گئی ——"

ان کے متعلق سر ولیم ہنٹر نے لکھا ہے:-

"البو قرق، ڈی سلوا اور ڈی سوسا جیسے بڑے بڑے نام اب صرف باورچیوں اور باورچی خانہ میں کام کرنے والے لڑکوں کے ہیں۔"

ان میں سے بعض پرتگالی خاندانوں نے بعض شعبوں میں بڑا نام پیدا کیا۔ ڈی سوزا الکھ پتی اور ہمدرد بنی نوع انسان (Philanthropist) اور (Derozio) انگریزی کا نامور اور ممتاز شاعر تھا۔ (De Sylva) مشہور حکیم اور اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ (da Costa) کو ادبیات سے شغف تھا۔ بدقسمتی سے ہند پرتگالی آبادی میں جھوٹ موٹ بھی بہت سا اضافہ ہوا ہے وہ اس طرح کہ ہندوستانی عیسائیوں کے خود ان لوگوں نے، یا دوسروں نے پرتگالی وضع کے نام رکھ دیئے۔ درحقیقت ہندوستان کے اصلی پرتگالی خاندان، مشہور اور مالدار تاجروں اور خادمانِ خلق پر مشتمل ہیں۔ یا اب ان کی یاد ان خیرات خانوں اور کلیساؤں سے وابستہ ہے جو ان کے بزرگوں نے کلکتہ یا اس کے گرد و نواح میں بنائے تھے۔

اہلِ ہالینڈ کی آمد نے پرتگالیوں کی دولت و امارت کو سخت نقصان پہنچایا۔ ڈچ لوگوں کی تاریخ درحقیقت ہندوستان سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ ان کا اس ملک سے تعلق بہت معمولی و عارضی تھا۔ اسی لئے ان کے اثرات مستقل اور دوامی نہیں تھے۔ (Coromandel) کے ساحل پر جو پرتگالی خاندان رہتے تھے۔ وہ حکومت کا سایہ اٹھ جانے کے بعد (Batavia) کی ہجرت کر گئے اور کچھ مر کھپ گئے۔ ڈچ خاص طور پر لنکا میں بس گئے اور وہاں اس وقت تک شان و شوکت کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے جب تک [illegible] میں انگریزوں نے اسے لے نہیں لیا۔ ان مخلوط ڈچ لوگوں نے جو عام طور پر (Burghers) کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ سیلون کے معاملات میں بڑا حصہ لیا ہے، لیکن ہندوستان میں ڈچ لوگوں کی بنیاد نہایت کمزور تھی۔ ان کے کارخانوں نے کبھی بڑے شہروں کی حیثیت اختیار نہیں کی۔

فرانسیسی انگریزوں کے پنجہ شکن حریف تھے اور ایک عرصہ تک ہندوستان پر تسلط جمانے کے لئے انگریزوں سے برسر پیکار رہے۔ اسی سلسلہ میں بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ بہت سے فرانسیسی جو ہندوستان میں آئے تھے۔ وہ شریف خاندانوں کے فرد تھے۔ یا مالدار سپاہیوں کے بیٹے تھے۔ ان میں سے بہت سے نظام، ٹیپو سلطان، سندھیا، ہلکر، بھرت پور، گوہد اچھے بھلے نوابان اودھ، رنجیت سنگھ، بیگم سمرو وغیرہ کے ملازم ہو گئے یہ لوگ ان کی طرف سے یا ان کی حمایت میں جیسا موقعہ ہوتا تھا۔ لڑتے تھے۔ انہوں نے سپاہیوں کو بھرتی کیا اور فوج کی تربیت کی۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے ہندوستانی عورتوں کے ساتھ شادیاں بھی کیں۔ ان عورتوں میں سے بعض مسلمان تھیں۔ اور بعض ہندو۔ اس طرح ایک مخلوط نسل پیدا ہوئی جو آج تک موجود ہے۔ بعض خاندانوں کے نام یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ Raymond, De Boigne,

Perron, Bouris, Bernier, Bourguin, Dorridon, Drugeon, Dudrenec, Duprat, Fleurea, Lamarchaut, Lostinean, Le Vassoult, Madec, Claude Martin, Pedron, Pillet, Piron, Plumet Saleur.

بعض ایسے فرانسیسی خاندان جنہوں نے اُردو اور فارسی کے شاعر پیدا کئے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں :-

BOURBON, FAUTHOME, BURVET, PAISH, LEZVA LEGOIS.

فرانسیسیوں نے ہندوستانی خاندانوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کئے اس کا ثبوت حسب ذیل مثالوں سے ملے گا : De Boigne نے جو اس دور کی مشہور شخصیتوں میں سے ہے ایک مسلمان ایرانی کرنل کی لڑکی سے ہندوستان میں شادی کی۔ (۱۷۸۸ء) اس کا نام حلیمہ بانو تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کا نام ہلین بنٹ بیگم ہوگیا۔ اس کے دو بچے ہوئے ایک لڑکا ایک لڑکی۔ لڑکا ۱۷۹۲ء میں بمقام دہلی پیدا ہوا اور اس کا نام علی بخش رکھا گیا۔ لڑکی کا نام بانو تجویز ہوا۔ بچے ۱۷۹۷ء میں اپنے باپ کے ہمراہ یورپ گئے وہاں اُنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ عیسائی ہونے کے بعد لڑکے کا نام (Charles Alexander) رکھا گیا اور لڑکی کا (Anna) یہ یقینی نہیں ہے کہ (De Boigne) کی بیوی بھی اس کے ساتھ انگلستان گئی۔ (Anna) کا پیرس میں انتقال ہوگیا۔ الیکن چارلس نے بڑے ہوکر ایک فرانسیسی امیر کی لڑکی سے شادی کی جس سے اس کے اولاد بھی ہوئی۔ وہ ۱۸۳۰ء میں اپنے باپ کی جگہ Count مقرر ہوا۔

De Boigne کے بالیقین دو ہندوستانی بیویاں تھیں ایک لکھنؤ میں رہتی تھی۔ اور دوسری دہلی میں۔ ذیل کا اقتباس جو (Twining's Travels in India) سے لیا گیا ہے اس زمانہ کے فوجی جانبازوں کی زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ Twining نے ۱۷۹۴ء میں (Count De Boigne) کے فوجی کیمپ کا معائنہ کیا۔ وہ لکھتا ہے "کھانا چونکہ میز پر لگایا گیا۔ یہ بڑی حد تک ہندوستانی وضع کا تھا۔ پلاؤ کڑھی اور کئی قسم کا شوربا موجود تھا۔ اس کے علاوہ بکری اور مرغی کا بھی گوشت تھا۔ یہ کھانا ایک لمبی بڑی میز پر لگایا گیا جو ہال کے وسط میں رکھی ہوئی تھی۔ یہ ضیافت بارہ آدمیوں کے لئے کافی تھی لیکن اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے سوائے میرے اور جنرل کے کوئی اور شخص موجود نہ تھا۔" کھانے کے بعد ہاتھی پر سوار ہو کر نکلے۔ دوسرے روز صبح کو ناشتہ کے بعد جنرل نے اپنی چلم (حقہ) منگوائی۔ اس کے بعد جنرل نے دربار منعقد کیا جس میں وکیل اور معتدد آدمی جمع ہوئے۔ اور آداب و تسلیمات بجا لائے۔ اس کا چار سالہ بچہ سامنے آیا۔ جس کا کشمیری رنگ روپ تھا۔ اور جو بالکل ایک ہندوستانی شہزادہ کی طرح لباس زیب تن کئے ہوئے تھا۔ ڈی بائن کی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا حرم موجود تھا۔ لیکن اس معاملہ میں شاید (Twining) کو غلط فہمی ہوئی۔ اس لئے کہ ڈی بائن ۱۷۸۸ء میں ملکی رسوم کے مطابق شادی کر چکا تھا۔

اس قسم کی مثالوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ بہت سے فرانسیسیوں نے افتاد طبع اور تقاضائے وقت سے مجبور ہو کر ہندوستانی خاندانوں کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کئے اس طرح مخلوط آبادی میں اضافہ ہوگیا۔ اٹھارویں صدی کے آغاز سے نصف صدی تک یوریشین فرقہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ فرانسیسیوں میں نسل و رنگ کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ ڈپلے نے خود چندر نگر کی ایک کریول (Creole) کے ساتھ شادی کی ۱۷۹۱ء میں پانڈیچری میں صرف دو خاندان صحیح النسل تھے۔ ان میں سے بھی ایک خاندان کے لڑکوں نے دیسی عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں۔

اس سلسلے میں انگریزوں نے سب سے زیادہ اہم اضافے کئے، ان کا تعلق اس ملک سے زیادہ گہرا اور پائیدار تھا۔ وہ تاجر اور قسمت آزما کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے اور فاتح اور حاکم کی حیثیت سے رہ پڑے۔ یہ مسئلہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس لئے کہ برطانوی لوگ شاذ ہی ہندوستانی عورتوں کے ساتھ شادیاں کرتے ہیں۔ لیکن بہت سے ہندوستانی ایسے موجود ہیں جنہوں نے یورپی عورتوں سے شادیاں کر لی ہیں۔ اور اس طرح یوریشین آبادی میں اضافہ کیا ہے۔ شروع میں انگریزوں نے اہل آرمینا کی خدمات حاصل کیں۔ اس لئے کہ وہ ملکی زبان سے ناواقف تھے۔ مقبوضات کی حفاظت کے لئے بھی سپاہیوں کی ضرورت تھی۔ چونکہ برطانیہ سے سپاہی کم آتے تھے اور ان کے آنے میں شدید دشواریاں تھیں اس لئے سینٹ ٹھوم کے نوآباد اور نیم تربیت یافتہ سپاہی فوج میں شامل کرلئے گئے جو بالکل کرایہ کے ٹٹو تھے اور باسانی حاصل ہوسکتے تھے اس لئے کہ پرتگالیوں کا تسلط اٹھتا جارہا تھا۔ اور یہ لوگ بالعموم مخلوط نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مدراس میں یہ TOPASSES کہلاتے تھے۔ اور بنگال میں فرنگی۔ یہ لوگ اپنے گھربار کے ساتھ قلعہ سینٹ جارج مدراس میں رہنے لگے تھے۔ برطانوی کارخانوں کے گماشتے، اہل قلم، سپاہی اور قسمت آزما اپنے ملک کی عورتوں کی سوسائٹی سے محروم ہوگئے تھے۔ اس لئے انہوں نے پرتگالیوں کے ساتھ اختلاط پسند کیا۔ اکثر لوگوں میں اس طرح شادیاں بھی ہوجاتی تھیں۔ اس لئے کہ انگریز ہندوستانی عورتوں کے مقابلہ پر عیسائی خاندان کی عورت سے شادی کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ولایت سے انگریزوں کے زیادہ تعداد میں آنے کی وجہ سے ان عورتوں کی مانگ بڑھ گئی۔ اور ہندوستان میں اتنی موجود نہیں تھیں۔ اس لئے ہندوستانی عورتوں کے ساتھ زیادہ شادیاں ہونے لگیں۔ اور پرتگالیوں کے ساتھ کم۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے یہ دیکھتے ہوئے کہ کوئی صورت مفر کی نہیں ہے۔ یہ طے کیا کہ اس وقت کا سامنا کیا جائے۔ اور ۸ اپریل ۱۶۷۸ء کو صدر مدراس کو مراسلہ بھیجا۔

"ہمارے سپاہیوں کا قلعہ سینٹ جارج کی دیسی عورتوں کے ساتھ شادیاں کرنا آئندہ نسلوں کے لئے ایک ایسا اہم مسئلہ ہے کہ ہم کچھ روپیہ دے کر بھی اس کی ترغیب و تحریص کی سعی کریں گے۔ اور اگر آپ اسے ہمت افزائی کے لئے مناسب خیال فرمائیں تو ایک رقم (PAGODA) مقرر کرنا چاہئے جو اس بیوی کو ملے جس کے بطن سے بچہ پیدا ہو اور یہ رقم اسی دن دی جائے جس روز بچہ کو مسیحی بنایا جائے۔" وہ انگریز جو ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوکر آئے یا یوں ہی قسمت آزمائی کے طور پر، وہ مختلف طبقوں کے لوگ تھے۔ ان میں سے بعض بہت اونچے گھرانوں کے لوگ تھے اور بعض بہت نیچے طبقے کے۔ ان حالات میں ان کے اخلاقی معیار کا پست ہونا کچھ تعجب انگیز نہیں ہے داشتہ رکھنا اس ابتدائی زمانہ کا عام دستور تھا۔ انگریزی عورتیں ہندوستان میں کم تھیں۔ سمندر کا راستہ بھی خطرات سے پُر تھا۔ اس کے علاوہ انگریز عورتوں کے ہندوستان جانے پر پابندیاں بھی تھیں۔ جارج اول اور جارج دوم کے زمانہ میں برطانوی اخلاق بھی بہت پست اور قابل نفرین تھا۔ کرامول کی جمہوریت کے زمانہ میں جو جمہوری نظام پھیلانے کی سعی کی گئی تھی۔ اس کے خلاف ردعمل شروع ہوچکا تھا۔ جو لوگ ہندوستان آئے وہ بھی اسی گوشت و پوست کے انسان تھے۔ اس لئے اگر وہ اخلاقی اصولوں سے بیگانہ تھے تو کچھ حیرت انگیز بات نہیں۔ انہوں نے ہندوستانی یا یوریشین لڑکیوں کو گھروں میں ڈال لیا اور "داشتہ" کی طرح رکھا۔ وارن ہیسٹنگز ایک دوسرے شخص کی بیوی کی ساتھ برسوں تک رہا اور اس امیر داشتہ کے ساتھ علانیہ تزک و احتشام کے ساتھ شادی کی۔ (PALMER) نے اس کے ناجائز اور بے نکاحی لڑکوں کا فخر سے ذکر کیا ہے۔ اس قسم کی شادیاں نہایت معزز بھی جاتی تھیں اور یہ سلسلہ کم و بیش ۱۸۳۳ء تک (جب کمپنی کا چارٹر دوبارہ جاری ہوا ہے) قائم رہا۔

خواجہ احمد فاروقی

مختصر نظمیں

انسان

مَیں ہوں اِک راز بڑا گہرا راز
کردیا ہو جیسے کیچڑ کے کفن میں ملبوس ۔۔!!

تقدیر

جگمگاتے ہیں جو تاریکی میں
ان ستاروں سے عبارت ہے مقدر اپنا ۔۔ :

فلسفی

سوچتا ہوں تو خیالات بھی تھک جاتے ہیں ۔!!

شاعر عالمِ تخئیل میں :۔

یہ ستارے جو نظر آتے ہیں ۔۔ !
آسمانوں کی گزرگاہوں پر
میرے قدموں کے نشاں ہیں ضَوبار ۔۔

جبر :۔

میرے دل میں بھی ہر تلوار، دمکتی ہوئی تیغ
اپنے اندر مجھے چلتی ہوئی شمشیر نظر آتی ہے ۔

تفاوت :۔

رات کی سوچ اور دن کی سوچ
دونوں میں کتنا فرق ہوتا ہے ۔۔۔!!

اُن کو دیکھ کر :۔

اپنی باہوں میں ارگوں میں دل میں
اپنے سینے میں اور ان آنکھوں میں
پھول کھلتے نظر آتے ہیں مجھے
جسم مہکا ہُوا گلزار بنا جاتا ہے ۔۔۔

آنکھ مچولی :۔

تمتماتے ہوئے چہرے سے وہاں ہے سُورج
چاند آ ہی نہیں سکتا ہے مگر پاس اس کے

لوگ :۔

لوگ نادار کی رُسوائی کبھی بھُولتے ہیں
اور جب بھولتے ہیں ، اُس کو کبھی یاد نہیں کرتے ہیں ۔

زندگی :۔

اگر خیال و عمل پر نہ قید ہو کوئی
تو زندگی کا تقاضا ہے ۔ جی لیا جائے ۔۔

محمود جالندھری

ٹیکہ ٹنی

دُولہا منڈل پر کھڑا ہے۔ اوپر کمرے میں دُلہن کا سنگار ہو رہا ہے۔ رینڈ تانیاں رسیلی تانوں میں ناقابلِ فہم گیت گا رہی ہیں۔ آنگن میں براتی ہیں۔ محلے بھر کے لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ پروہت اور بھیک منگے ہیں۔ کچھ اُن میں سے خوش ہیں۔ کچھ مغموم ہیں اور کچھ حیران و پریشان، ایک لڑکی بیاہی جاکر وداع ہو رہی ہے۔ اُس کے ماں باپ رحم جُو یا نہ نظروں سے دُولہا اور دُولہا کے براتیوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں "آج تک یہ لڑکی ہماری تھی۔ اب تمہاری ہوگئی ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہ دینا، جہیز اور کرم کے لئے تنگ نہ کرنا۔ یہ بڑی فرماں بردار بیٹی ہے۔ تمہاری سیوا ٹہل کو اپنی سعادت سمجھے گی۔ اور سارا جسم تمہارے چرنوں میں گذار دے گی۔"

آج تک یہ لڑکی زندگی کے جس ڈگر پہ چل رہی تھی۔ وہ شادی کے دوارے پر ختم ہوگیا۔ اب دُوسری شاہراہ کی ابتدا ہے جس پر ماں باپ کا اختیار نہیں۔ صرف اُن کی دعاؤں کا سایہ پڑتا ہے۔ نئے ساتھی کا پیار ہوتا ہے محبت ہوتی ہے، قہقہے ہوتے ہیں۔ زندگی اگر صرف یہیں ختم ہوا کرتی۔ تو یہ شاہراہ ابتدا سے انتہا تک حسین اور جوان نظر آتی — لیکن جُوں جُوں یہ لمبی ہوتی جاتی ہے۔ اس پر سنجیدگی، متانت اور فرض چھا جاتے ہیں۔ اور ابتدا کے قہقہے کہیں کہیں آنسوؤں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اور کہیں کہیں پاتال تک چلے جاتے ہیں۔ اور پیار میں تھامی ہوئی باہیں اکثر ڈھیلی پڑتی ہیں۔

مُسلمان عورتیں —— بوڑھی اور نوخیز —— آنگن کے ایک طرف پیار اور حیرت کے زیرِ اثر گا رہی ہیں — آنکھیں منڈل پر کھڑے دولہا کو دیکھ رہی ہیں اور تصوّر سنگار ہوتے والی دُلہن کے اُس بچپن پر منڈلا رہا ہے۔ جو آج کے تھرتھراتے ہوئے سُورج کے نکلتے ہی ختم ہوگیا۔ کل کی ٹھوکری پیار اور محبت، فرض اور رسُوم سے بے خبر آزاد گلہری کی طرح دھان کے منڈیروں پر ناچتی تھی۔ گاتی تھی۔ گاؤں کی کچی سڑک سے آنے والی بر برات کو دیکھ کر ہنستی تھی اُن کا منہ چڑاتی تھی۔ آج پرائے مرد کے ساتھ اُسی کچی سڑک سے جا رہی ہے۔ اپنے ماں باپ سے وداع ہوکر، اپنی سہیلیوں سے منہ موڑ کر، اور دھان کی پیاری پیاری منڈیروں کو بُھلا کر، وہ ندی کے پار اُس کے دُولہا کا گھر ہوگا۔ جہاں اُس کی ساس، نند اور دیور اُس کا انتظار کرتے ہوں گے۔ ندی کا پانی دودھ کی طرح میٹھا ہے۔ لیکن دل پتھر کی طرح سخت، یہ آس پاس کے گاؤں کی ہر لڑکی کو بچپن سے، ماں باپ سے، کھیتوں سے جُدا کرتی ہے۔

دُلہن کا سنگار ہو رہا ہے۔ اور مسلمان عورتیں آنگن میں گا رہی ہیں ؎

سٔرگن دتھے مشکہ کوٗرو   عیشقہ بمبُرد لیلہ آ خو

منڈل پر عشق کا بھنورا کھڑا ہے۔ بھنورے کی لیلیٰ کا سنگار ہو رہا ہے اور لیکھ کا دھاگا پروہت نے پوتی سے رازدارانہ لہجے میں کہتا ہے ٹیکہ ٹنی۔ جب تیرا دُولہا میرے آنگن میں ہوگا .... اس سے آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اُس کے ذہن کا جھران

ے بہم گلدپر تھپات علاقہ مشک کا نور جھارہ ہی۔ آے عشق کے بھنورے کیا تو اپنی لیلیٰ کو لینے کے لئے آگیا؟

دیکھتی ہے۔ شاید سوچتی ہے۔ یہ ان جانا
بھی جاتا ہے۔ اور نور بن کی ٹیکہ مٹی منڈل پر کھڑے تین صورت بھونرے کو حیرت سے دیکھتی ہے۔ شاید سوچتی ہے۔ یہ ان جانا آن دیکھا دولہا کہاں سے آ گیا؟ اس کی ٹھیری کو چھین کرلے گیا؟ ہماری سہیلی اسے دیکھ کر روتی کیوں نہیں؟ اُس کے ماں باپ نے اس پرائے مرد کو گاؤں سے بھگا کیوں نہیں دیا؟ وہ اپنے بوڑھے دادا کی بات غور سے سنتی ہے "ٹیکہ مٹی جب تیرا دولہا میرے آنگن میں ہو گا ...." وہ یہ سننا چاہتی ہے کہ پھر کیا ہو گا لیکن دادا اس سے آگے کچھ نہیں کہتا۔ وہ اوپر دیکھتی ہے۔ جہاں دلہن کا سنگار ہو رہا ہے۔ اور رنگا رنگ پوشاک میں ملبوس پنڈت تاناں کھڑکیوں میں ایک دوسری کے اوپر جھکی ہوئی دولہا کو دیکھ رہی ہیں۔ اور وہ دن یاد کر رہی ہیں۔ جب اُن کا دولہا بھی اسی طرح آنگن میں منڈل پہ کھڑا تھا۔ اور مسلمان عورتیں ایک ساتھ گا رہی تھیں ؎

عشقہ بنبورد سیلہ آخو
سرکن دنفرسے تنکہ کو فورد

وہ اُس دن کسی قدر لرز رہی تھیں۔ ہر آہٹ پر چونکتی ہو جاتی تھیں۔ لیکن جب وہ سسرال پہنچیں اور انہوں نے اپنے نئے ساتھی کو دیکھا۔ تو اُن کا سارا خوف جاتا رہا۔ انہیں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ساتھی کو جنم جنم سے جانتی تھیں۔ اگر بچپن ختم ہوتے ہی اُن کے ماں باپ بھونرے تلاش کر کے نہ لاتے۔ تو اُن کی زندگی کتنی پھیکی اور بدمزہ ہو کر رہتی۔

گیت بدستور شور و شر کے ماحول میں گونجتا رہتا۔ ان گیتوں کا کیا مطلب ہے۔ یہ ٹیکہ مٹی نہیں جانتی۔ البتہ اُس کا بوڑھا دادا جانتا ہے۔ اُس کی آنکھیں مسکرا رہی ہیں۔ بھاری بھر کم جسم جھوم رہا ہے۔ نمدار سپید مونچھوں سے ڈھکے ہوئے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ ہاں یہی زندگی ہے۔ یہی ایک لڑکی کی جنت ہے۔ کہ اُس کے ماں باپ اپنی پیاری بیٹی کے دولہا کو اپنے آنگن میں منڈل پر کھڑا دیکھیں۔ اور کانوں سے بھونرے اور پھول کا دلنواز گیت سنیں۔ اُسے اپنا بیٹا یاد آ گیا۔ جو آج سے چار سال پہلے اُسے داغِ مفارقت دے گیا تھا۔ اور اُس کے بوڑھے کاندھوں پر ٹیکہ مٹی کا بوجھ ڈال گیا تھا۔ آج وہ زندہ ہوتا۔ تو کبھی گاؤں میں آنے والی ہر برات کے پیچھے پیچھے اپنی پوتی کو لے کر چاول کے چند لقموں اور ٹکے کے چند پیسوں کی خاطر نہ آیا کرتا۔ وہ برہمن ہے اور بہ دست جو ہر اشٹمی کو کھیر بھوانی میں تانبے کے چند چھوٹے چھوٹے برتن پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے ٹیکہ مٹی چندن گھستی ہے۔ دادا یاتریوں کو ٹیکا کرتا ہے اور جب پیسے بانٹنے کا موقع آتا ہے۔ تو ٹیکہ مٹی کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے "اسے بھی دو مہاراج۔ یہ میری اکلوتی پوتی ہے۔ اور بھگوتی کی پجارن" سارا دن یہیں بیٹھ کر وہ کچھ روپے بنا لیتا ہے۔ اور پھر پوتی کے مستقبل کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ ایسی برات اُترے گی۔ کہ گاؤں میں نام رہ جائے گا۔ اتنے گہنے بنوا دوں گا۔ کہ ہر لڑکی تکتی رہ جائے گی۔ یکایک اُس کا خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک شخص اپنے ساتھی سے پوچھ رہا ہے "یہ لوگ دلہن کو کیوں نہیں لاتے۔ دولہا منڈل پر کھڑا تھک گیا ہے" بوڑھا بے وجہ ہنستا ہے۔ اور پوتی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر لاڈ بھرے لہجے میں کہتا ہے "سنتی ہو۔ کہتے ہیں دولہا منڈل پہ کھڑا تھک گیا۔ دلہن کو لے آؤ"

"کہاں لے جائیں گے اسے دادا؟"

"اپنے گھر بیٹی۔ وہاں ندی کے پار ......"

"کیوں دادا۔ اب وہ ہمارے ساتھ نہیں کھیلا کرے گی؟"

بوڑھا زور سے ہنستا ہے "کھیل کود کا زمانہ بیت گیا بیٹی۔ کرم دھرم کرنے کے بعد لاش اور دلہن کو گھر میں نہیں رکھنے دیا جاتا۔ یہی مریادا ہے۔ آج تک وہ ہماری بیٹی تھی۔ اب کسی کی بہو بن گئی۔ کسی کی دھرم پتنی۔ کسی کی نند، اور کسی کی بھاوج

اب وہ عورت ہے بیٹی ——— عورت ——— مگت جننی جس نے رام کو جنا ..... تمہیں اور مجھے جنا ......"

ٹیکہ بنی حیران رہ گئی۔ ہماری گھڑی ایک ہی پل میں اتنی بڑی عورت بن گئی۔ وہ دادا کے قریب آکر اسے حیرت اور خوف کی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"لیکن دادا تم مجھے بھی عورت بنا دو گے؟"

دادا ہنس کر کہتا ہے "میں تمہیں بنا دوں گا۔ بیٹی۔ زندگی بنا دے گی۔ زمانہ بنا دے گا۔ ہر بیٹی کو یہی عورت بنا سکتے ہیں اور پھر رام اور بدھ اس سے مانگتے ہیں۔ یہی یہی ......"

"لیکن میں ندی پار نہیں جاؤں گی دادا ——— ان براتیوں کے ساتھ جو رنگا رنگ پوشاک پہن کر آتے ہیں۔ اور گاؤں کی لڑکیوں کو ڈولی میں بند کر کے لے جاتے ہیں ....‟

"تو نادان ہے ٹیکہ بنی۔ ہر لڑکی کو سسرال جانا ہی پڑتا ہے اور پھر ہم براہمنوں کی لڑکیاں اپنے ماں باپ کے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ ہم برہمن اُتم ہیں۔ ودیا پڑھنے اور پڑھانے والے، دان دینے اور لینے والے، لیکن تمہیں ڈر کاہے کا؟"

ٹیکہ بنی انہی متحیر نگاہوں سے دور بہنے والی خاموش ندی کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔ اور سوچتی ہے "کیا یہ ندی چھوٹ جائے گی۔؟"

دادا اس کا مطلب تاڑ لیتا ہے۔ اس کے بے ترتیب اور میل سے اٹے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے "یہ ندی اسی طرح بہتی رہتی ہے بیٹی۔ یہ گاؤں کی لڑکیوں کو ہم سے جدا بھی کرتی ہے۔ لیکن ان کی جگہ نئی لڑکیوں کو بھی تو لاتی ہے لیکن جب تو چلی جائے گی۔ تیری جگہ ...... نہیں کچھ بھی نہیں ......" اس کی آنکھوں میں آنسو کے دو قطرے چمکتے ہیں۔ "کاش ٹیکہ بنی تیرا ایک چھوٹا سا بھائی بھی ہوتا۔ جس کے لئے میں ندی پار سے چاند سی دلہن لاتا۔ اور مرنے کے وقت تانبے کے سارے برتن اس کے حوالے کر کے کہتا: لو بیٹا اپنے دادا کی پونجی۔ جب اشٹمی آیا کرے۔ تو کھیر بھوانی کے چشمے پر انہیں سلیقے سے پھیلا دینا۔ اور ججمانوں سے کہنا: دادا چل بسے ججمان۔ اور ٹیکہ بنی بیاہی گئی۔ اب سارے پیسے مجھے دو۔ میرے گھر میں ندی پار سے لائی ہوئی چاند سی دلہن بھی ہے"

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی دادا۔ میرے بعد تمہارے پاؤں کون دھویا کرے گا۔ بستر کون بچھایا کرے گا اور پوجا کے برتن کون صاف کیا کرے گا ......"

بوڑھا زہر خند کر کے کہتا ہے: "میرا کیا ہے بیٹی۔ میں پر دیسی ہوں ایک اور تم براہمن، جہاں جاؤں گا، وہاں سے بیٹھوں گا۔ اور پھر دنیا اسی طرح چلتی رہتی ہے۔ لڑکیاں بیاہی جاتی ہیں۔ بوڑھے مر جاتے ہیں۔ اور دروازوں میں تالے پڑ جاتے ہیں ...... کہیں اجڑے گھر بس جاتے ہیں اور کہیں بسے ہوئے گھر اجڑ جاتے ہیں ......"

"لیکن میں پھر بھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی دادا ———"

"ارے ابھی سے کیوں گھلی جاتی ہو۔ ابھی چھ برس کی بات ہے۔ جب مجھے تمہارے لئے دولہا دیکھنا ہوگا۔ ایک چاند سا دولہا ......"

ٹیکہ بنی کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔ اور بڈھا بھی۔

"شنا" پہننے کے بعد دلہن کو سر سے پاؤں تک شال میں لپیٹ کر لے گیا۔ اور دولہا کے اپنی طرف سے شال پہنا دیا

گیا۔ دلہن جھکی رہی۔ اور دولہا سفیدے کی طرح اکڑا رہا۔ . . . . لیکن آزاد گلہری! تو بھی سیدھی کھڑی ہو جا۔ ورنہ عمر کا یہ غم زندگی بھر نہیں نکلے گا۔ کل تک تو ایک بے خبر چھوکری تھی۔ لیکن آج تو عورت ہے۔ آج زمانے نے تیرے سر پر ایک چمکتا ہوا تاج رکھا ہے وہ تاج جس کی جگمگ کرنے والی روشنی میں مرد زندگی کے ڈگر پہ ٹھوکر کھائے بغیر چلتا ہے۔ آج تو اس رشتے میں پرو دی گئی۔ جس کے مردانے کی حفاظت کرنا تمہارا ایمان ہے۔ آج قدرت نے تمہارے حسن اور شباب کی قیمت ادا کر دی۔ اور اس کا حق چکانے کے لئے تمہیں ایسے بیٹوں کو پیدا کرنا ہے۔ جو انسان بھیس میں لٹیرے نہ ہوں۔ سیدھی کھڑی رہو میری گلہری! اور دنیا سے سربلند ہو کر کہہ۔ "مجھے یہ ذمہ داریاں منظور ہیں"۔ لیکن دلہن بڑی ضدی معلوم ہوتی ہے۔ وہ نئی زندگی کو، نئے رشتے کو، نئے ساتھی کو جھک جھک کر نمسکار کرتی ہے۔ اور سیدھی کھڑی نہیں ہوتی۔ اس کے بدن کا دایاں حصہ دولہا کے۔ ساتھ چھو رہا ہے۔ جو اپنے بدن میں برقی رو سی محسوس کرتا ہے۔ ایک ایسا تناؤ جس کی تسکین نہ پنڈتانیوں کے ناقابلِ فہم گیتوں سے ہو سکتی ہے نہ مسلمان عورتوں کے دردناک گانوں سے۔ وہ اس منڈل سے پر لگا کر اڑنا چاہتا ہے اپنی دلہن کو ساتھ لے کر۔ جسے ابھی تک اس نے دل کھول کر بھی نہیں دیکھا جس کے مزاج سے، خیالات سے، عادات سے وہ ابھی واقف نہیں۔ لیکن اس بات کی ضرورت بھی کیا تھی۔ جب کچھ بھی نہیں ملے گا۔ وہ اسے چھوڑ کر۔ یہی شادی کہلاتا ہے۔ اسے ٹوکنے والا کون ہے۔ فرض اور ذمہ داریاں، تاج اور رشتے، حق اور قیمت سب کچھ لڑکیوں کے لئے ہے جو شاید اسی لئے نیم دائرے بن کر منڈل پر کھڑی زندگی کے نئے ڈگر پہ قدم رکھتی ہیں۔ کہ پاک منتروں سے ان کے جسم و جان کا ان بھیا مالک انہیں کہیں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔

بوڑھا یہ سب منظر دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہے اس کی آنکھوں میں آج سے چھ برس بعد ہونے والا واقعہ پھر رہا ہے ٹیکہ ٹینی کا دولہا منڈل پر کھڑا ہے۔ مسلمان عورتیں آنگن میں گیت گا رہی ہیں ؎

سڑکن دریغے مشکو کو فرد   عشقہ مجنو نو لیسہ آخو

ٹیکہ ٹینی شال میں لپٹی ہوئی نیم دائرہ بنا کر انگور کی بیل کی طرح لرز رہی ہے۔ اور اندر ہی اندر دبی آواز میں دادا سے کہہ رہی ہے "میں نہیں جاؤں گی دادا۔ مجھے مت جانے دو۔" دادا کی روح اپنی آغوش کھول کر اسے چھپانا چاہتی ہے۔ اُسے اس وقت اپنے الفاظ یاد آ رہے ہیں۔ جو آج سے چھ برس پہلے اس نے معصوم ٹیکہ ٹینی کو گاؤں کی ایک لڑکی کے وداع ہونے پر کہے تھے۔ "تو نادان ہے بیٹی۔ ہر لڑکی کو سسرال جانا ہی پڑتا ہے۔ اور کرم دھرم کے بعد لاش اور دلہن گھر میں نہیں رہ سکتے . . . . . . لیکن تو لاش نہیں۔ تو آج سے جگت جننی ہے۔ زمانے نے جو فرائض تم پر عاید کئے۔ ان کا حق ادا کرنا بیٹی۔ اسے رام اور بدھ دینا۔ انسان کے بھیس میں لٹیرے نہ دینا۔ اسی سے میں لازوال ہوں گا۔ اور تیری نسائیت جاوداں ہو کر رہے گی۔ . . . . . . " بوڑھا سب کی نظریں بچا کر اپنے آنسو پونچھ ڈالتا ہے۔ "یہ آنسو بہانا اس وقت بُرا شگون ہے برہمن۔ اپنی لڑکی کو آشیرواد دو۔ تمہاری جبیں خالی سہی، گھر اجڑا ہوا ہی سہی، لیکن تمہارے دل میں آشیرواد تو ہے۔ دیو اسے دے دو۔ اس بن ماں باپ کی بیٹی کو جس نے پندرہ برس تمہارے پاؤں دھوئے۔ برتن صاف کئے اور بستر بچھایا۔

بوڑھا اپنے منطقی وجود سے برسرِ پیکار ہے۔ یہ بن ماں باپ کی بیٹی نہیں۔ اس کی ماں میں ہوں۔ باپ میں ہوں بھائی

میں ہوں۔ اسے بن ماں باپ کی بیٹی کہہ کر میرے زخموں کے ٹانکے مت کھولو۔ آج منڈل پر ڈولی دیکھ کر ان بند ٹانکوں سے آہستہ آہستہ خون رسنے لگا ہے۔ لیکن تم سارے کے سارے ٹانکے مت کھولو۔

"دنیا ایسے ہی چلتی ہے برہمن۔ خون میں بُو ہوتی ہے جو جس کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اُسی کا ہوتا ہے۔ تم سب کچھ ہو کر بھی صرف دادا ہی ہو سکتے ہو۔ منڈل پر اس کا دُولہا کھڑا ہے ڈولی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اُسے آشیرواد دو۔ کہ جو چیز اسے تمہارے گھر میں نہ ملی۔ وُہ اپنے خاوند کے گھر سے حاصل کر سکے؟"

"میں نے اسے سب کچھ دے دیا میری اُتمار لیکن گہنے اور کپڑے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا بیٹا —— وُہ پھل والا بوٹا ۔ ۔ ۔ ایک بیج جو تیش میرے حوالے کر کے سُوکھ گیا۔ میرے پاس جو کچھ تھا سے دیا۔ گوجا کے برتن، میلا بچھونا، کھٹا میں آنسو ہوئے کپڑے، اور یہ گھر ۔ ۔ ۔ یہ اب سب مجھے کس کام آئے گا۔ جب گھر کی رُوح ہی ڈولی میں بند ہو کر چلی جائے گی۔ تو ڈھانچے کو سنبھال کر میں کیا کروں گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

آنگن میں گہما گہمی ہوتی ہے۔ گیت اُونچے سُروں میں گونجنے لگتے ہیں۔ ٹیکہ مٹی دُلہن کے قریب جا کر اُسے دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن وُہ شال میں لپٹی ہوئی ہے۔ وُہ دُولہا کو خوف اور حیرت سے دیکھ رہی ہے۔ شاید پوچھنا چاہتی ہے تم میری گلہری کو کیوں لے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ جو تُو ایک جماعت ساتھ لا کر اسے لے بھاگا۔ کیا ندی پار تمہیں کوئی ایسی لڑکی نہ ملی۔ جسے تو اپنی دُلہن بنا سکتا۔؟"

وُہ پھر حسین و جمیل منڈل کو دیکھنے لگی۔ جو ہلدی، چونے اور سات رنگوں سے بنایا گیا تھا۔ اور جس کے نقش و نگار پر چار پاؤں —— دو مضبوط دو نازک —— زندگی کے نئے ڈگر پر چلنے کے لئے اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ پاؤں سب سے پہلے اس ہلدی اور چونے والے منڈل پر پڑتے ہیں۔ پھر ایک ساتھ اُٹھتے ہیں۔ چلتے ہیں۔ اور چلتے رہتے ہیں۔ منڈل کے نقوش مٹ جاتے ہیں۔ لیکن اُن نقوش کا طلسم نہیں ٹوٹتا۔ ٹیکہ مٹی اپنے پاؤں دیکھتی ہے۔ غلیظ اور گرد و۔ آج کتنے ہی دنوں سے وُہ اس آنگن میں گھومتی رہی۔ کبھی چاولوں کے لئے۔ کبھی بھات کے لئے، کبھی چائے کے لئے اور کبھی پیسوں کے لئے جبھی یہ اتنے میلے ہیں۔ لیکن ان پاؤں کے ساتھ کس کے دو پاؤں اور ملیں گے —؟ مضبوط سے پاؤں —— وُہ سوچتی ہے اور دادا اُسے دُور سے بُلا رہا ہے "ٹیکہ مٹی —— او ٹیکہ مٹی!"

"کیا ہے دادا —؟" ٹیکہ مٹی دوڑ کر پوچھتی ہے۔

"یہیں رہو بیٹی —— اب ہماری تمہاری باری ہے۔"

"کیوں دادا —— کیسی باری؟"

"پگلی اب دُولہا اور دُلہن کے سر پر پیسے اور روپے، آنے اور دونیاں پھینکی جائیں گی۔ جتنی ہاتھ آئیں۔ اُٹھانا۔"

"لیکن دادا ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ۔ ۔ اور پھر پیسے اور دونیاں۔؟"

"یہ سارا جگت کپٹی ہے بیٹی۔ اور یہ پیسے پھینکنا بھی کپٹ ہے۔ یہ لوگ ہمیں دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم مالدار ہیں۔ مالدار ۔ ۔ ۔ لیکن بیٹی سب سے بڑا مال پیار ہے۔ جو اس طرح پھینکا نہیں جاتا۔ اور جب تمہارا دُولہا میرے آنگن میں آئے گا ——"

"تب کیا ہوگا دادا" ہلدی معصومانہ انداز میں بڑے اشتیاق سے پوچھتی ہے۔

"تو سُنے گی ـــ سُننا چاہتی ہے" بوڑھا ہنسکر کہتا ہے۔ "میں تم پر پیار کی ورشا کروں گا۔ جو آج تک کسی نے نہیں کی ہے۔ پیسے میٹھے اُٹھاتے ہیں۔ پیار دیوتا لے جاتے ہیں۔ اور پھر ہم براہمن ہیں۔ اُو تم پُروہت ....."

براتیوں میں سے ایک خوش پوش نوجوان نے رومال کا مُنہ کھولا۔ بوڑھے نے اُسے دیکھکر اپنی زبان ہونٹوں پر پھیری۔

"اب تیار رہنا بیٹی۔ میں اپنی چادر پھیلاؤں گا۔ تم دامن پھیلانا۔ اور پھر سبکے سب پیسے ...... ہی ہی ہی۔" بوڑھے نے کہا دونوں ہنسنے لگے۔ رام کرے اس رومال میں بندھے ہوئے سارے پیسے اور روپے اٹھنے اور دونیاں اُن کی چادر اور دامن میں آ آ کر گریں۔

جب شنکھ بجنے لگے۔ اور کھڑکیوں میں ایک دوسری پر جھکی ہوئی ہندوستانیوں نے پھولوں کی ورشا کی۔ خوش پوش نوجوان کا ہاتھ ہوا میں لہرانے لگا۔ اور دولہا اور دولہن کے سر کے اوپر سے اُڑ اُڑ کر سکے گرنے لگے۔ اور اُن کے ساتھ ہی مسلمان عورتیں بھک منگے اور بچے اُن پر بھوکے پرندوں کی طرح جھپٹنے لگے۔ آنگن میں ایک شور سے ہنگم اُٹھا۔ جس میں بوڑھا پُروہت اور اُس کی معصوم پوتی چادر اور دامن پھیلائے گُم ہو گئے۔ پھر اُبھرے پھر گُم ہو گئے۔ بوڑھا جُوں جُوں سکے اُٹھاتا جاتا تھا۔ اُس کی زبان سے بے اختیار دعائیں نکلتی تھیں: "سدا سکھی رہو۔ جگت جننی ہو۔ سدا سُہاگ وتی رہو۔ جگ جگ جیو ......"

جب آنگن خالی ہو گیا۔ اور مسلمان عورتیں، بھک منگے اور بچے اپنے پیسے الگ الگ گننے لگے۔ تو دادا اور پوتی ایک دوسرے سے ملے۔

"کتنا ملا ہے؟" بوڑھے نے ہنسکر پوچھا۔

پوتی نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں ایک چھوٹا سا زرد سکہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ"

بوڑھے کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ "مرتے ہو۔ کمینی! اتنی مایا میں سے صرف ایک ٹکہ؟"

ٹیکہ ٹھیکی نے رونی صورت بناکر کہا۔ "جب میں پھینکنے والے کی طرف دامن پھیلا کر جاتی تھی۔ تو وہ دوسری طرف مُنہ کرکے سکے پھینکتا تھا۔ اور جب اُس طرف بھاگ جاتی تھی۔ تو تیسری طرف پھینکتا تھا ......"

بوڑھے کا غصہ اور تیز ہو گیا۔ اُس کا سارا جسم پھڑکنے لگا۔ اُس نے بے اختیاری کے عالم میں پوتی کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔

"رذیل لڑکی۔ براہمن لڑکی ہو کر تم اُس کے پھینکنے کی طرف دیکھتی رہی ...... کل کو جب تیرا دولہا آئے گا ..... تب ...."

ٹیکہ ٹھیکی اُسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ شاید پوچھنا چاہتی تھی۔ تب کیا ہوگا۔ لیکن بوڑھا غصے سے کانپ رہا تھا۔ اُس کے حلق میں جیسے ہڈی اٹک گئی تھی۔ وہ اُن راستوں کو دیکھ رہا تھا۔ جن پر دولہا کی سواری، بند ڈولی اور خوش پوش براتی قہقہے لگاتے ہوئے، سگریٹ پیتے جا رہے تھے۔ دفعتاً اُس نے پوری شدت کے ساتھ کہا۔ "بدمعاش کہیں کے ـــ لفنگے ......"

پریم ناتھ پردیسی

بدصورت دُلہن

(قبلِ مسیح کی ایک چینی نظم)

مَیں نہ پہنوں گی کبھی،
ریشم و اطلس و کمخواب کا زرتار لباس۔
میری قسمت میں یہی ہے کہ مَیں دوشیزہ رہوں،
مجھے رہنا ہے ہمیشہ تنہا۔

عُمر کر دے گی مرے بال سفید....
میری پیشانی پہ لکھا ہے کہ:۔
"ہرگز ہرگز
اِس کے گھر میں نہیں آئے گی کبھی
خوبصورت کسی دولہا کی برات"

جان کر مَیں نے نہیں سیکھا ہے
کیسے ابرُو کو بناتے ہیں کٹار؟
کیسے آ جاتا ہے چہرے پہ نکھار؟
لڑکیاں ہونٹوں کو کیسے ہیں بناتی گُلنار؟

عُمر بھر آہ مجھے سینے ہیں
دُلہنوں کے لئے زرتار لباس
پر سیوں گی نہ کبھی اپنے لئے
کوئی محرم کوئی زرتار لباس۔

(ترجمہ تاؤسی)

راجہ مہدی علی خاں

"ایاز"

آخرکار اس نے سماج سے سمجھوتا کر ہی لیا —— اس کی بے قرار فطرت پر تہذیب و تمدن کی ایک چادر ڈال دی گئی۔ اب وہ نہایت آرام سے زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھنے لگا —— جہاں اس کی زندگی کے دن بھر اپنی مرضی کے خلاف ضمیر پر بوجھ ڈال کر کلرکی کرتا۔ مذہب کے نام پر روپیہ پیسہ مانگتا اور پھر جب خدا کے دین کی نصرت کیلئے دھڑا دھڑ روپیہ آنے لگتا تو راتیں ہیں جس کے حصے صرف مقصد آتا کہ وہ اس سے نہ زندہ رہے۔ اور نہ مر سکے تو اس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا —— وہ سوچتا اس کی موت کیوں نہ آ گئی جو اسے دن رات بے چین کئے رہتی۔ اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کیلئے اس نے فرار کی راہ نکالی —— فطرت کی دنیا بھر کی رعنائی اسے منظور تھی لیکن جو چیز اس کی طاقت سے باہر تھی۔ وہ تھا عذاب۔ ذہنی عذاب —— وہ زندگی سے لڑ سکتا تھا۔ یہی اس کا مقصد تھا۔ وہ روزانہ وار زندگی سے مقابلہ کرنا چاہتا —— اس نے برسوں اس کا مقابلہ کیا مگر جس بات پر اس کی ہمت اسے جواب دے گئی۔ وہ تھا ذہنی عذاب ——

فرار ہی اسکا علاج تھا۔ ورنہ شاید وہ تپ دق یا کسی ایسے ہی موذی مرض کا شکار ہو کر چل بسا ہوتا —— اس کے تین چار ساتھی بھی تو تپ دق ہی سے مر گئے تھے۔ عین جوانی کے عالم میں انہیں موت نے دبوچ لیا تھا۔ یہ بھی درست تھا کہ وہ شہید تھے، خدا کی راہ میں جہاد کرتے کرتے انہوں نے جان دے دی۔ شہادت کا مرتبہ کتنا بڑا مرتبہ تھا —— ان کے مرنے کے بعد ان کے گھرانے تباہ و برباد ہو گئے —— مگر وہ تو شہید تھے، زندہ تھے انہیں مردہ کہنا گناہ تھا —— انہیں شہید کا مرتبہ دینے والا وہ شخص جس کی آواز گنبد سے گونجا کرتی تھی۔ جب ایک بار بیمار ہوا تو زمانے بھر کے ڈاکٹر اس نے اپنے گرد جمع کر لئے۔ اس کی زندگی بڑی بیش قیمت تھی۔ ایک گستاخ مرید کا خیال تھا کہ وہ موت سے خائف تھا۔ بہرحال وہ تو یقیناً موت سے ڈرتا تھا۔ چنانچہ اس نے تپ دق کا علاج ڈھونڈ لیا جو اسے دوا دینے کیلئے اس نے پتا غم کا غذ پر پھیلانا شروع کر دیا —— اس کی صحت بحال ہونے لگی۔ لوگ حیران تھے کہ وہ کیوں روز بروز صحت مند ہوتا جا رہا تھا۔

یہ علاج اسے مہنگا پڑا۔ وہ راتوں جاگا کرتا۔ دن بھر وہ کام کرتا۔ مشقت بھرا کام۔ عذاب سہتا۔ پھر جب عذاب کی انتہا ہوتی تو یکایک اس پر ایک حالت طاری ہو جاتی۔ کہتے ہیں خدا نے رات آرام کیلئے بنائی۔ یہی وہ وقت ہے جب تخلیقی قوتیں بروئے کار آتی ہیں۔ اس کیلئے رات اپنے ساتھ بے پناہ خیالات کا ہجوم لاتی۔ رات کی خاموشی میں وہ لیٹا سوچا کرتا کہ اسے اپنے ماحول سے کیسے بغاوت کرنی چاہئے —— پھر بغاوت کے مختلف پہلو اس کے سامنے آ جاتے۔ تخلیق آدم سے قصہ شروع ہوتا۔ شیطان نے بغاوت کی۔ اس کا انجام؟ جنت سے نکالا گیا۔ آدم سکون سے بہشت میں آرام فرما رہے تھے کہ انہیں شیطان نے بہکایا۔ پھر آدم بھی شیطان کی طرح سرگرداں ہونے لگے —— اس کا انجام —— دنیا بنی، اولاد آدم دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک جنت کی طرف بلانے والے دوسرے دنیا کی طرف، وہ خود اس طرف تھا جو جنت کی طرف بلاتے ہی نہیں تھے۔ بلکہ جنت فروخت بھی کرتے تھے۔ جنہوں نے دنیا میں ایک ایسا قطعۂ زمین بنا رکھا تھا۔ جہاں دفن ہونا جنت کی ضمانت تھا۔ مگر جب وہ اپنی حالت کا اندازہ کرتا تو اسے سکون اور اطمینان کی جگہ مایوسی اور بے نوائی نظر آتی۔ دنیا والے شیطان کے پیرو تھے۔ باغی تھے دنیا ان کی تھی۔ ان کی طاقت کے سامنے جنت والے جھکتے تھے۔

وہ بھی بغاوت کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس کی راہ میں رکاوٹوں کے پہاڑ تھے۔ اٹل پہاڑ —— اس نے دیکھا کہ رکاوٹوں میں جنت والے لوگوں کا کتنا ہاتھ تھا۔ ایک رات جب وہ اپنی حالت پر رو رہا تھا۔ اور وہ آنسو الفاظ بن کر اس کے سامنے کاغذ پر ناچنے لگے۔ تو اس نے دیکھا کہ وہ الفاظ نہیں بلکہ چند حسین لڑکیوں کے سراپا ہیں جنہیں اس نے مسجد کی گیلری میں دیکھا تھا۔ منبر پر حور و جنت کا دلفریب قصہ بیان کیا جا رہا

تھا۔ اُس کی نگاہیں گیلری پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں چار سفید ہاتھ سیاہ پردے کے ایک کونے کو ہٹانے میں مصروف تھے۔ پھر اُس نے دو چہرے دیکھے۔ یہ چہرے اُس کے ذہن پر نقش ہو گئے۔ رات کے سناٹے میں وہ بے قراری کے عالم میں تڑپ رہا تھا۔ اُس کا ضمیر اُسے ملامت کرنے لگا۔ وہ دھوکا کھا رہا تھا۔ وہ فریب خوردہ تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ اس فریب سے نکل بھاگے۔ مگر اس نے محسوس کیا کہ اس کے چاروں طرف بڑا جال بُن دیا گیا تھا۔ اچانک اُس کے سامنے دو سفید چہرے نمودار ہوئے۔ ایک سیاہ پردہ، ضمیر پر خورد قصور کا قصہ۔ رات کا سناٹا۔ تخلیق کی قوتیں بیدار تھیں۔ وہ چونکا اُسے اپنی مایوسی کا احساس ہونے لگا۔ وہ رو دیا اور پھر نہ جانے اس نے کیا لکھا۔

جب اس کا افسانہ ایڈیٹر کے پاس پہنچا۔ تو اُسے پسندیدگی کا خط ملا۔ مگر جب افسانہ شائع ہوا تو حکومت کے محکمۂ احتساب نے اُسے عُریاں قرار دیا ـــــ عریانی؟ وہ سوچنے لگا۔ اُس نے کبھی عُریانی کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔ وہ تو اس کی مجبوری کی تصویر تھی۔ وہ کیسے یقین دلائے کہ اس کے دِل کے زخم اِن الفاظ سے سکون پاتے تھے۔ یہ عریاں الفاظ نہ تھے بلکہ جلتے ہوئے دل پر پھاہا تھا ـــــ اس نے پھر بغاوت کرنی چاہی مگر اُسے جب معلوم ہوا کہ اُس کا نتیجہ جیل کی کوٹھڑی ہوگی۔ جہاں نہ جانے کتنے نوجوان موت کا شکار ہو گئے تھے۔ مگر وہ تو مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ زندہ رہنے کیلئے یہ علاج کر رہا تھا۔

اس نے کئی بار بغاوت کی۔ مگر ہر بار اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ حالات نے ہمیشہ اُس کے خلاف فیصلہ دیا۔ وہ مجبور تھا۔ اُس کا بس چلتا تو وہ ماحول کو تباہ کر دیتا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جوں جوں اُسے ناکامی کا زیادہ احساس ہوتا گیا۔ اس کا فن بڑھتا گیا۔ اُس نے اپنے زخموں کے رِستا ہوا خون لے کر ایسے نقوش بنائے کہ دیکھنے والے تعریف کرنے لگے۔ جب اس کے دل میں درد بڑھتا تو وہ سوز سے گانے لگتا۔ وہ دِل کی صدا کو نغمہ بنا لیتا۔ لوگوں نے جب اِس نغمے کو سُنا تو انہوں نے اِس کی بے حد تعریف کی۔ وہ اپنا دُکھ درد بھول گیا۔ اُسے لوگوں کے تعریفی کلمات سے ایک سکون ملتا ـــــ سکون ملتا اور اِس کا نغمہ مدھم ہونے لگا۔ بغاوت کا جذبہ کم ہوتا گیا ـــــ پھر ایکا ایکی سماج نے اُس سے سمجھوتا کر لیا۔

اِس کی پریشانی کا باعث آخر روپیہ ہی تھا۔ اَب اُسے روپیہ ملنے لگا۔ کل جن چیزوں کیلئے وہ ترستا تھا۔ اُسے ملنے لگیں اور جن اشیاء کو وہ سامانِ عشرت سمجھتا تھا۔ اَب ضروریاتِ زندگی بن گئیں۔ ماحول بھی پُرسکون معلوم ہونے لگا۔ جب حالات کو ہم بدل نہیں سکتے۔ تو پھر اُن سے سمجھوتا کر لینا چاہیئے۔ اُسے اپنے سیاسی رہنماؤں کی زندگی یاد آنے لگی۔ کانگرس کل تک حکومت کے خلاف تھی۔ مگر اَب وہ سمجھوتہ کر رہی تھی۔ وہ باغی تھے مگر اَب وہ حکومتِ وقت کے ہم پلہ ہو کر ملکی سیاست میں دخل دینے لگے۔ اس نے بھی سمجھوتا کر لیا تھا۔ ماحول نے حالات سازگار بنا دیئے۔ اب وہ بے قرار نہ تھا۔ شام کے بعد وہ بڑے مزے سے گہری نیند سوتا۔ دیر سے جاگتا۔ اس کیلئے دنیا رہنے کے قابل بن گئی۔

مگر اچانک اُسے محسوس ہوا۔ کہ اس کی موجودہ زندگی ایک دھوکا تھی۔ وہ فریب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ نئے فریب میں۔ اس نے زندگی کا مقصد متعین کر لیا تھا۔ ایک پُرسکون گھر، باقاعدہ زندگی، سونا، سیر کرنا، آرام و آسائش سے رہنا۔ یہ سب کچھ پا کر اُس نے اپنی زندگی کو فروخت کر دیا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ روز بروز موت کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی رُوح مُردہ ہو رہی تھی۔ رات کی بے قراری جو کبھی اُس کے تخیّل کے پَر دِل پر پرواز کیا کرتی تھی۔ اب نیند کے آغوش میں سرِ شام سو جایا کرتی۔ موت اُسے لوریاں دیتی۔

وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اُس نے زندہ رہنے کیلئے سماج سے سمجھوتا کیا۔ مگر یہ سمجھوتا زندگی کی راہ میں حائل ہو گیا۔ زندگی جو اتھاہ سمندر تھی۔ ایک نرم رَو جھیل بن گئی۔ طوفان جو کبھی اُٹھا کرتے تھے۔ اب بادِ نسیم کے جھونکے بن گئے۔ وہ گھٹائیں جن سے دِل بَل جاتے تھے۔ پھوار بن کر اپنی ہیئت کھو بیٹھیں۔ راتیں جو کبھی فن کی تخلیق کیا کرتی تھیں۔ اب نیند بن کر گزر جاتیں۔

اس نے پھر بغاوت کرنی چاہی مگر ـــــ فن کی سکون سے ٹکر ہو گئی۔ فن بے قراری چاہتا تھا۔ اور سکون جمود۔ فن اتھاہ سمندر کا مد و جزر اور سکون ندی کا ساکن پانی۔ زندگی بقا چاہتی تھی۔ اور بقا حرکت میں تھی۔ ایک آدمی کی حیثیت سے وہ کامیاب تھا۔ اور فن جس کے ذریعے اُسے

یہ مقام حاصل ہوا۔ اُسے مُردہ قرار دے چکا تھا۔ لیکن وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔

دن بھر وہ کاروبار میں مصروف رہا۔ اس کا دماغ اُسے جگا رہا تھا۔ شام آئی، اُس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ اُسے اپنے کمرے کی یاد آئی۔ نرم گرم بستر، صاف ستھرا کمرہ، آرام و سکون کے سارے لوازمات اُسے بُلا رہے تھے۔ مگر یہ تو موت تھی، زندگی کو قید کرنے کا سامان تھا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ زندہ رہے گا۔ اس نے تہیہ کر لیا۔ نیند موت تھی۔ کافی کے دو گرم پیالے نیند کو بھگانے کیلئے کافی تھے۔

اس نے سکون کے جال کو توڑ دیا۔ اس کے دل میں بے قراری کروٹیں لینے لگی۔ اس نے سوچا زندگی سے سمجھوتا کتنا پُرفریب تھا۔ خود زندگی نے اُسے فریب دیا۔ فن کا نام لے کر زندگی اُسے سکون کی طرف لے گئی۔ تخیل کو محدود کر دیا۔ اس نے فن ایسی زمان و مکاں سے بالاتر شے کو اظہار ذاتی کیلئے مخصوص کر دیا تھا۔ اپنی انا کی تسکین کے دھوکے میں اس نے زندگی کا سودا کر لیا۔ یہ کتنا بڑا فریب تھا۔ زندگی کا اپنا فریب۔ فنکار زمانہ کی قدریں قبول نہیں کرتا بلکہ خود اقدار بنتا ہے

خدا بھی تو ایک فنکار ہے۔ اپنے فن کے بارے میں اس کی اپنی اقدار ہیں۔ یہ اقدار ہمیشہ حالات کی تقسیم سے ہوتی ہیں۔ ابتدا میں زمین و آسمان کی تخلیق کی گئی۔ چاروں طرف ویرانہ ــــ ویرانی اور جمود پر اندھیرا مسلط تھا۔ اندھیرا تھا اور اُس میں سے روشنی نمودار ہوئی۔ دن اور رات وجود میں آئے۔ زندگی پیدا ہوتی گئی۔ فنکار کی اقدار بدلتی رہیں۔ ایک طرف بے قراری تھی اور دوسری طرف سکون۔ بے قراری دن کہلایا سکون رات۔ بدلتی حالت زندگی تھی اور سکون موت۔

خدا اور وہ دونوں فنکار تھے۔ خدا نے اُسے بنایا تھا۔ یا اُس نے اپنی راہِ فرار کیلئے ایک خدا کی تخلیق کر لی تھی۔ اب وہ پھر خیالات کے چکر میں تھا۔ زندگی سرکتی ہوئی اس کے سامنے رینگنے لگی تھی۔ جسے وہ جنت سمجھ رہا تھا۔ وہ موت کی وادی تھی۔ جہاں زندگی کو گھسنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر زندگی نے سانپ کا روپ لے لیا تھا اور رینگتی ہوئی اس کے سامنے آگئی۔ وہ ڈرا اور بھاگا۔ اس نے اس وادی سے نکل جانا چاہا لیکن وہ کہاں جائے۔ اُسے اپنے سمجھوتے کا خیال آ رہا تھا۔ سماج کیا کہے گی۔ اُس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ کتنا حسین ماحول تھا۔ آرام و آسائش قدم قدم پر اُسے آواز دے رہے تھے۔ وہ بار بار رک جاتا۔ سانپ اُس کا تعاقب کئے جا رہا تھا۔

آخر اس نے اس وادی سے نکلنے کی ایک راہ ڈھونڈھ لی۔ اس کے سامنے ایک مقفل صندوق رکھا تھا۔ یہ صندوق کبھی اُسے بہت عزیز تھا۔ لیکن اب تو وہ بھول ہی گیا تھا۔ جونہی اُسے یہ صندوق نظر آیا۔ اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ وہ بڑھا اور اُس کے سامنے قفل خود بخود گر گیا۔ اس نے کھولا اور اس کے سامنے ایک عجیب نظارہ تھا۔ ننھے منّے صندوق میں چند چیتھڑے پڑے تھے۔ اُسے وہ چیتھڑے کتنے پیارے معلوم ہوئے۔ وہ دیوانہ وار بڑھا۔ انہیں نکالا اور اپنا پہلا لباس اُتارنا چاہا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ ننگا تھا۔ بالکل ننگا ــــ اس نے فوراً ان چیتھڑوں سے اپنے جسم کو ڈھانپا ــــ اور

سکون، آرام اور عزت اُسے بلا رہے تھے۔ مگر وہ چلا جا رہا تھا، رات تاریک تھی۔ لیکن وہ چلا جا رہا تھا ــــ اُس کے چاروں طرف ہجوم تھا۔ مگر وہ اس سے بے نیاز تھا۔ اُسے ایک ہی دُھن تھی۔ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ بڑھتا گیا، بڑھتا گیا ــــ یہاں تک کہ اُسے پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے پاؤں زخمی تھے۔ بھوک سے اُس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اور اُسکا انگ انگ دُکھ رہا تھا۔

چاروں طرف خاموشی تھی، اور تاریکی، اُس کا دل بھر آیا۔ اُس کے لب ہلے اور نغمہ بہنے لگا ــــ ساری فضا اس نغمے سے گونج اٹھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ گویا زندگی اُس کے اندر حلول کر رہی ہے۔

شبیر محمد اختر

طائرِ آوارہ

ہر نظارے پہ سہارے پہ ہیں بکھرے ہوئے گیسو اس کے
جن کی خوشبو میں گرفتار ہوں میں۔
مَیں سمجھتا تھا کبھی

اجنبیت مرے ماحول میں ہے۔

آج یہ سوچ رہا ہوں کہ مرے ذہن کے تار
ایک ہی نغمے کی تخلیق میں مصروف تھے کیوں؟
کیوں مری پلکیں رہیں منتظرِ ابرِ فراغ؟
گُل ہوئے جاتے تھے کیوں چرخِ تصور کے چراغ؟

گُل ہُوا چرخ کا فرسودہ چراغ۔
جھلملانے لگا ناکارہ ستاروں کا سماں —
گھُومتے پہیوں پہ ہر سوچ مری گھُوم گئی۔
ڈُوبتے ڈُوبتے احساس نے انگڑائی لی
اور ہر منظرِ حیراں کو نظر چُوم گئی۔
میری آنکھوں سے اُبلنے لگا بے سُود خیالوں کا دھُواں
اجنبیت مرے بالوں کو جکڑتی ہوئی بولی "بولو!
کون ہو؟ — بچ کے چلو گھُومتے پہیوں سے ذرا!
دیکھتے کیا ہو؟ — کوئی طائرِ آوارہ ہے،

اُڑتے اُڑتے یُونہی تھک جائے گا
اُڑتے ذرات کا دامن ہے نشیمن اس کا!"

اُڑتے ذرات کا دامن ہے نشیمن کس کا؟
پھیلتے وقت کی تفہیم ہے منزل کس کی؟ —
اجنبیت مرے کانوں کو جکڑتی ہوئی خاموش رہی۔
مَیں نے جھنجلا کے یہ چاہا کہ کوئی چشمہ ہو
جس کی لہریں مرے بالوں کو، مِرے کانوں کو
اِس قدر چُومیں کہ مَیں
کسی دوشیزہ کی بھیگی ہوئی پلکیں بن جاؤں
وقت جز لمحۂ حاضر نہیں جن کے نزدیک۔

وقت کو لمحۂ حاضر ہی کوئی سمجھے تو کیسے سمجھے؟
ہر نظارے پہ سہارے پہ ہیں بکھرے ہوئے گیسو اس کے
کسی دوشیزہ کے گیسُو نہیں۔ اُس کی پلکیں
بھیگ جاتی ہیں جب آئے برسات —
کسی دوشیزہ کی بھیگی ہوئی پلکو! دیکھو
میری پلکوں کے مقدر میں نہیں ابرِ فراغ۔

انجم رومانی

اُردو شاعری اور تجربات

لوٹس (Lotus) کھانے والوں کی سرزمین میں سہ پہر کا وقت کبھی تبدیل نہیں ہوتا تھا اور ہر چیز قدرتی طور پر غیر متحرک اور تبدیلی سے بے نیاز تھی۔ اس جزیرہ کی طرح دیگر علاقہ جات کے لوگ بھی لوٹس کھا کر نیم باز آنکھوں سے سوئے رہتے تو اور بات تھی مگر یہ سعادت یہاں کے لوگوں کو ہی میسر ہو سکی اور باقی دنیا میں تغیر کو ثبات ملا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ماحول کے زیر اثر ایک قوم اور نسل کی ذہنی اور مادی زندگی دوسری سے مختلف ہے۔ ایک قوم اور نسل کے افراد بھی ایک ہی چیز سے مختلف اثر قبول کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک فرد کا تاثر مختلف اوقات میں ایک ہی چیز کی بابت مختلف ہوتا ہے۔ ادب فن کار کی شخصیت اور ذہنی تاثرات کی لفظی تصویر ہی تو ہے۔ اور عموماً فنکار مختلف اوقات کی کیفیتِ مزاج کو الفاظ کی شکل میں ادا کرتا ہے۔ یہ باتیں خواہ بذاتِ خود حقائق ہوں لیکن ان کا آپس میں ایک دوسرے سے مشابہ ہونا ضروری نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی ہے۔ ماضی اور حال ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے ہوئے بھی آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ ان میں امتیاز اور تفریق ناممکن ہے۔ اور ہمارے تخیل میں صرف وہی باتیں آسکتی ہیں جن کو ہم نے دیکھا، سنا، پڑھا یا محسوس کیا ہو۔ اس لئے تخیل عام الفاظ میں مختلف تجربات کے عناصر کو ایک دوسرے سے ملا کر نیا رخ دکھانے کا نام ہے، اور اس نئے رخ کی بنیاد واقعاتِ گذشتہ پر ہوتی ہے۔ روایاتِ ماضی اور تجرباتِ حال کے امتزاج سے علم و فن، سائنس اور شعر و ادب کی زندگی قائم رہتی ہے۔ اور فطین FATIN وہی فنکار ہو سکتا ہے جو ماضی کے پس منظر میں انسانی فہم و ادراک، احساس و شعور، بصارت و سماعت وغیرہ میں نئی نئی دریافتیں کر کے مختلف راستے دکھائے۔

ہر روایت کسی زمانے کا تجربہ ہوتی ہے۔ اس زمانے کے لوگ اس میں خاص دلکشی ندرت اور جدت محسوس کرتے ہیں جب انہیں قبول کر لیا جاتا ہے تو زمانے کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ زیادہ استعمال، مخصوص طریقِ اظہار سے ربط و ضبط اور تسلسل پیدا ہو کر یہ آہستہ آہستہ فن کا عنصر بن جاتی ہیں ؎

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

غالب کے اس شعر میں تمثیلات، اسالیب اور تراکیب بالکل روایاتی ہیں لیکن ان سے شعر کی خوبصورتی اور معنی آفرینی میں کوئی سقم نہیں پیدا ہوا۔ روایات میں سقم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر صرف تتبع اور لفظی خوبصورتی کی غرض سے مروجہ تراکیب اور روایات کو بغیر محسوس کئے، ہر جگہ مزے مزے سے بے ضرورت ٹھونس دے۔ روایات میں جب تک ربط و ضبط کا نازک تار وپود قائم رہتا ہے۔ یہ فنکار کے ہاتھ میں ایک لچکدار مادہ کا کام دیتی ہیں۔ اس کے زائل ہونے کے بعد زندہ روایات پرانی ہو کر مردہ ہو جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں عام شعرا مردہ روایات کو گھسیٹنے میں ہی فن کا معراج سمجھتے ہیں۔ کچھ ان سے باغی ہو کر بالکل مسترد کر دیتے ہیں۔ اور نئی نئی ایجادات میں قوت صرف کرتے ہیں۔ مگر صحیح شاعر تخلیقی قوت کے زیر اثر انہیں بدلی ہوئی شکل میں پیش کرتا ہے۔

پہلا گروہ ادب کی امتیازی خدمت نہیں کر سکتا۔ شاعری کا اصلی مقصد شاعر کے احساسات اور جذبات کی آئینہ داری ہے۔ ہر تحریک شعری ذہن لاشعور کے تمام وابستہ خیالات کو بھی جگا دیتی ہے۔ پھر شاعر ان انفرادی تاثرات کو الفاظ میں ادا کر کے قاری تک پہنچا دیتا ہے۔ اس صورت میں شاعر سابقین کی تقلید کو ہی ایمان سمجھے تو وہ حقائق اور واقعات سے دور چلا جاتا ہے۔ مضمون۔ خیال۔ الفاظ اور تشبیہہ و استعارہ کے محدود ہونے سے لٹریچر کو نقصان پہنچتا ہے اور زبان اپنی تازگی اور وسعت بھی کھو دیتی ہے۔ یہ شاعر بالکل صدائے بازگشت بن جاتا ہے اور سابق شعرا کے ساتھ ادبی دنیا میں جگہ نہیں حاصل کر سکتا۔ دوسرا گروہ محض تجربہ کی خاطر سابقین سے قطعی انحراف کر کے مختلف باتیں کہتا ہے۔ اس قسم کے تجربات شروع شروع کچھ اثر دکھا جائیں تو خیر مگر کچھ عرصہ کے بعد وہی تاریکی عود کر آتی ہے فن میں جدت پیدا کرنے کی خاطر روایات کو قطعاً نظر انداز کرنا اسے اچھا بنانے کی بجائے لغو بنا دیتا ہے۔ کیونکہ اس طرح اس میں سب کچھ مہمل خلاف عقل اور خلافِ منطق ہو جاتا ہے تیسرا گروہ فن کی اصل سپرٹ سے انکار نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے نزدیک اصل سپرٹ کو منطقی ہیئت میں بند کرنے کا نام ہی فن ہے۔ اس افراتفری اور منطق کی ملاوٹ نے غالب۔ شکسپیئر اور مائیکل اینجلو ایسے فنکار پیدا کئے ہیں۔

شاعری کو بے حس ہونے سے بچانے کے لئے اس میں نئی نئی باتیں پیدا کرنا ضروری ہے۔ اختراع اور تجربہ فن میں رنگی ضرور پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یہ تجربات عالمگیر اس وقت ہوتے ہیں جب روایات میں سے غیر موزوں اور مردہ پہلوؤں کو خارج کر کے ان میں نئے نئے اشتراک پیدا کئے جائیں۔ اور شاعر موروثی الفاظ کو نئے سانچے میں ڈھال کر نئے معنی پیدا کرے بڑے شاعر کا ایک اشارہ بھی موسم بہار کے طلسم کی طرح ہوتا ہے ؎

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے
اقبالؒ

روایاتی اسالیب اور بندشوں کو پگھلا کر اقدار کو نئے رنگ میں پیش کرے۔ جیسے کہ راشد نے اپنی نظم "شرابی" میں ہمیں نئے اقدار سے روشناس کیا ہے ؎

شکر کر اے جان کہ میں ہوں در افرنگ کا ادنیٰ غلام
صدرِ اعظم یعنی دریوزہ گرِ اعظم نہیں
. . . .
غم سے مر جاتی نہ تو آج ہی آتا جو میں
جامِ رنگین کی بجائے بیکسوں اور ناتوانوں کا لہو

ہمیں شاعری سے جمالیاتی تسکین اس وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ یہ جانی پہچانی باتوں میں لپٹی ہوئی ہو۔ فنکار کی بڑی خوبی ان کو نئے انداز میں پیش کر کے پوشیدہ معنی ڈھونڈ نکالنا ہے۔ یہ تخلیقی قابلیت اور استعداد بہترین تجربات کا معیار ہے ؎

بپھلے صحرا میں بگولوں کو کوئی روکے تو شاید روکے صاف میدان میں دریا کو کوئی روکے تو شاید روکے
گرتے پربت کو ہتھیلی پہ کوئی روکے تو شاید روکے بہتے آنسو کو کوئی روک نہیں سکتا ہے
میراجی (مجا در)

تمام تجربات شعوری اور ارادی نہیں ہوتے۔ بلکہ شعر کا رجحان سوسائٹی کے مذاق کے ساتھ ساتھ بدل جاتا ہے

شاعری زندگی کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ شاعر اپنا نکتہ نظر دوسروں پر ٹھونسنا نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ لوگوں کو اپنا نکتہ نظر دوسروں پر ٹھونسنا نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ لوگوں کو اپنا زاویۂ نگاہ دکھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر چیز کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ شاعر ان میں سے ایک یا ایک سے زیادہ پر روشنی ڈال کر لوگوں کو اپنے انفرادی نکتۂ نظر پر پہنچنے میں مدد کرتا ہے۔ اس طرح قاری کا تجربہ اور خیال وسیع ہوتے ہیں۔ آج کل شاعری سے ہماری توقعات پہلے کی بہ نسبت بہت بڑھ گئی ہیں۔ اور موجودہ شاعر ہمارے جنسی۔ نفسیاتی۔ سیاسی اور قومی مسائل پر اپنے ذہنی رجحانات کے مطابق روشنی ڈال کر قاری کو حقیقت میں نئے نئے تجربات ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ موجودہ شاعر پرانی روایات یا نئے خیالات کی بجائے اس کے ذاتی احساسات اور جذبات کا اظہار زیادہ کرتا ہے۔ اندریں صورت ماحول کو بالکل خارجی حالت میں پیش کرنا ممکن نہیں۔ ”کوئی خارجی تاثر جس پیچیدار طریقہ سے ایک نظم میں ڈھلتا ہے۔ اس کی تحلیل ایک طویل عمل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک نظم کا بنیادی محرک موجودہ قحط خوشحالی ہو لیکن غیر شعوری نسلی یادیں۔ دبے ہوئے جنسی خیالات۔ لاشعوری تخیل اس بنیادی محرک سے اس طرح مل جاتی ہیں کہ نظم کو اُس مفہوم میں ماحول کا ترجمان نہیں کہا جا سکتا۔ جس مفہوم میں نظیر اکبر آبادی کی بعض نظمیں۔ یا مثنوی سحر البیان کے بعض حصے، ماحول کا عین بین چربہ ہیں۔“ ۱۹۴۲ء کی بہترین نظمیں“ اور بعض وقت ماحول کا انتشار بالکل داخلی تاثرات کو تحریک دیتا ہے اور شاعر کی شعوری اور غیر شعوری نفسیاتی کیفیات مل کر ایسی چیز پیدا کرتی ہیں جن کا تعلق صرف شاعر کی ذات سے ہو سے

زندگی رنگ و بو سے بیگانہ   سرنگوں دل گرفتہ اور اداس
آہ وہ اس کے قہقہے اداس   (قیوم نظر ادبِ لطیف)
نہ اب چمن ہے نہ اب وہ بہار کا نغمہ   نہ گونجتے میرے دل کی فضائے رنگیں میں
میرے لبوں پہ تھرکتی نہیں خوشی کی کرن
خنک ہیں میری نظر میں وہ زرد پیمانے   (فردوسِ گوش)

کبھی شاعر جنسی الجھنوں اور مسائل کو حل کرنے میں ہی کھو جاتا ہے اور ہر چیز کو اس خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ”جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو قدرت کی بڑی نعمت“ سمجھتے ہوئے میراجی نے ”حرامی“ ”دوسری عورت“ اور ”تفاوتِ راہ“ ایسی نظمیں لکھیں۔

ہر شاعر کا اندازِ بیان الگ ہے۔ ماحول کی پیچیدگیوں کی وجہ سے ہر نئے شاعر نے اپنی ایک دنیا الگ ہی بسائی ہے جس میں اُس کے اپنے اعتقادات۔ محسوسات اور پھر ان میں ہر ایک کے اظہارِ خیال کے عجیب و غریب تشبیہوں اور استعاروں کے جال بچھے ہیں وہ اپنی اس دنیا میں گم اور دوسرے کی دنیا سے بے نیاز ہے۔ مگر اس کے باوجود ان سب میں ایک ایسا درد مشترک ہے۔ جسے بیان کرنے کی بجائے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔“ (قیوم نظر) نئی شاعری کی زندگی کی بابت جامع اور ٹھوس رائے قائم کرنا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ بیشتر شاعر روایات سے بالکل ہٹ گئے ہیں لیکن اس کی ایک خوبی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خیال اور زبان جو روایاتی اور کمزور ہوتے جا رہے تھے سب ان میں نئی تر و تازگی اور نئی ندرت پیدا ہو گئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ دور کسی خاص تخلیقی ادب کا پیش خیمہ ہو۔

پرانی اُردو شاعری پر سرسری نظر ڈالی جائے تو غالب سے پہلے تقریباً تمام بڑے بڑے شاعر روایات سے

پچکے ہوئے ہیں یہ ضرور ہے کہ ہر شاعر نے ادب کی خدمت کا حق ادا کیا زبان کے ساتھ ساتھ خیال میں وسعت پیدا کی ورنہ زبان نازک اور لطیف مطالب کو ادا کرنے کے اہل نہ ہو سکتی اور ادب پیدا ہونے سے پہلے ہی مرجاتا۔ لیکن وہ شاعر سب کچھ فارسی اور دوسری زبانوں سے لائے اور لے جوں کا توں قبول کر لیا۔ نئے نئے اشتراک سے نئے نئے معنی نہ نکالے۔ زبان کی صفائی اور محاورہ کی چستی پر میر اور سودا سے لے کر ذوق بلکہ غالب تک ہر شاعر نے زور قلم خرچ کیا۔

کھلنے میں تیرے منہ کی کلی پھاڑے گریباں
آگے تیرے رخسار کے گل برگِ تر آوے
میر

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
غالب

تر آمدن اور تماشا گفتن فارسی محاورات ہیں۔

غالب فارسی زبان کا جید عالم ہونے کے باوجود اپنے زمانے کا ہاتھی تھا اور اردو غزل کی چند ایک روایات اس کے ہاتھوں میں آکر گھل گئیں۔ مثلاً معشوق کی عشق و محبت سے بیگانگی۔ واعظ کی مئے سے ازلی دشمنی اور عاشق کا ہڈیوں کا پنجر اور کریہہ ہیئت ہونا اس کی خوبی میں شمار ہوتا۔ غالب ان روایات سے ہٹ کر کچھ مختلف رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

معشوق خواہ اپنے چاہنے والے سے محبت نہ کر سکے لیکن وہ پتھر کی بے جان مورت نہیں۔ اس کا دل بھی کسی کی محبت میں بیتاب ہو کر دھڑک سکتا ہے۔

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

اور

غالب ان سیم تنوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

لیکن غالب نے غزل کی ہیئت میں بھی کوئی تجربہ نہیں کیا اور اسے عشقیہ خیالات کے اظہار کا ہی ذریعہ سمجھا۔

حالی نے کچھ انگریزی ادب کے زیر اثر اور کچھ حالات سے مجبور ہو کر شاعری کی علت غائی کو ہی تبدیل کر دیا۔ اور شاعری کا اصلی مقصد اخلاق کی درستی قرار دیا۔ حتیٰ کہ غزلیات میں بھی روایاتی انداز چھوڑ کر حالی درس اور تلقین کرتا ہے۔ نیچرل اور مناظر قدرت کی شاعری بھی اسی زمانہ کی پیداوار ہے مسدس حالی نے اردو ادب میں سنگ میل کا کام کیا۔ شاعری کے میدان میں وسعت پیدا ہو گئی۔

موضوعات کے تجربوں کے ساتھ ساتھ ہیئت میں بھی تبدیلیاں ہوئیں۔ حالی نے خود لکھا ہے کہ "جس طرح ضلع لفظی پابندی کا خون کر دیتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بہت زیادہ قافیہ کی قید ادائے مطالب میں خلل انداز ہوتی ہے۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی عام طور پر خیال کو الفاظ کے تابع کر دیتی ہے۔ اور اس کی رفتار کو بھی صحیح طور پر ادا کرنے میں قاصر رہتی ہے۔

حفیظ جالندھری اور عظمت اللہ خاں نے قافیہ اور ردیف کو مانا ہے لیکن چھوٹی اور بڑی بحروں کو ملا کر موضوع اور اظہار میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے نئے نئے تجربے کئے ہیں ؎

یہ تماشا دیکھ کر موجِ صبا چپ ہو گئی
شاخِ گل پر بلبلِ رنگیں نوا چپ ہو گئی
ہو گئی ہر صدا چپ ہو گئی
اور فضا گھبرا گئی
خوف سے تھرا گئی

ہر شے پہ
جو شے پہ
چھا گئی ——— مردنی سی چھا گئی

حفیظ جالندھری

قافیہ اور ردیف کی پابندی میں رہ کر قیوم نظر نے بھی کچھ تجربات کئے ہیں۔ بڑی اور چھوٹی بحروں کو ملا کر اور قافیہ کی آواز کو علیحدہ علیحدہ بند میں ہم آہنگ کر کے۔ ہیئت کو خیال کی لہروں کے مطابق بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں "جوانی" اور "شام" قابلِ توجہ ہیں۔ ان نظموں میں چار چار لائن کے بند ہیں۔ چوتھی لائن پہلی تین لائن سے مختلف بحر میں ہے ہر بند کی دوسری اور تیسری لائن کے قافیہ آپس میں ہم آواز ہیں اور چاروں بندوں کی پہلی لائنوں اور آخری لائنوں کے قافیہ آپس میں ملتے ہیں۔ ؎

مشتعل دن کا انبوہ کثیر
ہر طرف پھیلتا بڑھتا اٹھا
روندتا آگ لگاتا اٹھا
اب کہاں وقت دل و دوست کی غمخواری کا

خون آلودہ شفق کی زنجیر
پیچ در خم کھاتا پر اسرار دھواں
دور اک ڈوبتی آواز گراں
ہر نشان بانکپنِ عشق کی دشواری کا

"شام"

اس سلسلے میں ضیا جالندھری نے بھی کچھ تجربات کئے ہیں ؎

اس پھول کے پاس
آئی تھی تتلی
خوشبوئے انفاس
پا کر جھکی تھی ——— لب مل رہے تھے
یہ ہنس رہا تھا

وہ چہ متی تھی
یہ جھومتا تھا
وہ جھومتی تھی ——— دل کھل رہے تھے۔ "بھول"

میراجی اور راشد نے آزاد نظم میں نئے راستے دریافت کئے ہیں۔ چھوٹے اور بڑے مصرعوں کو قافیہ اور ردیف کی قید سے آزاد کرا کے خیال کی زنجیر کی طرح بنایا۔ جس کی کچھ کڑیاں بڑی ہیں کچھ چھوٹی۔ ہیئت کو خیال کی لہروں کے مطابق بنانے میں میراجی کی نظم "یاتری" قابل توجہ تجربہ ہے۔ نظم آزاد کا بنیادی اصول یہ ہے کہ شاعری آنکھ کی بجائے کان کے لئے لکھی جاتی ہے بغیر قافیہ کے چھوٹے بڑے مصرعے سننے میں بار نہ گذریں تو ترنم کی شرط پوری ہو جاتی ہے۔ دوسرے احتجاج قافیہ اور ردیف کے خلاف ہے۔ بحروں کے خلاف نہیں۔ ویسے تو بحریں بھی شاعری کے لئے محض اتفاق ہیں۔

آزاد نظم کے ساتھ نظم معرّیٰ میں بھی کچھ تجربات کئے جا رہے ہیں۔ پہلے پہل عبدالحلیم شرر اور اسمٰعیل میرٹھی نے بلینک ورس کا استعمال کیا مگر وہ تجربات کامیاب نہ ہو سکے۔ دوسرے ممالک کے ادب کے برعکس نظم معرّیٰ اردو میں آزاد نظم کے بعد آئی ہے۔ فیض میں کہیں کہیں بلینک ورس ہے۔ یوسف ظفر نے اسے خصوصیت کے ساتھ استعمال کیا۔ اس کی نظم "آوازیں" پہلا تجربہ ہے۔

پرانی باتوں کی طرح موجودہ تجربے بھی کسی دن روایات بن جائیں گے ع

کہیں انہیں چوٹیوں سے اب وہ عمارتیں پھر ابھر نہ آئیں "نئی پود"

کیونکہ "شاعری میں تمام دنیا کی داخلی اور خارجی تصویر پیش کی جا سکتی ہے۔ عالم محسوسات۔ دولت کے انقلابات۔ سیرت انسانی۔ معاشرت نوع انسانی۔ غرض تمام چیزیں جو فی الحقیقۃ موجود ہیں اور جن کا تصور مختلف اشیا کے اجزا کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جا سکتا ہے شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلمرو اسی قدر وسیع ہے۔ جس قدر خیال کی قلمرو" (مقدمہ شعر و شاعری)

(حلقۂ ارباب ذوق میں پڑھا گیا)

احمد سعید قریشی

صلح

آج گردوں پہ نیا مہرِ درخشندہ ہے
اس کی کرنوں سے بھی جھلسے گا زمانہ اک دن
اس کی حدت سے بھی ہو گا کبھی بے تاب جہاں
اور ہو جائے گا یہ دن بھی فسانہ اک دن

اختر ہوشیارپوری

ماضی

ان خیالوں کی پھر اک بھیڑ لگی جاتی ہے
جن سے بچنے کے لیے جن کو بھلانے کے لئے میرے رُوح کے در بند کئے تھے مَیں نے
اپنے ماحول کو پُر امن بنانے کے لئے رشتے دُنیا سے سبھی توڑ لئے تھے مَیں نے
آہ پھر بھی یہ بلا مجھ پہ چڑھی آتی ہے

میرے جینے کا سہارا تھے کبھی یہ سپنے
اس طرح ان سے چمک اٹھتی تھی دُنیا میری جیسے پانی کسی ویران ندی میں آ جائے
اب یہ آتے ہیں تو بڑھ جاتی ہے بپتا میری جیسے فانوس پہ پروانوں کا بادل چھا جائے
ایک آفت ہیں مصیبت ہیں بڑی یہ سپنے

گرچہ اس اگلے زمانے سے بہت دُور ہوں میں
میری خواہش ہے کہ وہ لمحے مجھے یاد نہ آئیں ثبت ہیں جن پہ مرے دورِ مصائب کے نشاں
ڈر ہے اب میرے لئے پھر نہ مصیبت بن جائیں زندگی پھر کہیں محسوس نہ ہو اک زنداں
اب گئے وقت سے کہتا ہوں تو مجبور ہوں میں

اب سمجھتا ہوں کہ منزل بھی کوئی دُور نہیں
پھاندنا چاہتا ہوں جب بھی یہ مشکل کا پہاڑ یادِ ماضی مجھے زنجیر پہنا دیتی ہے
ناامیدی کو بھی مل جاتی ہر کچھ وقت کی آڑ اک اندھیرا سا مری رُوح پہ چھا دیتی ہے
کون سا زخم ہے اس وقت جو ناسور نہیں

تاجور سامری

گنٹھیا

جب کوئی سیاح یا سیلانی آدمی آکر یہ کہتا ہے کہ مجھے یہ کپڑے ڈبل ریٹ پر دھو کر کل ہی واپس کر دو۔ کیونکہ میں دہلی میں صرف دو روز کیلئے ہی ٹھیر سکتا ہوں۔ اس کے بعد فلاں جگہ سیر کیلئے جا رہا ہوں تو سن شائن لانڈری کا یہ بھاری بھرکم سائن بورڈ ایک قوی ہیکل دیو کیطرح میرے سینے پر ناچنے لگتا ہے۔ مجھے اپنی آوارگی اور آزادی کا تازہ زمانہ یاد آتا ہے۔ جب لوہے کی دو استریاں اور پتیل کا ایک ٹب میری زندگی کی پونجی تھی۔ میں ہے اٹھائے خانہ بدوشوں کیطرح ہندوستان کے کونے کونے میں گھومتا پھرتا تھا۔ کبھی لاہور، کبھی پشاور، کبھی پٹنہ اور مراد آباد۔ کبھی کسی بندرگاہ پر اور کبھی کسی پہاڑ پر میری دنیا، میری امنگیں اور میرے دلولے وسیع تھے اور اس انداز سے میری مسرتیں بھی وسیع اور بے پایاں تھیں۔ ان مسرتوں کے حصے دار میری ہی طرح کے وہ آوارگی پسند نوجوان ہوتے تھے۔ جو مجھے ملک کے ہر حصے میں اور ہر جگہ نئے مل جاتے تھے۔ وہ میرے ساتھ کام کرتے، کھیلتے کھاتے اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے جب دفعتہً طبیعت سیر ہو جاتی تو ایک دن یکایک شاید ذوقِ آوارگی کی آزمائش کیلئے یا کسی اور وجہ سے ہم اس سکون پذیر زندگی کو خیر باد کہہ دیتے۔ اور اپنے جوان سینوں میں بے لوث اور آزاد زندگی کا خوشگوار پیغام لئے ملک کی مختلف سمتوں میں چل جاتے۔

پتا جی اکثر کہا کرتے۔ "کمبخت تیرے پیر میں چکر ہے۔ چکر!"

ہاں کبھی واقعی پیر میں چکر تھا لیکن پھرتے پھرتے وہ چکر ایسا گھسا ہے کہ میرا ذوقِ آوارگی چاندنی چوک تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ گھنٹہ گھر، شاہی مسجد اور لال قلعہ میری دنیا کے عجائبات ہیں۔ جنہیں میں گذشتہ زندگی یاد آنے پر حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ لیتا ہوں یا زیادہ زور مارا۔ تو جمنا کے گھاٹ تک ہو آتا ہوں۔ پتا جی مر چکے ہیں لیکن جس فضول زندگی سے وہ میرا رشتہ جوڑ گئے ہیں۔ میں اسے جان کا عذاب سمجھتے ہوئے بھی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ بیوی ہے۔ بچے ہیں۔ میری ڈھلتی ہوئی جوانی ہے اور میں یہ گرم گرم لوہے کی لال آنکھوں والی استریاں جنہیں میرے کرائے کے آدمی بے جان مشینوں کیطرح چلاتے ہیں۔ میں جوں جوں کپڑوں کی سلوٹیں نکلتی دیکھتا ہوں۔ میرے چہرے، جسم اور روح کی سلوٹیں گہری ہوتی جاتی ہیں۔ میں روپیہ کماتا ہوں لیکن ایسا محسوس کرتا ہوں کہ زندگی کا تمام اثاثہ ہار بیٹھا ہوں۔ مجھے اس کام سے نہ لطف حاصل ہوتا ہے اور نہ مسرت۔ اکثر اوقات اسقدر تھک جاتا ہوں کہ میری روح کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگتا ہے۔ ان لمحوں میں ایک دائمی مریض کی طرح اس درد کا کوئی علاج نہ پاکر اپنی گذشتہ صحتمند زندگی کے تصور میں کھو جاتا ہوں۔ شہر، بل اور بندرگاہوں کے منظر اور دوستوں کی دلفریب صورتیں ایک ایک کر کے نظر کے سامنے سے گذرنے لگتی ہیں اور آخر کشمیر کی حسین وادی اپنے پر شکوہ پہاڑوں، چشموں، جھیلوں اور سبزہ زاروں کے ساتھ ذہن میں ابھر آتی ہے۔ اس حسین وادی میں میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔

میٹھا، رنگین اور مدہوش کن خواب۔ اس خواب کی دوشیزہ کے پیچھے بھاگتا ہوا میں یہاں تک آ پہنچا ہوں۔ جونہی اسے پکڑنے کیلئے ہاتھ بڑھاتا ہوں وہ پری جمال، نازک اندام ساحرہ مجھے فریب دیکر خود تو نہ جانے کدھر نکل گئی اور میرے ہاتھ آئی "تو من کی دھوبن

جیسے میں اپنی بیوی کہنے پر مجبور ہوں۔ جس میں نہ کوئی خوبصورتی ہے نہ رعنائی نہ دلکشی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برہما نے جب اسے بنایا تو تمام لطافتیں صرف ہو چکی تھیں اس کے پاس جو کثیف مادہ باقی رہ گیا تھا اسے اکٹھا کر کے یہ بھاری بھرکم مجسمہ تیار کر دیا۔ میں اسے دیکھتا ہوں اور سر پیٹ لیتا ہوں۔ وہ آخری واقعہ جس نے مجھے اس جہنم میں لا پھینکا رہ رہ کر کچوکے دیا کرتا ہے۔

ویسے تو میں کئی مرتبہ کشمیر ہو آیا تھا۔ گلمرگ اور پہلگام میں دو دو تین تین مہینے اپنی سفری لانڈری قائم کر کے گذار چکا تھا۔ اس مرتبہ میں خاص سری نگر میں ٹھیرا۔ بدھسوری باغ میں ڈائمنڈ لانڈری کا پروپرائٹر تھا۔ جو ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے کر سیزن گرما کیلئے عارضی طور پہ کھولی گئی تھی۔ تھوڑے سے ہی عرصہ میں کام بھی معقول ملنے لگا اور چند نوجوان ساتھی بھی مل گئے۔ ان میں سے دو نوجوان تو ان مسافروں میں سے مل گئے جو قریب ہی آریہ سماج مندر میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ چندر۔ گوری۔ ان میں آوارگی کی سب صفات موجود تھیں۔ ہاں وہ کپڑے دھونا بالکل نہیں جانتے تھے۔ نہ اسکی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ یہ فن ہر ایک نوجوان کو میں خود سکھا سکتا تھا۔ ان کے علاوہ دو نوجوان منگلی اور ستیم ایسے بھی مل گئے۔ جو پہلے ہی سے امیر آدمیوں کی کوٹھیوں میں کپڑے دھونے کا کام کرتے تھے۔ سب سامان امیروں کا ہوتا تھا۔ ان کا کام کپڑے دھونا اور استری کرنا ہوتا تھا۔ اسطرح انہیں محنت زیادہ کرنا پڑتی اور اجرت کم ملتی لیکن چار و ناچار کر رہے تھے۔ اب میرے ساتھ واقفیت ہوتے ہی انہوں نے سرمایہ داروں کی مزدوری کو ترک کر دیا اور میرے ساتھ لانڈری میں برابر کے حصہ دار کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔

اسی طرح ہم پانچ آدمیوں نے اجتماعی زندگی بسر کرنا شروع کی۔ چندر سب سے زیادہ خوش وضع، خوش پوش اور خوش طبع واقع ہوا تھا۔ میں تھوڑے ہی دنوں میں اس کی بلند حوصلگی، فراخدلی اور خلوص کا قائل ہو گیا اور دل ہی دل میں اس کی عزت و احترام کرنے لگا۔ وہ دن بھر ہمارے ساتھ کام کرتا اور شام کو جب ہم سیر کو نکلتے وہ اپنا سوٹ پہنتا جو صرف اسوقت کیلئے مخصوص کر رکھا تھا۔ سوٹ قیمتی تو تھا ہی۔ جانے وہ کب سے پہن رہا تھا۔ لیکن اس احتیاط سے رکھتا تھا کہ اس پہ داغ دھبہ اور پہننے کا نشان تک نہ تھا۔ ایک دفعہ برج کھیل کر اسے کافی پیسے ہاتھ لگے تھے۔ اسوقت یہ سلوایا تھا۔ مگر اس سوٹ کے نیچے جو قمیص پہنی جاتی تھی وہ جابجا پھٹی ہوئی تھی۔ ہاں اس کے جو حصے سوٹ سے باہر رہتے تھے۔ جن پر لوگوں کی نگاہیں پڑنے کا احتمال تھا۔ وہ بالکل سفید، سالم اور صاف ستھرے ہوتے تھے۔

جذام کے داغ اگر کوٹ کے اندر ہوں تو آدمی جذامی نہیں کہلاتا۔ جب وہ یہ سوٹ پہن کر گھنگرالے بال بنا کر اور سنہری چشمہ لگا کر نکلتا تو کسی ریاست کا شہزادہ نظر آتا تھا۔ دراصل اسے شہزادہ بننے کی ضرورت بھی تھی کیونکہ اسکا شغل تھا۔ ہاؤس بوٹوں اور ہوٹلوں میں رہنے والے رئیس زادوں کیساتھ برج کھیلنا۔ جو اپنے سے کم حیثیت لوگوں سے مل بیٹھنا کسر شان سمجھتے ہیں۔

چندر کی برج کی آمدنی ہماری لانڈری کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ تھی۔ جہاں تک ہارنے کا تعلق ہے۔ وہ روپیہ دو روپیہ سے زیادہ ہارا ہو۔ ایسا کوئی موقعہ مجھے تو یاد نہیں۔ اس کی یہ کامیابی دیکھ کر میں حیران رہ جاتا اور پوچھتا۔ "چندر! سمجھ میں نہیں آتا کہ تم برج کھیلتے ہو یا جیب کترتے ہو؟"

وہ ہنس کر جواب دیتا۔ "بس یہی سمجھ لو کہ جیب کترتا ہوں۔ ان سالے سرمایہ داروں کو ہرانا بھی کچھ مشکل ہے۔ تمہیں ایک اصول بتاتا ہوں۔ جو اسی فیصدی لوگوں پر صادق آتا ہے۔ جن لوگوں کی جیبیں سکوں سے بھری رہتی ہیں ان کے دماغ عقل سے خالی ہوتے ہیں۔"

ممکن ہے چندر کی یہ بات کسی کو بری معلوم ہو لیکن مجھے بہت پسند آتی اور وہ مجھے بتایا کرتا کہ میں ان لوگوں سے برج کھیلتا ہوں۔ جو ہار جیت کیلئے نہیں بلکہ روپیہ خرچ کرنے کیلئے کھیلتے ہیں۔ اگر وہ اتفاق سے کبھی آٹھ دس آنے جیت بھی جاتے ہیں تو اتنے خوش ہوتے ہیں کہ فوراً وسکی کا آرڈر کر دیتے ہیں۔ جن کا مقصد اپنی سمجھ بوجھ اور کھیل میں برتری کی داد پانا ہوتا ہے۔ اور اگر بیس تیس روپے کی بیٹھیں

تو شکست کی تلخی کو بھی شراب پی کر یا کسی نازنین کے پہلو میں بیٹھ کر بھلا دیتے ہیں۔ انہیں تو بس یہ صرف کرنے سے غرض ہے اور وہ بہر صورت ہو جاتا ہے۔

گوری کو سینما دیکھنے کا شوق تھا اور وہ شوق یہاں تک بڑھا ہوا تھا کہ ہر نیا کھیل دیکھ آنا وہ اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ اور جو کھیل زیادہ پسند آتا اسے کئی مرتبہ دیکھ آنے سے بھی جی نہ بھرتا۔ اسے ایکٹر، ایکٹرسوں کے نام۔ گانے کے سُر تال، ڈرامائی ٹکڑوں کے انداز بخوبی یاد تھے۔ کبھی کبھی اس کو چھیڑنے کی غرض سے ہم اسکی دل پسند فلم کو نکما یا اس کے محبوب ایکٹر یا ایکٹرس کے گانے اور ایکٹنگ کو خراب کہہ دیتے تھے۔ وہ سنتے ہی بھڑک اُٹھتا اور جھوٹ کہتا "تمہیں ان باتوں کی تمیز ہی کیا ہے"۔ اس کے بعد فلم کی خوبیوں ایکٹنگ اور گانے کے فن پر ایک اچھی خاصی پُر جوش تقریر ہو جاتی جسے سُن کر کمرہ قہقہوں سے بھر جاتا۔ تب کہیں اس پر ہماری تنقید کا راز کھلتا۔ آخر ہم اسے ایک فلمی گانا سنانے کی فرمائش کرتے۔

منگی کا اپنا کوئی خاص شوق نہ تھا۔ وہ کبھی گوری کے ساتھ سینما دیکھ آتا۔ کبھی میرے ساتھ گھوم پھر کر دل بہلاتا اور کبھی کبھی سلیم کے ساتھ عورتیں اور نوعمر تتلیاں دیکھنے چلا جاتا۔ ہاں سلیم کو نسوانی حُسن سے وہی رغبت تھی جو بھونرے کو پھول کی خوشبو سے ہوتی ہے۔ جس طرح بھونرا پھول کو سُونگھ کر ہی مطمئن رہتا ہے۔ سلیم عورت کو دیکھ لینا ہی کافی سمجھتا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگر کہیں آسانی دسترس ہو جائے تو اُسے بھی بُرا خیال نہیں کرتا تھا۔

لانڈری کا کام ہم پانچوں ہی کرتے تھے۔ مگر وہاں رہنے والوں کی تعداد میں بہت جلد اضافہ ہو گیا۔ پرکاش ایک نیم آرٹسٹ تھا۔ وہ ایک فوٹوگرافر کی دکان پر کام سیکھ رہا تھا۔ اُسے بیس روپے مہینہ ملتے تھے۔ اسی طرح ایک اور نوجوان رتن دیو کسی ٹرانسپورٹ کمپنی میں پچیس روپے مہینہ پر کلرکی کرتا تھا۔ یہ دونوں بھی ہمارے ہی پاس رہنے لگے اور ان کے بعد جو آٹھواں شخص ہمارے ساتھ شامل ہوا اس کا نام تو اَب یاد نہیں لیکن ہم اسے نیلو کہتے تھے۔ کیونکہ اس کے شوخ کالے رنگ سے نیلاہٹ جھلکتی تھی۔ اس کے تندرست اعضا اور موٹی موٹی چمکدار آنکھوں کو دیکھ کر اس کے خوبصورت ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ پہلے وہ کسی دوست کے پاس کوٹھی میں رہتا تھا۔ دراصل دوستی دوستی کچھ نہ تھی۔ یہیں آ کر یہ واقفیت ہوئی تھی اور اس نے نیلو کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ لیکن وہ اس واقفیت کے رشتے کو زیادہ دیر تک نباہ نہ سکا۔ صاف تو کہتا نہیں تھا۔ لیکن چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے چلا جائے ایک رات باتوں ہی باتوں میں جھگڑا ہو گیا۔ اور نیلو نے مجھے بتایا کہ اب وہ وہاں رہنے کی ذلت گوارا نہیں کرتا۔ کوئی شخص بھی مردانہ وار لڑے۔ میں اُسے تعریفی نگاہوں سے دیکھتا اور کوئی شخص بھی مستقل زندگی کے خلاف بغاوت کرے۔ میں اُسے پناہ دینے کیلئے تیار رہتا تھا۔

نیلو بھی ہمارے پاس رہنے لگا۔

شام کو جب سب لوگ سیر کو جاتے تھے تو نیلو بھی جاتا تھا۔ ویسے وہ سارا دن ہی گھومتا رہتا تھا۔ اسے ہماری لانڈری کے کام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ٹائپ کلرک سے موٹر ڈرائیوری تک مختلف جگہ پر مختلف نوکریاں کر چکا تھا۔ مگر اپنی لاابالی طبیعت کے باعث کسی ایک جگہ بھی جم کر نہیں رہ سکا تھا۔ اب وہ کشمیر کی سیر کو آیا تھا اور سمجھتا تھا کہ یہاں بھی کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش نکل آئیگا۔ اگر کام نہ ملے تو بھی گذر بسر کرنے کے طریقے وہ خوب جانتا تھا۔ پہلے ڈیڑھ دو مہینے مسلم ہوٹل میں کھانا اُدھار کھاتا رہا۔ جب پیسوں کا تقاضا بڑھنے لگا۔ تو ایک ہندو ہوٹل میں جا ڈٹا اور اب ایک سکھ ہوٹل پر نظر عنایت تھی۔ اگر کوئی پوچھ لیتا۔ کہ یہ ہوٹلوں کے منیجر تمہارا اعتبار کس طرح کر لیتے ہیں تو وہ بڑے فخر اور خود اعتمادی سے کہتا "اعتبار جمانے کا فن میں جانتا ہوں"۔

ہاں تو شام کی سیر کا ذکر چل رہا تھا۔ لیلو ہر روز ایک نئی پوشاک میں نکلنا پسند کرتا۔ کبھی سلیم کی ترکی ٹوپی پہن کر اس کا موتیئے رنگ کا تہمت زیب تن کرتا اور اپنے کپڑے سلیم کو دے دیتا۔ اگر تبادلہ منگلی کے ساتھ ہوتا تو لیلو اس کی قمیص اور شلوار پگڑی میں ملبوس نظر آتا اور کبھی گاہکوں کے کپڑے پڑے ہوتے۔ ان میں سے پہن جاتا۔ وہ عام طور پر منگلی اور سلیم کے ساتھ گوردوارہ کے سامنے جو کھلا میدان پڑا ہے۔ اسمیں گھوما کرتا اور کہتا آؤ یار نوروز کا میلہ دیکھیں "

دراصل وہ میلہ نوروز کیلئے نہیں ہر روز بھرتا تھا۔ کوٹھیوں اور محلے کی عورتیں وہاں سیر کرنے آیا کرتی تھیں۔ قریب ہی لڑکیوں کا ایک بورڈنگ ہاؤس تھا۔ وہ بھی ٹولیاں باندھ کر سیر کیلئے نکلا کرتی تھیں۔ سلیم، منگلی اور لیلو اس میدان کی چہل پہل دیکھتے اور گھوم پھر کر دل کی تپش بجھایا کرتے تھے۔ لیلو کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ لڑکیوں سے آنکھیں لڑانے میں کامیاب ہو۔ سلیم اور منگلی اس چھیڑ چھاڑ میں اس کا حوصلہ بڑھاتے اور کہتے "چل بیٹا چل، ذرا اس حسینہ سے ہو جائیں دو باتیں "۔ لیلو نہایت بیباکی سے اس کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور پوچھتا "کیوں جی ادھر سے دو خوانچے والا تو نہیں گیا؟"

"کتنی خوانچے والا؟"

"وہی " لیلو عجب انداز سے آنکھ دبا کر مسکرا دیتا اور اس کے دونوں دوست کھل کھلا کر ہنس دیتے۔ اور لیلو کی اس شرارت پر وہ اپنے اندر ایک گونہ مسرت محسوس کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ نوخیز لڑکیاں ان کی طرف دیکھنا پسند نہ کرتی تھیں۔

جب کبھی ہمیں فراغت ملتی۔ لیلو صنفِ نازک کے ذکر خیر سے محفل گرماتا۔ پٹھانیوں، پنجابیوں اور جمنا پار کی عورتوں کی مختلف قسمیں بیان کرتا۔ پھر عورتیں پھنسانے کے طریقے اور عشق و محبت کی طویل داستانیں شروع کر دیتا۔ اور اس کے کہنے کا انداز اس قدر رنگین اور دلکش ہوتا تھا کہ ہم سنتے اور سر دھنتے تھے۔

"یہاں تو عورتوں کی خوب بہار ہے"۔ ایک بار سلیم نے کہا۔

"سنتا تو یہی تھا۔ لیکن میں نے تو خزاں ہی دیکھی "

"خزاں کیوں ہے۔ تم شام کو شکارے پر سیر کو نکل جاؤ۔ ذرا مانجھی سے کہو۔ عورت حاضر ہے "

"واہ یار کہیں ایسے بھی عورت ملتی ہے۔ یہ تو اسٹیشن پر بکنے والی چائے کی پیالی ہے۔ جسے پی کر تھوک دینے کو جی چاہتا ہے"

ہم سب کھل کھلا کر ہنس پڑے اور سلیم کھسیانہ سا ہو گیا۔ لیکن لیلو نے کہا "جناب عورت کی آنکھوں میں جنت مسکراتی ہے۔ اور وہ اس وقت نظر آتی ہے۔ جب وہ تمہیں واقعی پیار کرتی ہو"

اس کی باتیں اکثر اوقات عامیانہ رہ کر اس قدر بلند ہو جاتی تھیں کہ ہمارے دلوں پر عورت کی عظمت، اہمیت اور محبت نقش ہو کر رہ جاتی تھی۔

لیلو نے ایک قد آور کتا بھی پال رکھا تھا۔ جسے وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اور سب باتوں کی طرح اسے کتے کی بھی چنداں پروا نہ تھی۔ اسکے کھلانے پلانے کا خیال مجھے ہی زیادہ تر رہتا تھا اور شام کو ہوا خوری کیلئے بھی اسے میں ہی ساتھ لے جاتا تھا۔ اس لئے کتا مجھ سے ہل مل گیا تھا۔ اگر وہ کسی اجنبی کو دیکھ کر بھونکتا اور میں چپ کہہ دیتا تو وہ فوراً بھونکنا بند کر دیتا۔ ہم رات کو اسے دروازے پر باندھ کر کواڑ کھلے چھوڑ دیتے اور بے فکر ہو کر سو جاتے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اندر آ جائے۔

ایسے [illegible] کے لئے کیا جگہ ہی کہاں رہتی تھی چھوٹا سا کمرہ اور ہم آٹھ آدمی۔ ایک دوسرے سے اس قدر سمٹ کر سوتے تھے کہ اگر [illegible] اور

ٹھوری سے فلمی گانے سنتے۔ پچھواڑے میں جو اونچا مکان تھا۔ اُس کے مالک نے ایک دفعہ شکایت کی تھی کہ ہم انہیں سونے نہیں دیتے۔ شکایت معقول تھی۔ لیکن ہمیں اتنی بُری لگی تھی کہ ہم نے اسے موٹی موٹی گالیاں دیکر کوستے ہوئے کہا" یہ لوگ ہمارا ہنسنا کھیلنا بھی برداشت نہیں کرتے۔" ایک طرح ہم سب سرمایہ داروں سے نفرت کرتے اور ان کے خلاف دل کی بھڑاس نکالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اس لئے کہ ہمیں ذاتی جائداد اور مستقل زندگی سے نفرت تھی۔ اور یہ لوگ ان چیزوں کے سب سے بڑے حامی اور علمبردار تھے انہیں کے آباؤاجداد تو تھے جنہوں نے انسان کی آزادگی اور آوارگی کو غیر مہذب اور جائداد کے تصور کو جنم دیکر مستقل زندگی کو مہذب قرار دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں اپنا پیٹ کاٹ کر کرے کا کرایہ چکانا پڑتا ہے۔

ہماری زندگی مزے سے گذر رہی تھی کہ میرے اندر لیکایک ایک تبدیلی واقع ہوئی۔ دل میں ایک گدگدی سی اُٹھتی اور ایک بے اختیار جذبہ سینے میں اُبھرتا ہوا محسوس ہوتا۔ میں تن تنہا دُور دُور تک کھیتوں اور پہاڑوں کی سیر کو نکل جاتا۔ ایک دفعہ مکّی کے ہرے بھرے کھیت کے کنارے ایک نیا شادی شدہ جوڑا کھڑا تھا۔ دولہا دلہن سے کہہ رہا تھا" دیکھو پیاری ان میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں اور پودے کی چوٹی پر جو پھندنا پھوٹتا ہے۔ اُسے نر کہتے ہیں۔ اس میں سے بُور جھڑ کر نیچے کے حصے پر گرتا ہے۔ تب کہیں بھٹہ جنم لیتا ہے!"

"اچھا!" دوشیزہ کے نرم نرم ہونٹوں سے نکلا اور میں نے دیکھا کہ اسکی آنکھوں میں واقعی جنت مسکرا اُٹھی تھی۔

وہ تو سیر کرتے کرتے آگے چلے گئے۔ میں دھان کے سیاہ کھیتوں، درختوں اور ادھر اُدھر اُڑتے پرندوں کو دیکھنے لگا۔ فضا میں نہ جانے کیا جادو بھرا تھا۔ کہ مجھے تمام فطرت جوڑوں میں منقسم نظر آتی تھی۔ اور میرا دل اس حسرت سے بیتاب تھا کہ میں اکیلا کیوں ہوں! میں دیکھتا گیا۔ منظر حسین سے حسین تر ہوتا گیا۔ سامنے فلک بوس پہاڑ تھے۔ برف سے ڈھکی چوٹیاں تھیں۔ اُنکی آغوش سے اٹھکیلیاں کرتے ہوئے بادل اوپر کو اُٹھ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ایک بادل اُٹھا اور اُس نے بدلتے بدلتے ایک نازک اندام دوشیزہ کی صورت اختیار کرلی۔ اس دوشیزہ کی آنکھوں میں جنت مسکرا رہی تھی۔ کیف آور، رُوح پرور جنت! جی میں آیا کہ دوڑ کر اس دوشیزہ کے قریب جا پہنچوں لیکن وہ تو ہر لحظہ دُور دُور ـــــ اور اونچی اُٹھتی جا رہی تھی۔ ہزار شوق کے باوجود اس کے پاس جانا میری ہمت سے باہر تھا۔

اُب مجھے ہر وقت اس عورت کا دھیان رہنے لگا۔ اگر وہ دنیا کے دوسرے کنارے پر بھی ہو۔ تب بھی میں اُسے ڈھونڈ لینا چاہتا تھا۔ میں اکیلا اکیلا اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی صحبت پسند نہ آتی تھی۔ کام میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ میرا مزاج چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔

میں نیکو کی بے پرواہی کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ وہ جو کپڑا چاہے پہن لیتا تھا جس کی وجہ سے گاہکوں کو بعض اوقات وقت پر کپڑے نہیں ملتے تھے اور ندامت مجھے اُٹھانی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ دوسری چیزیں بھی ادھر اُدھر پھینک جاتا تھا جنہیں ڈھونڈنے میں وقت ہوتی تھی۔ اگرچہ جس قسم کی زندگی ہم گذار رہے تھے۔ اسمیں یہ سب باتیں جائز تھیں لیکن میں اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

وہ صبح اُٹھ کر کبھی اپنا بستر نہیں لپیٹتا تھا۔ چنددا میں یا کوئی اور ساتھی لپیٹتا۔ وہ شیو کرتا اور سامان وہیں چھوڑ جاتا۔ ہم اُسے دھو پونچھ کر اُٹھا دیتے۔ مگر اب میں نے ساتھیوں کو ہدایت کر دی کہ اگر وہ بستر خود نہیں لپیٹتا تو پڑا رہنے دو۔ اگر وہ شیو کا سامان خود نہیں اُٹھاتا تو ہم میں سے بھی کوئی نہ اُٹھائے۔ اس کے باوجود چنددا اُٹھا بھی دیتا اور میں اس پر ناراض ہوتا۔ یہاں تک کہ کتا جس کا نیکو کی بے پرواہی سے کوئی تعلق نہ تھا اور جس سے مجھے اُنس بھی ہو گیا تھا۔ بُرا لگنے لگا۔ اب میں اسے ہوا خوری کیلئے نہ لے جاتا اور نہ ہی اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتا۔ اس کا بھونکنا تو مجھے اسقدر ناگوار گزرتا کہ میں اُسے چپ کرنے کی بجائے مارنے دوڑتا۔ مجھے وہم سا ہو گیا [illegible] کا کہ آتے ہیں۔ لیکن کتے کو مجھ سے بدستور محبت تھی اُسکی وجہ شاید یہ تھی کہ جانور کی محبت آدمی کی محبت کیطرح نفرت

میں تبدیل ہونا نہیں جانتی۔

سب میرے بدلے ہوئے طور اطوار کو دیکھ رہے تھے لیکن خاموش تھے۔ ایک دن لیلو حسبِ عادت شیو کر کے اٹھا اور سامان وہیں چھوڑ گیا۔ جب اسے اٹھا کر رکھنے کو بیٹھا میں نے سامان اس کے ہاتھ سے چھین کر باہر سڑک پر پھینک دیا۔ لیلو کہیں گیا نہیں تھا۔ باہر کھڑا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو بولا نہیں۔ بکھری ہوئی چیزیں چپ چاپ اٹھانے لگا۔ اس نے انہیں اپنے مختصر بستر میں رکھا اور اسے باندھ کر بغل میں دبا لیا اور پھاٹک کی زنجیر کھولتے ہوئے بولا:۔

جگجیت۔ مجھے تم سے اس بات کی توقع نہ تھی۔"

وہ چلا گیا تھا اور ہم سب خاموش بیٹھے اسے یوں دیکھ رہے تھے گویا ہماری روح کے دو ٹکڑے الگ ہو کر جا رہے ہیں۔ کمرے میں بھیانک خاموشی چھا گئی تھی صرف لیلو کے یہ الفاظ " مجھے تم سے اس بات کی توقع نہ تھی" فضا میں گونج رہے تھے۔ اب جبکہ وہ چلا گیا تھا۔ مجھے اپنے فعل پر سخت ندامت ہو رہی تھی اور میرے ساتھیوں کی جھکی ہوئی گردنیں اس احساسِ ندامت کو شدید تر بنا رہی تھیں۔ ایک دفعہ چندا کی آنکھیں اوپر اٹھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ کہہ رہی ہیں "جگجیت! تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ تم سے اس بات کی توقع نہ تھی۔"

سب مجھے شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ مجھے خود اپنے آپ اعتماد نہیں رہا۔ دو چار روز میں ہی ہماری مسرت افروز زندگی کا شیرازہ بکھر گیا۔ چندا، سلیم، منگل اور گوری مجھے اکیلا چھوڑ کر مختلف سمتوں میں چلے گئے۔ انہی دنوں پتاجی کا خط آیا جس میں درج تھا ——

"بیٹا جگجیت میرا آخری وقت قریب ہے۔ ایشور کیلئے کہنا مانو اور شادی کر کے میری آتما کو ٹھنڈا کر دو۔" پتاجی ہمیشہ اسی طرح لکھا کرتے تھے لیکن اس مرتبہ ان حروف میں مجھے کچھ جاذبیت محسوس ہوئی۔ تصور میں پہاڑوں کی چوٹیاں جگمگا اٹھیں۔ ایک بادل سا اٹھا۔ اور اس نے بدلتے بدلتے ایک نازک اندام دوشیزہ کی صورت اختیار کر لی جس کی آنکھوں میں جنت مسکرا رہی تھی اور میں ایک ہی جست میں اس کے پہلو بہ پہلو جا کھڑا ہوا۔ دل کی پہنائیوں میں ایک خوشگوار اور حسین افق نمودار ہونے لگا اور پتاجی کی نصیحت کارگر ہوئی۔

دو ڈھائی لاکھ برس پہلے کوئی ستارہ زمین کے قریب سے گذرا تھا۔ تو زمین کا محور ترچھا ہو گیا تھا۔ اور ترچھے پن نے زمین کے کردار کو اس قدر بدل دیا تھا کہ اتھاہ برف پڑنے لگی تھی اور ہزاروں قسم کی زندگیاں تلف ہو گئی تھیں۔ اسی طرح لیلو میرے قریب آیا۔ اور میری زندگی کے محور کا زاویہ بدل کر چلا گیا۔ اب میری زندگی کا نصب العین ہی بدل گیا ہے۔ سب تمنائیں مر چکی ہیں۔ کپڑے دھونا اور روپیہ کمانا اور بچے پالنا ایک کام رہ گیا ہے۔ مجھے کسی کل بھی چین نہیں پڑتی۔ کشمیر کی یاد آنے سے تڑپ اٹھتا ہوں۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر پڑی اتھاہ برف کے نیچے دبا جا رہا ہوں۔ میرا جسم سردی کے مارے کانپ اٹھتا ہے اور روح کا جوڑ جوڑ درد کرنے لگتا ہے۔

ہنسراج رہبر

(حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں پڑھا گیا)

I wonder by my troth, what thou and I did, till we loved (John Donne)

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں   وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں

حفیظ جالندھری

آج

کون جانے کہ کل کو کیا ہوگا

چھوڑ یہ اشک اور یہ آہیں
دیکھ اُلفت کی خوشنما راہیں
یہ شبیں اور چاندنی راتیں
پُر فسوں اور مدھ بھری راتیں
آج ہی ان سے اخذِ نُور کریں
اپنی دُنیا کو رشکِ طُور کریں

کون جانے کہ کل کو کیا ہوگا،

زندگی کے یہ مختصر لمحے
لوٹ کر پھر کبھی نہ آئیں گے
آج ہی ان کو بیکراں کر لیں
اپنی دُنیا کو آسماں کر لیں
کیوں تمناؤں کو سسکنے دیں
اور اُمید کو بھٹکنے دیں

کون جانے کہ کل کو کیا ہوگا

کل کہاں اس کل کو کِس نے دیکھا ہے
تجھ کو کیوں انتظارِ فردا ہے
کل کہیں آرزو نہ مُرجھا جائے
یاس چھا جائے، دل کو غم کھا جائے
آج کیف و سرُور میں کھو جائیں
وقفِ طوفانِ رنگ و بُو ہو جائیں

کون جانے کہ کل کو کیا ہوگا

آج تکمیلِ آرزو کر لیں
دامنِ دل نشاط سے بھر لیں
تجھ کو کیوں انتظارِ فردا ہے۔

نجمہ انوار الحق

کون

دھڑاک — دھڑاک — دروازے کے دونوں پٹ جیسے اس کے شوہر کے غیظ و غضب سے ذرا چیخ اٹھے، اور پھر کمرے میں گھبرا سہما ہوا سکوت چھا گیا کیونکہ اس کا شوہر اپنے پیچھے صرف یہی چھوڑ گیا تھا — مگر وہ اسی طرح جوں کی توں کھڑکی کے قریب کھڑی تھی۔ بالکل ساکت و صامت۔ گویا اس کا شوہر اس کی جان نکال کر لے گیا ہو — گال پر پڑنے والے ایک زناٹے دار تھپڑ نے جیسے اس کی شریانوں میں دوڑتے ہوئے لہو کو منجمد کر دیا ہو۔ اور پورے جسم کو گویا برف کی سل تلے دبا کر بالکل سن کر دیا ہو۔ وہ پتھر کی طرح جامد اور بے حس تھی — ہلکی ساری کا پلو جھکے ہوئے کندھے سے ڈھلک کر زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اور دھنسی ہوئی خشک آنکھیں بند دروازے کی طرف اس طرح لگی ہوئی تھیں جیسے ان کی بصارت چھن گئی ہو، مگر وہ کھلے رہنے کی عادت سے مجبور ہوں — کمرے کے ٹھہرے ہوئے سکوت میں اس کے کان ایک شور سا سن رہے تھے، کچھ ایسا شور جیسے برسات کی کالی راتوں میں کہیں دور بہت سے جھینگر ایک ہی سے میں گا رہے ہوں — وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی، نہ کچھ دیکھ رہی تھی اور نہ کچھ سن رہی تھی۔ ایک بے نام سا بے معنی سا شور اس کے کانوں میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔

برابر کے فلیٹ میں کسی نے گراموفون پر ریکارڈ لگا دیا۔

چھپ چھپ کے — چھپ چھپ کے۔

میرے خوابوں میں آتا ہے کون؟

آتا ہے کون؟

اس کی سماعت پر چھایا ہوا بے نام سا بے معنی شور ریکارڈ کے ترنم میں اس طرح کھو گیا جیسے سمندر میں ننھی سی سیپ — اور اس کے جسم میں ایک دم جان سی آگئی — قدموں پر پڑا ہوا ساری کا پلو کندھے پر گھسیٹ لیا گیا۔ پلکیں اس طرح لپکیں جھپکیں جیسے اسے کچھ سوچنے پر آمادہ کر رہی ہوں۔ اس نے ایسی خجالت سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا جیسے وہ یہ دیکھ رہی ہو کہ کہیں کسی نے دیکھ تو نہیں لیا اسے تھپڑ کھاتے ہوئے — کرسیوں نے، میز نے، پردوں نے، الماری یا دیواروں نے — کہیں وہ بے جان چیزیں اس پر ہنس تو نہیں رہی ہیں — کتنی شرم کی بات تھی کہ وہ بچوں کی طرح پٹ بھی سکتی تھی اور بھی اپنے شوہر کے ہاتھ سے — وہ اس احساس سے اپنے آپ کو کوسوں دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا دھیان ریکارڈ کی طرف لگانا چاہا۔

آتا ہے کون؟ آتا ہے کون؟

ریکارڈ گھوم گھوم کر پوچھے جا رہا تھا۔ وہ ایک دم تلملانے اور جھنجھلانے لگی۔ جانے کون اس وقت آتا ہے کون کا ہتھوڑا ٹن ٹنا کر اس کے دماغ میں چھید رہا تھا — حال، ماضی کی طرف الٹی چھلانگ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے بار بار ایسا محسوس ہونے لگا کہ گانے والا محض اسے چڑانے کی غرض سے یہ سوال براہ راست اسی کی گزشتہ پر امید زندگی سے کر رہا ہے۔ جیسے

صاف صاف اس کے ماضی کے لئے تفتیش کی جارہی ہے۔ اس ماضی کے لئے جو تھپڑ کی چوٹ محسوس کرنے سے قبل چونٹی کی ننی سنہری چم چم کرتی دلہن کی مانند خوبصورت اور دلنواز تھا۔ مگر اب قبر کے پہلو میں رکھے ہوئے جنازے کی طرح بھیانک۔ اس کا جی چاہنے لگا کہ ریکارڈ کو توڑ کر پھینک دے اور پھر اپنی تتلی پڑوسن سے اس بات پر خوب لڑے۔ اتنا لڑے کہ گلا تھک جائے ہاتھ دکھ جائیں۔ اور اس کے جسم پر جگہ جگہ چوٹیں لگ جائیں ——— اور پھر وہ مردوں کی طرح پڑ جائے تاکہ وہ گانے والے کے اس سوال کو بھول جائے کہ تیرے خوابوں میں کون آتا تھا؟ کیا وہی جو آج تجھے تھپڑ مار کر باہر چلا گیا ——— مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی اور ریکارڈ پوچھتا ہی رہا۔

چھپ چھپ کے ——— چھپ چھپ کے
تیرے خوابوں میں آتا ہے کون؟
آتا ہے کون؟

پریشان ہو کر اس نے اپنا چکراتا ہوا، بھاری سر کھڑکی کی سلاخوں پر ٹیک دیا۔ "آج اس کا شوہر اسے مار کر چلا گیا"۔ وہ اس غیر متوقع واقعہ کے لئے کچھ سوچنا بھی نہ چاہ رہی تھی ورنہ رونا ——— بس اسے اپنے آپ سے شرم آ رہی تھی۔ ایک سال تک پُرمسرت ازدواجی زندگی بسر کرنے کے بعد شوہر کے ایک تھپڑ نے اسے جیسے اچانک میٹھی نیند کی گود سے چھین کر تلخ بیداری کے انگاروں پر ٹپک دیا تھا۔ مگر وہ اس سچائی سے بھی خوفزدہ نہ تھی ——— وہ اپنے شوہر کے اس ہاتھ کے لئے بھی کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ جس نے سال کے شروع اور آخر میں دو متضاد کیفیتیں اس پر طاری کر دی تھیں۔ پیار اور مار ——— بس وہ اُوقت دل کے ساتھ کھڑکی کی سلاخوں سے سر ٹیکے رہنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی کوئی ایک بھی کڑی کو چھوتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ جیسے وہ اپنے ذہن کے مقناطیسی اثر سے بخوبی واقف ہو جو ایک کڑی چھوتے ہی زندگی کی تمام بکھری ہوئی کڑیوں کو گھسیٹ کر ایک جھنکتی ہوئی زنجیر بنا سکتا تھا ——— وہ زنجیر جس میں ایک عورت جکڑی ہوئی ہو۔

اس نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا دیں۔ وہ آنکھیں جن میں چوٹ کھانے کا احساس چھپ چھپ کر جھانک رہا تھا ——— بادل ابھی ابھی برس کر چھٹے تھے۔ مغرب کی گود میں جھکتے ہوئے سورج کی پیلی پیلی کرنیں سامنے کی سہ منزلہ بلڈنگ پر سونے کا پانی پھیر رہی تھیں اور اِدھر اُدھر بہتے ہوئے سفید سفید بادلوں کے ٹکڑوں کو کہیں کہیں سے دلہن کے آنچل کی طرح گنگا جمنی بنائے ہوئے تھیں ——— اس کی افسردہ پلکیں دو ایک بار جھپکیں اور پھر سامنے کی سہ منزلہ سنہری بلڈنگ پر تنی ہوئی دھنک پر چند لمحوں کو رک گئیں ——— خوبصورت گہرے رنگوں کی دھنک جو بلڈنگ کے اوپر ایک عالیشان محراب کی طرح معلوم ہو رہی تھی ——— معاً اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دھڑکتے ہوئے دل پر کسی نے سختی سے پنجہ جما دیا ہو۔ اس کے دماغ میں ایک سوال ٹھک سے لگا کہ "کیا اب اسے اپنے آپ کو کہانیوں کی وہ شہزادی نہیں سمجھنا چاہئے جو ست رنگی دھنک کی محراب میں کرنوں کا جھولا ڈال کر زمین اور آسمان کو ٹھکراتی ہے ——— رنگین تخیلات کی، لاڈلی، چہیتی شہزادی؟ اور ——— وہ ———"

اس نے بے اختیاری میں کھڑکی کی سلاخوں پر پٹک دیا اور مٹھیوں سے سلاخوں کو بھینچ کر اپنی آنکھیں اس طرح بند کر لیں جیسے کسی کو شدتِ کرب میں نیند آ جائے ——— تھک کر، ہار کر سو جائے کوئی۔

"آہا ——— آہا ———" اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ سامنے والی بلڈنگ کی ایک بالکونی نے اس کی نظروں

گویا جیسے بذاتِ خود ایک دبلی پتلی سی ہاتھ میں ایک نلکی اور گھلے ہوئے صابن کی پیالی لئے خوشی سے ناچی جا رہی تھی۔ اس کے ارد گرد بڑے چھوٹے کئی بلبلے تیر رہے تھے ــــ وہ بار بار نلکی اپنے ہونٹوں سے لگاتی اور دوسرے سرے کو صابن میں ڈبو کر پھونک دیتی نیمی سی نلکی چھوٹے بڑے بلبلے متحرک دیتی۔ سورج کی پیلی پیلی کرنوں میں وہ رنگین بلبلے بچی کے گرد ایک دو لمحے تیرتے اور پھر پھٹ جاتے۔ بچی خوشی سے چیختی آ ہا ہا ــــ آ ہا ہا ــــ

اس نے چند منٹ یہ کھیل مانوس نظروں سے تکا ــــ اس نے بھی اپنے بچپن میں یہی کھیل کھیلا تھا ــــ رنگین بلبلوں کا کھیل ــــ اور جوان ہونے پر انہی بلبلوں نے اس کی ہستی کے گرد ایک عرصے تک ایک اچھوتا ناچ ناچا تھا لیکن آج وہ ناچ رک گیا تھا ــــ آج جذبات کے رنگین بلبلے جیسے فضا میں جڑ دیئے گئے تھے ــــ اور اس کے ذہن میں ان کے پھٹ جانے کا خیال ایک غیر واضح اور مبہم طریقے پر گھمنے لگا۔ اس نے ایک بار سہمی ہوئی نظروں سے دھنک کی محراب کو دیکھا اور پھر ایک دبی دبی اضطراری کیفیت کے زیر اثر دوڑ کر اپنے پلنگ پر اوندھی پڑ گئی ــــ آنسو بے اختیار آنکھوں سے نکل نکل کر تکیے کے سینے میں دبکنے لگے اور رخسار پر تھپڑ کی چوٹ گرم ہو گئی۔

اس کے محبوب شوہر نے آج اسے مار کر اپنا محض شوہر ہونا جتا دیا تھا۔ خوابوں اور خیالوں کا ہیرو ذرا ہی دیر پہلے درحقیقت بھوت بن گیا تھا۔ اس کی زندگی پر تنی ہوئی تخیلات کی دھنک ایک ہی حرکت میں چٹاک چٹاک ٹوٹ گئی تھی ــــ پیارے پیارے شوخ رنگ چراغ کا دھواں بن کر ہر طرف بل کھانے لگے تھے۔ اور رنگین جذبات کے وہ رنگین بلبلے جو اس کی ہستی کے گرد ایک اچھوتا، نرالا ناچ ناچ رہے تھے، پٹ پٹ کر کے ٹوٹ گئے تھے۔ بس ساری زندگی میں ایک طویل ریاضت سے اس نے جو کچھ جمع کیا تھا وہ ایک تھپڑ نے تفریق کر دیا ــــ رہ گیا ایک تھپڑ۔ صرف ایک تھپڑ جس کی جلن اس کے رخسار پر چھائی ہوئی تھی ــــ کسی قدر جانسوز اور حسرت ناک حقیقت تھی؟ مگر کیا اس کے شعور میں آنسوؤں کی پشت پر اس قسم کا کوئی واضح خیال موجود تھا ــــ ؟ وہ تو محض رونے کی خاطر رو رہی تھی۔ اور اسی لئے وہ بلک بلک کر رو دے گی ــــ وہ تو بیکار سا پانی اپنی آنکھوں سے بہا رہی تھی۔ ایک عرصے کے منتظر اور بے کل جسم کو مرد کے ہاتھوں میں دے کر اس کے محدود سے ذہن کی وہ صلاحیتیں بالکل ہی مر چکی تھیں۔ جو عورت کو انفرادی طور پر کچھ سوچنے دے سکتی ہیں ــــ ہوش سنبھالنے کے بعد سے جب کبھی بھی اس نے اپنے آپ کو ایک فرد کی حیثیت سے جانچا تو اسے اپنی ذات بالکل بے کار اور بے معنی سی معلوم ہوئی۔ اور اسی لئے وہ تصورات اور تخیلات کے ساتھ ساتھ عملاً اور حقیقتاً اپنی انفرادیت کو ایک جیتے جاگتے، کھلانے، پلانے، بسانے اور مطمئن کر دینے والے مرد میں جذب کرنے کے لئے بے چین تھی ــــ اس وقت وہ ایک غریب سے باپ کی بیٹی تھی اس پر ایک ہیڈ کلرک کی ملکیت کا لیبل نہیں چپکا تھا۔

بائیس سال کی ایک جیب [illegible] سی بیٹی ــــ غریب باپ کی ایک بے فائدہ اور بہادر ملکیت ــــ گویا گلے میں پتھر جھول رہا ہو ــــ تو [illegible] بیٹی کسی کا انتظار کیا کرتی ہر وقت ــــ دروازے پر ایک ہلکی سی کھٹ اس کے

کا [illegible] بن کر سا [illegible] سوال دل بن جاتا۔ زیادہ تر .... بھنچے رہنے والے ہونٹ پھڑ پھڑا کر کھل جاتے اور وہ جیسے [illegible] میں ایک ادھوری تان لیتی "کون؟" جواب میں، دھوبن، بھنگن، بہشتی یا پھر کوئی [illegible] رشتہ دار اندر آ جاتا۔ انتظار کے اس لمحے میں اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ست رنگی دھنک، دھرتی پر اس کے

لے محراب بن کر اتر آئی ہے اور رنگین بلبلے ننھی ننھی قندیلوں کی طرح اس کے چاروں طرف تیرتے پھر رہے ہیں۔ بس ہر طرف رنگ ہی رنگ۔ مگر آنے والے کو دیکھ کر وہ ہمیشہ زیر لب کہہ اٹھتی — کوئی نہیں — کوئی بھی تو نہیں —" اس طرح جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی مایوس سانسوں کا ذخیرہ ایک ہی بار گھر کی گھٹی ہوئی ہوا میں حل کر دینا چاہتی ہو — دھنک کی محراب کے رنگ ایسے پھیکے پڑ جاتے جیسے صبح کو کسی کار دپ — اور رنگین بلبلے جانے کدھر تتر بتر ہو جاتے —

صبح سے لے کر شام تک دروازے کی ایک ہلکی سی کھٹ پر وہی منتظر سی کون؟ پر اس کے گھر آنے والا ہی کون تھا وہی انے گنے لوگ، جنہیں دیکھ کر وہ زیر لب کہہ اٹھتی۔ کوئی نہیں — کوئی بھی تو نہیں۔ لیکن پھر بھی وہ صبح بستر پر آنکھ کھولتے ہی کسی کا انتظار شروع کر دیتی۔ کس کا انتظار؟ اس کا شعور اس باب میں گونگا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ منتظر تھی۔

"منی! لٹھ ذرا آنگن میں جھاڑو دے دو پہلے —" صبح ہی صبح وہ اپنی چھوٹی بہن سے خوشامد بھرے لہجے میں کہنے لگتی۔ اور منی جو بکی کام چور اور لاتری تھی۔ کبھی تو سنی ان سنی کر جاتی اور کبھی پکڑے جانے پر جھنجھلا کر کہنے لگتی "بھئی اللہ! بنک۔ ابھی سے جھاڑو دوں۔ کون سے مہمان آ رہے ہیں۔ کیا مصیبت ٹوٹ رہی ہے؟"

"کوئی آ ہی جائے تو — دیکھ نا، کیسا گندہ ہو رہا ہے آنگن جیسے رات بھر کتے لوٹے ہوں۔ اچھی سی منی۔ ہاں" وہ تھکی تھکی غمناک آنکھیں منی کے چہرے پر جما کر کہتی اور منی اپنی کاہلی ذرا دیر کے لئے بھول جاتی۔ گو جھاڑو دیتے ہوئے کمر کا درد محسوس کرتے ہوئے اسے اپنی بہن پر غصہ بھی آتا رہتا۔ وہ سوچتی "کتنا حماقت آمیز اندیشہ رہتا ہے۔ بجیا — سچ مچ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کتابیں پڑھتے پڑھتے — جبھی تو ہر وقت پلکیں پیٹ پیٹ کر چپ چاپ بیٹھی کچھ سوچا کرتی ہے — یا پھر دروازہ کھٹکنے پر بڑبڑا اٹھی — کمبخت کہیں کی —"

اور وہ منی کی جلتی ہوئی نظروں کا خیال کئے بغیر غیر معمولی پھرتی سے بیٹھک کے کمرے کی صفائی اور سجاوٹ میں لگ جاتی — لمبے سے تین دروازے والے پتلے کمرے کے بیچ ہوئے، چپ چپ کرتے فرش پر جھاڑو دیتی، بغیر پالش کی چار پرانی کرسیوں کو جھاڑ پونچھ کر قطار میں جما دیتی — اپنی اکلوتی میز کو صاف کرتی۔ قلم دوات اور ان کتابوں کو نمایاں طریقے سے رکھتی جس پر اس نے جگہ جگہ موٹے موٹے حروف میں اپنا نام بقلم خود کے دم چھلے کے ساتھ لکھ رکھا تھا تخت کی چاندنی کی گرد اڑاتی۔ گاؤ تکیے کو لگاتی اور پھر کچھ سوچ کر شرماتی۔ مسکراتی۔ جیسے کوئی گاؤ تکیے سے لگا بیٹھا اسے دیکھ رہا ہو۔

دیوار پر لٹکے ہوئے دھبیلے آئینے کو اپنے آنچل سے صاف کرنے کی بے سود کوشش کرتی اور پھر اپنا چہرہ دیکھ کر کچھ بجھ سی جاتی۔ اس کی نظر کے سامنے کمسن کمسن دلہنیں آ جاتیں جن کے چہروں پر جسموں پر بچپن اور جوانی کی کشمکش خوبصورتی سے نمایاں ہوتی — اور پھر اسے احساس ہونے لگتا کہ اس کے چہرے پر سختی آتی جا رہی ہے۔ ایسی سختی جو دو تین بچوں کی ماں کے چہرے پر ہوتی ہے — اور وہ کچھ تھک جاتی۔ اس کا کام بھی تو ختم ہو چکا ہوتا۔ کسی نامعلوم آنے والے کے لئے اسی قدر انتظام کرنے کے بعد وہی تھکا دینے والا انتظار — وہ ادھ تھکے نام سا خلا اور بھرے گھر میں اس کا پیچھا کرتا ہوا احساس تنہائی — دروازے کی ہلکی سی کھٹ پر دھنک کا دروازہ رنگین بلبلوں کا ناچ — اور پھر کوئی نہیں کوئی بھی تو نہیں ——

مگر ایک دن اس کے صاف ستھرے گھر میں کوئی آ گیا — اور اس کے ساتھ رنگین دھبے اور ریشمی غرارے

دھنک کے رنگوں کی طرح اس کے تصور میں لہرانے لگے۔ اُسے اس کی ماں نے اڑھا پنھا کر کوٹھری میں بٹھا دیا تھا —— منی نے اترا اترا کر اس کے منہ میں مٹھائی ٹھونسی، ہنسی کھلکھلائی —— مگر اس وقت بھی وہ غمگین تھی۔ دھنک اور بلبلے اس سے دور تھے۔ اور احساسِ تنہائی جوں کا توں —— وہ اس موقع پر بھی منتشک انسان کی طرح فضا میں معلق جھول رہی تھی —— اچانک دروازے پر زور کی کھٹ ہوئی۔ اور وہ اپنی ٹوٹی ہوئی تان کو حلق میں قید نہ رکھ سکی۔ "کون؟" اور اس کی ماں نے اس کا منہ افسوس دبا —— بیچاری ماں حیران کہ اب تو منگنی بھی ہو گئی۔ پھر کس کا انتظار ہے بدنصیب کو —— اور وہ گھونگھٹ میں سر جھکائے منتشک تھی۔

مگر شادی کے بعد اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کی روح کا بے نام سا خلا پُر ہو چکا ہے۔ یا یہ کہ وہ خلا تھا ہی نہیں کبھی اس میں —— "کون" کی ٹوٹتی ہوئی تان اسے ایک دلپسند جواب دے کر گویا ہمیشہ کے لئے لوٹ گئی —— اب وہ خوش اور قطعی مطمئن تھی۔

لیکن آج ایک سال گزرنے کے بعد ایک تھپڑ کھا کر وہ رو رہی تھی۔ محض رونے ہی کی خاطر تو اس کے دل میں بغاوت کے شعلے نہیں بھڑک رہے تھے۔ وہ اس غیر متوقع واقعے کے لئے ایک بھی معاشرتی یا اقتصادی تاویل نہیں گڑھ رہی تھی۔ اسے اپنے قلب کی گہرائیوں میں اپنے شوہر کے لئے ڈھونڈنے سے بھی نفرت کی ایک رمق نہیں مل رہی تھی۔ مگر ہاں ایک خیال اس کے جسم کو جیسے دھیمی دھیمی آنچ پر پکا رہا تھا کہ اس نے آخر اپنے شوہر سے زبان کیوں لڑائی؟ اسے اتنا مشتعل ہی کیوں ہونے دیا —؟ ساتھ ہی وہ اپنے شوہر سے ایک نرم سی شکایت بھی محسوس کر رہی تھی۔ ایک محبت آمیز شکوہ، جسے کرنے سے وہ دونوں ایک دوسرے کے اور بھی قریب ہو سکتے تھے —— اسے یقین تھا کہ اس کا شوہر وہی ہے جس کا انتظار اس نے اپنے سن شعور سے شروع کر دیا تھا۔ محبوب ہستی جس نے اسے اچھا کھانا، اچھا کپڑا اور اچھا گھر رہنے کو دیا تھا۔ اور پیارے پیارے شوخ رنگوں سے اس کی روح کو مطمئن کر دیا تھا۔

اس نے جی بھر کر رونے کے بعد تکیے سے سر اٹھایا۔ بارش کی ننھی ننھی بوندیاں سامنے کی بلڈنگ کا سنہرا حسن دھو چکی تھیں اور صابن کے بلبلوں سے خوش ہونے والی بچی بالکونی سے جا چکی تھی —— ملے ہوئے فلیٹ میں اس کے بچے شور مچا رہے تھے۔ جیسے وہ شور "آپ ہے کون؟" والے ریکارڈ کا بڑا سنجیدہ سا جواب ہو۔

اس نے دوبارہ اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔ ہلکے جی کے ساتھ اب وہ پٹ جانے کے معاملے پر سوچ رہی تھی کہ خطا تو ساری اس کی اپنی ہے۔ اگر وہ اپنی حرکت پر نادم ہوئے تو وہ بھی اپنے مشتعل کن طرز عمل کی معافی مانگ لے گی۔

اچانک دروازے پر ہلکی سی کھٹ ہوئی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار بستر کی سلوٹیں مٹانے لگا۔ اور اس کے لاشعور کے کسی روزن سے کوئی شے اس کی زبان تک تیزی سے رینگ آئی —— "کون"؟ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر جیسے ایک ٹوٹی ہوئی تان لی اور پھر —— پھر خود ہی اس بھولے بسرے سوال کے زہر سے مبہوت رہ گئی۔

اس کی کھلی ہوئی آنکھیں شاید یہ بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ کہ اس کا شوہر اپنی حرکت پر کس قدر ششدر نظر آ رہا تھا۔

ہاجرہ مسرور

غزل

ساحل کا کچھ خیال نہ اپنی خبر رہی
بس ایک موج تھی کہ بقیدِ سفر رہی

پروردۂ اَلم تھی مری ہر نگاہِ شوق
اُمیدِ دید پر بھی مری آنکھ تر رہی

وُہ روز و شب تھے میرے لئے اِک شبِ دراز
ہاں! اُس سحر کی یاد جب آئی، سحر رہی

فرقت رہی تو اُن کے فسانے چھڑے رہے
آئے، تو اپنے حال پہ اپنی نظر رہی

اِک آس تھی کہ مثلِ چراغِ سحر بُجھی
اِک یاد تھی کہ دِل میں مرے عُمر بھر رہی

گرچہ ہر ایک سانس تھی اِک مرگِ نامُراد
یہ آرزو کہ موت نہ آئے، مگر رہی

اب منزلِ وفا کا تعین کرے تو کون
یہ نقشِ پا رہے، یہ تری رہگذر رہی

جاتے ہی اُن کو بھول گئے خود کو بھی ظفر
جب تک وہ سامنے تھے جہاں کی خبر رہی

یوسف ظفر

مطبوعات

اسرارِ حیات از الیشور ٹوپا۔ ڈی فل - اندھرا دلیس کے صوفی شاعر ویماؔ کی زندگی اردو دان طبقہ کے لئے ایک نئی چیز ہے لیکن تین کروڑ تلنگی بولنے والوں میں اُس کو وہی مرتبہ حاصل ہے جو فارسی ادب میں سعدیؒ کو۔ اس شاعر کے کلام میں سعدی کے کلام کی طرح فلسفے کی روشنی میں حقائق پر تبصرہ ملتا ہے۔ جناب الیشور ٹوپا نے اس شاعر کے کلام اور زندگی کو نہایت شُستہ پیرایہ میں اُردو کا لباس پہنایا ہے۔ اور ہمیں اس سے روشناس کرایا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ جہاں دوسرے ممالک ادب کے تراجم اُردو کے دامن کو وسعت دیتے ہیں وہاں اپنے ملک کے چھپے ہوئے جواہر پاروں کو سامنے لانا بہت اہم ہے۔ مختلف ابواب میں اس شاعر کے کلام کو منقسم کر کے جناب ایشور ٹوپا نے زندگی کے حقائق پر اس کے ردِ عمل کو واضح کیا ہے۔ جو بلحاظِ ترتیب بھی خراجِ تحسین چاہتا ہے۔ قیمت درج کتاب نہیں۔ حیدرآباد تلنگو اکاڈمی کے زیرِ اہتمام جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد نے شائع کی ہے۔ کتابت کاغذ طباعت نہایت عمدہ۔

مقالاتِ جمال الدین افغانی۔ مترجمہ سید مبارز الدین رفعت۔ حضرت علامہ شیخ جمال الدین افغانی مرحوم کی ذات گرامی کچھ لکھنے کا مقام نہیں۔ آپ ایک خاص انقلابی نکتۂ نگاہ کے مالک تھے انہوں نے نہ صرف عالمِ اسلام کو بلکہ تمام ہوشمند دنیا کو ایک ایسے انقلاب سے روشناس کیا جس کی بنیادوں پر زمانۂ حال کے بیشتر سیاسی مسائل کا حل تلاش کیا جا رہا ہے زیرِ نظر کتاب آپ کے فارسی مقالات کا نہایت اچھا اردو ترجمہ ہے جو قاضی عبد الغفار صاحب کی نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ قیمت ہے ملنے کا پتہ دار الاشاعت سیاسیہ۔ اشاعت منزل۔ اُردو گلی۔ حیدرآباد دکن۔

دکن کی سیاسی تاریخ از سید ابو الاعلیٰ مودودی۔

دکن صدیوں سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نہایت اہم باب رہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں سید صاحب نے دکن کی سیاسیات پر ان کے موجودہ حکمران اور اُن کے اجداد کی تاریخ کی روشنی میں بحث کی ہے۔ اس سے کتاب میں یکرنگی سی آگئی ہے۔ جو دکن کی پوری تاریخ پر حاوی نہیں ہوئی۔ تاہم حضور نظام اور اُن کے خاندان میں دلچسپی لینے والوں کے لئے اس سے مفید کتاب ابھی تک نہیں چھپ سکی۔

کتاب کی قیمت ہے اور دار الاشاعت سیاسیہ۔ اشاعت منزل۔ اُردو گلی حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی ہے۔

رسولِ پاک کی صاحبزادیاں۔ از اعجاز الحق قدوسی۔

روایات اور بالخصوص مذہبی روایات کے بغیر کسی تمدن کا ارتقاء ممکن نہیں۔ ماضی سے کٹ کے بھی کوئی قوم سرفراز نہیں ہو سکی۔ چنانچہ ہندوستان کی مختلف اقوام کو منظرِ عام پر لانے کی سعی کی جا رہی ہے۔ "رسولِ پاک کی صاحبزادیاں" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مسلمان گھرانوں کی بچیاں اس کتاب کے مطالعے سے مستفید ہوں گی۔ مصنف نے اس کتاب سے صنفِ نازک کی ایک بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ قیمت ساڑھے بارہ آنے۔ پتہ کتابخانہ انجمن ترقی اردو ہند۔ [illegible]

اسلام کے چند معاشی نظریے۔ از محمد یوسف الدین ایم۔ اے (عثمانیہ)

جدید سائنس نے ہمارے اذہان میں نئے نئے تاثرات سے ایک عجیب چکاچوند پیدا کر دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ معاشرتی اغیار سے ہم اندھا دھند تقلید کے شکار ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ ذہن جو اپنے ماضی سے بھی اکتسابِ فیض کر سکتے ہیں نئے تخیلات کو اپنے پرانے ترازوؤں میں تولتے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف نے اسلام کے معاشی نظریات مثلاً قرآن کے معاشی نظام اسلام کی رُو سے اکتسابِ دولت کے طریقے وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں اب تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ معاشیات کے طالب علم اور اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہو گی۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔ دفتر مجلس مجلہ طیلسانین عثمانیہ نمائش گاہ، باغ عامہ حیدرآباد دکن۔

نظامی بنسری از خواجہ حسن نظامی دہلوی۔

خواجہ صاحب اردو میں ایک صاحب طرز انشاء پرداز کی حیثیت سے استادی کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کی ذات گرامی میں جہاں اور سینکڑوں قابلِ رشک صفات ہیں وہاں چند ایسی باتیں بھی سرایت کر گئی ہیں جن سے ہمارے نزدیک ان کا دامن آلودہ نہ ہونا چاہئے تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا بات کرنے کا ڈھنگ بالکل انوکھا اور سب سے الگ ہے۔ لیکن اگر وہ نظامی بنسری کی روشنی میں یہ چاہیں کہ ہم ان کو ہندوستان میں سب سے پہلا روزنامچہ لکھنے والا مان لیں تو ہمیں یہ غور کرنا پڑے گا۔ کہ کیا بابر اور جہانگیر وغیرہ کے تزک روزنامچے نہ تھے۔ صرف یہی نہیں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ غدر کے حالات جو غالب نے "دستنبو" کی صورت میں قلمبند کئے کیا وہ روزنامچہ کہلانے کے مستحق نہیں تھے۔ خیر یہ تفصیلی باتیں ہیں جن کا زیر نظر کتاب سے بہت زیادہ تعلق نہیں۔

زیر نظر کتاب میں تمام نامور خواجگانِ چشت کی زندگی کے حالات ہیں جنہیں خواجہ صاحب نے اپنے شگفتہ انداز تحریر میں بیان کیا ہے۔

قیمت فی جلد تین روپے جو پانچسو صفحات کے لئے بہت معقول ہے۔ پتہ اہل بیت پریس اردو بازار دہلی۔

نئی صبح۔ ترجمہ انیل احمد۔

روس اور سوویٹ کے متعلق آج کل بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ یہ کتابچہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اس میں مادم ایتا کسیا لوقا کی اپنی پوری زندگی کی داستان ہی نہیں بلکہ انقلاب روس کے افسانے کا ڈھانچہ بھی ہے۔

قیمت نامعلوم ضخامت ۹۰ صفحے ادب پبلشر قومی دارالاشاعت بمبئی ۴

سوویت یونین کی قومیں۔ ترجمہ از احمد حسین۔

یہ کتابچہ بھی "نئی صبح" والے سلسلے کی ایک ناتواں سی کڑی ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس میں روس کے باشندوں کے حالات درج ہیں۔ اصل کتاب ڈاکٹر ادھیکاری کی لکھی ہوئی ہے۔

قیمت [illegible] ضخامت [illegible] صفحے ادب پبلشر قومی دارالاشاعت بمبئی ۴

فاقہ کیوں [illegible] از سیو سانی ترجمہ مرزا عصمت اللہ بیگ

بنگال کے قحط نے ایک ہندوستان بھر کے [illegible] میں پر مشکل اور حل طلب سوال پیدا کیا کہ یہ فاقہ کیوں ہے؟ اس سوال [illegible] سبب محض جذبات میں مضمر نہیں۔ اس کے لئے ہمیں اپنے ملک کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا پڑے گا۔ مسٹر

ہندوستانی جو سابق وائس چانسلر بمبئی کے صاحبزادے اور خود ایک سوشلسٹ ہیں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ایک تو جنگ کی بدولت مزدوری ودرآمد نہیں ہو سکی اور دوسرے اس زمانے میں اس قدر برآمد ہوئی کہ ہندوستان کے باقی ماندہ لوگوں میں صرف اہل دولت ہی اس سے متاثر نہ ہوئے ۔ بقیہ خوراک کا حصول غریبوں کے بس میں نہ تھا چنانچہ انہیں فاقہ کشی کا شکار ہونا پڑا ۔ اس کی تہ میں ایسی ہی دوسری وجوہ پر غور و خوض کیا گیا ہے جو ہمارے خیال میں اقتصادیات کے طلبہ کے لئے مفید ثابت ہوں گی ۔ جہاں تک ترجمے کا تعلق ہے زبان نہایت سادہ اور سلیس ہی نہیں عام فہم بھی ہے ۔ کتابت و طباعت میں بھی اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ اردو میں معمولی شُد بُد رکھنے والے حضرات بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں ۔ ضخامت ۶۰ صفحات ۔ قیمت بارہ آنے ۔

پتہ دار الاشاعت سیاسیہ اشاعت منزل ، اردو گلی ، حیدرآباد (دکن)

دل کی دھڑکن ۔ از خادم محی الدین ایم ۔ اے ۔ ڈی (راڈ نمبرا)

چھ ڈراموں کے اس مجموعے کے پیش نظر یہ ذریں اصول کار فرما ہے کہ "کھیل کھیل میں تعلیم" دی جائے ۔ جناب خادم محی الدین صاحب کا نام تعلیمی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ۔ ان کی تصنیف دو آتشہ ، ملک بھر سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے ۔ اس مجموعے کے ڈراموں میں سے بعض طبع زاد ہیں اور بعض انگریزی ڈراموں سے اخذ کر کے ہندوستانی فضا کے مطابق ڈھالے گئے ہیں ۔ یہ ڈرامے مختلف سٹیجوں پر کھیلے جا چکے ہیں اس لئے ان کی ڈرامائی خصوصیات کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ۔ ویسے بھی جناب مصنف کی بالغ النظری پر ہمیں پورا پورا اعتماد ہے ۔ پرنسپل جی سی چٹرجی تعارف میں فرماتے ہیں : "جب ہم ان فرسودہ اور پامال مضامین کو ذہن میں لاتے ہیں جن کے اردگرد ہماری ہندوستانی فلمیں گھومتی رہتی ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ محی الدین صاحب نے اسدد ڈرامے کی ایک رہنمایانہ خدمت انجام دی ہے" یہ داد یقیناً باعث فخر ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں ڈرامے کی ترویج کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوگا ۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔ پتہ : قومی کتب خانہ ، ریلوے روڈ ۔ لاہور ۔

تصویر از اے ۔ آر ۔ خاتون دہلوی ۔

ہندوستانی خواتین ادب کی ترویج و ترقی کے لئے ایک عرصے سے قدم اٹھا رہی ہیں ۔ محترمہ اے ۔ آر خاتون صاحبہ کا ناول شمع جب شائع ہوا تو ملک بھر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ہر طرف سے اس کا خیر مقدم کیا گیا اور یہاں تک کہا گیا کہ ایک خاتون کے قلم سے یہ ناول حیرت انگیز ہے ۔ موصوفہ کی یہ دوسری تصنیف بھی نہایت عمدہ اور شستہ ہے ہمیں امید ہے کہ اسے بھی اسی مقبولیت سے دیکھا جائے گا ۔ قیمت چار روپے ضخامت ۴۲۰ صفحات ۔ پتہ انشا پریس ۱۹۹ کوچہ پنڈت دہلی ۔

فرحت جہاں از ایم اسلم

ایم اسلم ہر سال اپنی تصانیف میں درجنوں کتابوں کا اضافہ کرتے ہیں ۔ ان کی یہ برق رفتاری بقول غالب — کہیں دیکھئے — تاہم اس سے اتنا فائدہ ضرور ہے کہ وہ طبقہ جو ایم اسلم کی ذہنی اولاد ہے اور جسے عوام میں تعداد کے لحاظ سے ایک ممتاز درجہ حاصل ہے ، کافی حد تک لطف اندوز ہو رہا ہے ۔ فرحت جہاں ایک سو دس صفحات پر پھیلا ہوا ایک ناول ہے اور بس ۔ قیمت عہ ۔ ملنے کا پتہ : ہندوستانی پبلشرز دہلی

نذیر پبلشر نے کوئنٹیل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۳۲ ۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا
صرف سرورق پاکستان ٹائمز پریس ... لاہور میں چھپا ۔

قواعد

۱ - "ہمایوں" ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲ - علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کیے جاتے ہیں۔ مسودے کا نہایت صاف و خوشخط ہونا مضامین کی قبولیت کی پہلی شرط ہے۔

۳ - دل آزار تنقیدیں، دل شکن مذہبی مضامین اور خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کیے جاتے۔

۴ - جواب طلب امور کے لیے پتا لکھا جوابی کارڈ اور مضامین کے ساتھ اُن کی رسید کی تاریخ یا واپسی کے لیے اپنا پتا لکھا ہوا ٹکٹ لگا لفافہ بھیجنا بہت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر دفترِ ہمایوں خط و کتابت کا ذمہ دار نہ ہوگا اور ناقابلِ اشاعت مضامین بیرنگ واپس کر دیے جائیں گے۔

۵ - ہمایوں کے نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر مہینے کی پانچویں تاریخ کے بعد اور پندرھویں سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ صرف قیمتاً مل سکتا ہے۔

۶ - منی آرڈر اور خط و کتابت میں خریداروں کو اپنے پتے کے ساتھ اپنا خریداری نمبر جو چٹ پر پتے کے اُوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھنا چاہئے۔ بصورتِ دیگر تعمیل مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گی۔

۷ - چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک)، قیمت فی پرچہ آٹھ آنے۔

مینیجر "ہمایوں"

۳۰ - لارنس روڈ - لاہور